
سب رنگ
ڈائجسٹ



بڑا علم

یہ جو ایک خوب صورت چاق و چوبند لڑکا کتابیں بغل میں دبائے تیز قدموں سے درس گاہ کی جانب رواں دواں ہے اسے ذرا روک کے پوچھیے "عزیز من! تم مستقبل میں کیا بننا چاہتے ہو؟" وہ سعادت آثار طالب علم نہایت جوش اور ولولے سے جواب دے گا "انجینئر، پائلٹ، سائنس داں، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ وغیرہ۔" اگر آپ کو اس زمین سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔ آنے والے زمانے کو مختلف شعبوں میں ہنرمندوں اور عالموں کی ضرورت زیادہ پڑے گی۔ زمانے کا کاروبار چل جائے گا، علوم و فنون کی ان ورزشوں کے بغیر قوموں کے مقابلے میں شریک نہیں ہوا جا سکتا، یہ مقابلہ آئندہ اور شدید ہو جائے گا اور ہمیشہ کی طرح وہی سرفراز ہوگا جو زیادہ توانائی کا مظاہرہ کر سکے۔

اس ذہین پرجوش اور مستعد لڑکے کے جواب میں کوئی نقص نہیں ہے۔ آپ اس کی کمر تھپک کے حوصلہ افزائی کی نیکی کمائیں لیکن آپ نے محض جواب سنا ہے، جواب کے پیچھے چھپا ہوا ایک جذبہ شاید آپ کے ذہن رسا تک رسا نہیں ہوا، جواب برجستہ اور آپ کی توقع کے مطابق تھا، اس مسرت میں آپ نے دوسرے پہلوؤں پر توجہ نہیں دی۔ لڑکے کا مقصد بلاشبہ وہی ہے جو اس نے صاف گوئی سے بیان کیا ہے تاہم جو آپ سمجھ رہے ہیں بات وہ نہیں ہے۔ ہوا کا رخ بدل گیا ہے، طالب علم کے ذہن میں کچھ اور ہے آپ کے خیال میں کچھ اور۔ آپ کی آرزو ہے کہ یہ ذہین اور خوش اطوار لڑکا اپنے شعبے میں کمال حاصل کرے اور اس علم میں افزائش کا سبب بنے جس کے حصول کا وہ جویا ہے، آرزو اس کی بھی یہی ہے، آرزوؤں میں اختلاف نہیں ہے مگر مقاصد میں اختلاف ہے۔ آپ اجتماعیت کے بارے میں سوچ رہے ہیں، وہ اپنی ذات میں محصور ہے اور باہر آنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اسے نام وری اور عزت کے ساتھ دولت بھی درکار ہے، عالی شان مکان، کار، مقام اور شعور کی بیوی۔ درس گاہ کے مقررہ اوقات میں صرف چند علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے اپنے گھر، محلے، شہر اور ملک میں بھی جگہ جگہ درس گاہیں کھلی ہوئی ہیں جہاں ایک علم عام ہے، علم زر کی تعلیم، حصول زر کی تعلیم۔ اس علم نے اس زمین پر گزشتہ عشروں میں نہایت شد و مد سے ترقی کی ہے۔ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں حاصل یہ ہے کہ علم کا جو قدیم اور افلاطونی تصور آپ کے ذہن میں بیٹھا ہوا ہے اور جسے آپ ایک منضبط اور مضبوط معاشرے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، وہ اب یہاں شاذ شاذ نظر آتا ہے۔

علم زر سب سے بڑا علم ہے۔ وہ لوگ مغتنم ہیں جو مختلف علوم و فنون کی سیڑھیوں سے گزر کے اس علم کی طرف رغبت کرتے ہیں کیونکہ علم زر کے لیے دوسرے علوم سے آگہی شرط نہیں ہے جیسا کہ دوسرے علوم کے لیے لازم ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک مکمل اور جامع علم ہے۔ اس زمین پر یہی ہو رہا ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنے ذہن میں خوابوں کی محفل سجائے ہوئے ہے اور اس کی تعبیر کے لیے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ اسے ایک محل کی ضرورت ہے جہاں ایک چمن زار ہو اور نوادر موجود ہوں۔

اس پہ خفا ہونے کا کیا محل ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور دیدۂ بینا رکھتا ہے۔

آپ کو حیراں ہوگا کہ اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ رحیم یار خاں سے ایک نامہ نگار چودھری امانت علی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ بہتر ہے اب کچھ کہا نہ جائے۔ انھوں نے مجھے دعوت دی ہے کہ میں دس پندرہ روز کے لیے اُن کے پاس آجاؤں وہ مجھے کسی [illegible] بند کر دیں گے یا پھر میں نہیں کر پاؤں گا میں کتابیں سمیٹ لوں اور قلم رکھ کے خود کو کسی تہ خانے میں بند کر لوں اور اس وقت تک باہر نہ نکلوں جب تک [illegible] دکھانے کی جرأت نہ ہو جائے۔ میں بھاگتے ہوئے دنوں کا اسی طرح تعاقب کر سکتا ہوں اور میرے انتظار میں ناراض ہونے والے اسی طرح کن [illegible] سکتے ہیں۔ پنڈی سے افضل صاحب کا کہنا ہے کہ دس تاریخ کے بعد سب رنگ کی طلب میں لوگوں کا اضطراب ایسا ہو جاتا ہے جیسے تاریخیں گزرتی جاتی ہیں لوگوں کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے اور وہ تبصرے کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں کہ شاید اس ماہ نہ آئے اور پھر سب رنگ آجاتا ہے۔ پنڈی ہی سے ارشد [illegible] کے دوران کرتا ہے کہ اب دو ماہی کی تیاری کس منزل میں ہے۔ وہ میرے طلب گاروں کی شدت کا احوال سناتا رہتا ہے۔ کیپٹل بک اسٹال کے شاہ [illegible] نے پیام ارسال کیا انٹرنیٹ کے ذریعے یہ پیغام بھجوایا ہے کہ اسے ایک ٹیپ ریکارڈر فراہم کر دیا جائے تاکہ وہ سب رنگ کے نشر بازوں کے تبصرے ٹیپ کر کے مجھے بھی سنوا دیں [illegible] جو اس سے کیے جاتے ہیں، کچھ تو میری سماعت بھی ان بلاغت نظام تبصروں سے محفوظ ہو۔

کئی مہینوں سے تاخیر ہو رہی ہے اور کئی مہینوں سے میں تاخیر کے جواز پیش کر رہا ہوں۔ چونکہ تاخیر کا سلسلہ بند نہیں ہوتا اس لیے میرے عذر بھی ختم نہیں ہوتے۔ تاخیر بلاشبہ بہت بڑا گناہ ہے۔ قاری اور مدیر کے درمیان وقت کا ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ معاہدے کے مطابق وقت پر لوگوں کی طلب برحق ہے۔ وہ اصرار کر کے پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ اسے کیا قیامت گزر گئی۔ ایک جانب معاہدہ شکنی ہے تو دوسری جانب [illegible] داری کا خیال کیوں کیا جائے۔ انتظار میں بارہا اذیت ہوتی ہے۔ ویسے بھی یہاں کون کسی کا انتظار کرتا ہے۔ لوگ وقت پر نہیں آتے تو انتظار کرنے والے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ معاشرے کی زد سے موسم اور غیر یقینی حالات کی رعایت ایک اوبار ہی دی جاتی ہے۔

تمام باتیں درست۔ تمام الزامات تسلیم مگر ان سے جو سب رنگ کو ایک رسالہ سمجھتے ہیں اور اسے زندگی کے دوسرے قواعد و ضوابط کی طرح برتتے ہیں۔ میں نے نہ کبھی اسے رسالہ سمجھا ہے اور نہ خود کو مدیر۔ [illegible] نہ جانے یہ سب کیا ہے، چلیں ایک تماشا ہے، بازو ہونے پر تو زخم ہے بہتری ہے۔ نہ ہاتھ کا چتر ہے نہ پاؤں کا اور [illegible] کا ہوش ہے۔ دماغ کا پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ جسم پر گرد جمتی جا رہی ہے۔ وہ جب [illegible] میں بیج گئی ہے۔ کچھ خبر نہیں کون شرارت کرتا ہے سر کے بال نوچ نوچ لیتا ہے اور جسم پر نیلی پیلی لکیریں کھینچ رہا ہے۔

اس پرچے کی اشاعت سوا لاکھ ہے۔ برصغیر میں چھپنے والے تمام اُردو رسائل سے زیادہ اور عمر اس کی چھ سال سے کم ہے۔ یہ کام نظم و ضبط قاعدے قرینے اور اصول سے ہوتا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی مدت لگتی۔ گزشتہ مثالیں سامنے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں [illegible] کمال بے ترتیبی میں مضمر ہے اور وحشت سبب اتفاق ہے۔ ایسا ہے تو پھر وحشت بھی ایک اصول اور ایک قدر ٹھہری۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے قد اور وزن سے زیادہ ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ میں نے اپنے عہد کی پاس داری کے لیے چھ سال [illegible] کی خاک چھانی ہے اور عملاً رحیم یار خاں میں رہا ہوں۔ میں چھ سال سے ایک تہ خانے میں بند ہوں۔ میں نے ایفائے وعدہ کے لیے اپنے آپ سے بے وفائی کی ہے۔ وہ نظم و ضبط وہ سلیقہ اور قرینہ جس کا بہت ذکر کیا جاتا ہے بے حد آسان کام ہے۔ خوب صورت تحریریں، عمدہ لیٹر پیڈ، صاف ستھرے کمرے، باوردی چوکی دار، خوش لباس رفیق کار، حاضری کا رجسٹر، فون وصول اور منتقل کرنے والی خوش جمال، خوش گفتار، شیریں دہن، [illegible] دبیز قالین، چمک دمک، جگہ جگہ آرائش، نرم سفید کاغذ، اطلاعات موتی بکھیرنے والے خوش نویس، اور [illegible] لکھنے والے قلم کار، دو مہینے پہلے سے پروگرام، ٹیپ ٹاپ، شمولیت، شامل، اٹینشن، لیفٹ رائٹ، ہالٹ، گرین سگنل، سٹینڈرڈ، تمام ریڈیو سے ملا ہوا وقت، طلوع ۵ بجے، غروب ۷ بجے، سب مل بہت خوش کن راحت افزا رنج پرور اور آسان ہے۔ یہ کام بھی کر سکتے ہیں اور کرنا بھی چاہیے مگر آدمی اور مشین میں ایک ہی فرق ہے۔

سب رنگ میں پلگ لگا کے اور سوئچ آن کر کے مشین چلانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں آدمی نے کام کیا اپنے نیاز مندوں سے مشین کی طرح بے نیازی نہیں برتی۔ یہاں تو صرف آدمی تھا جس کے اندر ایک سی ذہنی سی نہیں ہوتا کچھ اور ہوتا ہے۔ سب رنگ ایک آدمی کی روح ایک آدمی کا جذبہ ہے۔ یہاں بزرگیاں نہیں جتنے آدمی تھے ان میں آدمی کا کرنٹ تھا آدمی کا کرنٹ ہے اور جب تک یہ کرنٹ جاری رہے گا سب رنگ کا رابطہ اپنے عزیزوں سے نہیں ٹوٹے گا۔ اصل میں نظام تو اس کرنٹ ہی کا باقاعدہ با ضابطہ ہونا چاہیے۔ نظم و ضبط کی باقی چیزیں تو بازار میں مل جاتی ہیں۔ ایک ہی چیز نہیں ملتی جسے روح کہتے ہیں۔ میں نے یہ عمل اپنے خون اور پسینے سے پیدا کی ہے۔ یہ بادلوں اور شجر سے گزر کے نہیں آتی، سینے سے گزر کے آتی ہے۔

معاشرے، وقت اور نظم کی بات جانے دو عاشقی کب اس کی پابند ہوتی ہے۔ عاشقی تو جانے خود ایک جبر اور مسلسل جبر ہے اور اس کا مقسوم بے قراری ہے۔ یہ بے قراری ہی چیزوں کو چیزوں سے ممتاز کرتی ہے۔ میرا اس لیے ہو گئی کہ قرار نہیں تھا۔ عاشقی کا احساس تھا بازار کی زندگی گزرنی کی پروا نہیں تھی۔ پروا اس قدر کی تھی جس پہ آدمی کا اعتبار قائم ہے۔ میری پیشانی جو تمھاری آنکھوں میں جھانک کے دیکھو، میں بہت تنہا ہوں، میں چلا جاؤں گا تو تمھیں بہت یاد آؤں گا —— کچھ اور نہیں کہنا ——

شکیل عادل زادہ



اردو کے زندۂ جاوید ادیب
سعادت حسن منٹو کی تحریر
یہ تحریر پڑھ کے بے ساختہ
موپساں کی یاد آتی ہے
وہی بے ساختگی اور بے تکلفی
وہی چٹکیاں اور کاٹ

ساحل

توفیق جب شام کو کلب میں آیا تو پریشان سا تھا۔ دو دور برج کے بعد اس نے جمیل سے کہا۔ "تو بھئی میں چلا۔"

جمیل نے توفیق کے گورے چٹے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ "اتنی جلدی؟"

ریاض نے تاش کی گڈی کے دو حصے کر کے انھیں بڑے ماہرانہ انداز میں پھینٹنا شروع کیا۔ اس کی نگاہیں تاش کے پھڑپھڑاتے پتوں پر تھیں لیکن روئے سخن توفیق کی طرف تھا۔ "توفی! آج تم پریشان ہو۔ خلافِ معمول اوپر تلے دو دور ہارے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج شام کو اسپتال میں نرس مارگریٹ نے تمھارے رومانس کو پوٹاسیم برومائڈ پلا دیا؟"

جمیل نے ایک بار پھر غور سے توفیق کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "کیوں توفی! آج ٹمپریچر کیسا رہا؟"

نصیر اپنی کرسی سے اٹھا۔ توفیق کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ نکالا اور زور کا کش لے کر کہنے لگا۔ "سب بکواس ہے۔ توفی نے آج تک جتنے رومانس لڑائے ہیں، سب بکواس تھے۔ یہ نرس مارگریٹ کا قصہ تو بالکل من گھڑت ہے۔ مری کی ٹھنڈی ہواؤں سے یہاں لاہور کی گرمیوں میں آنے کے باعث اسے سرسام ہو گیا ہے۔"

توفیق اٹھ کھڑا ہوا۔ "بکو نہیں۔"

نصیر ہنسا۔ "اگر نہیں ہوا تو آج کل میں ہو جائے گا۔ بتاؤ تمھارے ابا کب تک اسپتال میں رہیں گے؟" یہ کہہ کر وہ توفیق کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

توفیق نے اپنے کلف لگے ململ کے کرتے کی ڈھیلی آستینیں اوپر چڑھائیں اور جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلو چلیں۔ میری طبیعت یہاں گھبرا رہی ہے۔"

جمیل اٹھا۔ "بھئی توفی! تم کوئی بات چھپا رہے ہو۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"گڑبڑ کچھ نہیں۔ نصیر کی بکواس سے کون ہے جس کی طبیعت نہیں گھبراتی۔" توفیق نے جیب سے باجا نکالا اور منہ کے ساتھ لگا کر بجانا شروع کر دیا۔

نصیر نے اپنی ٹانگیں میز پر پھیلا دیں اور زور سے کہا۔ "بکواس ہے سب بکواس ہے۔ یہ دھن جو تم بجا رہے ہو، رشید عطرے کی ہے اور رشید عطرے کی کوئی دھن سن کر آج تک کوئی اینگلو انڈین یا کرسچین نرس بے ہوش نہیں ہوئی۔ بہتر ہوگا اگر تم رومال پر تھوڑا سا کلوروفارم چھڑک کر لے جاؤ۔"

ریاض نے تاش کی گڈی رکھ دی اور نصیر کی ٹانگیں ایک طرف ریل دیں۔ "کچھ بھی ہو لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ توفی یہاں اپنی گاڑی کا ہارن بجائے تو لڑکیاں سن کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔"

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبادی۔ "اور سائیکل کی گھنٹی بجائے تو آسمان سے فرشتے اُترنے شروع ہوجاتے ہیں۔ ایک دفعہ اس کی کھانسی کی آواز سُن کر باغِ جناح کی ساری بُلبلیں اپنی نغمہ سرائی بھول گئی تھیں۔ بڑا ہنگامہ ہوگیا تھا۔ ماسٹر غلام حیدر نے پورا ایک مہینہ انھیں ریہرسل کرائی تب جا کر وہ کہیں ٹوں ٹاں کرنے لگیں۔"

توفیق کے سوا باقی سب ہنسنے لگے۔ نصیر ذرا سنجیدہ ہوگیا۔ اُٹھ کر توفیق کے پاس آگیا۔ اس کے کف لگے ململ کے کُرتے کی ایک شکن درست کی اور کہا: "مذاق برطرف لو اب بتاؤ، اسپتال کی لونڈیا سے تمھارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟ ویسے تو سمجھتا ہوں وہیں کا وہیں ہوگا۔ ایک شریف آدمی اپنڈے سائنس کا آپریشن کرانے پڑا ہے۔ مقررہ اوقات پر تمھاری نرس صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ جناب صرف ایک دفعہ صبح اور ایک دفعہ شام وہاں جاسکتے ہیں۔ مریض اور وہ بھی قبلہ والد صاحب۔ وہ مریضِ اپنڈے سائنس اور تم مریضِ عشق۔"

ریاض نے قریب آکر کہا: "مریضِ عشق پر رحمت خدا کی۔"

نصیر کی رگِ مذاق پھر اُبھری۔ "اور مریضِ عشق پر جب خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے تو وہ بینڈ ماسٹر بن جاتا ہے۔ آج توفی کا منہ باجا بجا رہا ہے۔ خدا کی رحمت شاملِ حال رہی تو کل سیکسو فون بجائے گا۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ دوسرے مریضانِ عشق شامل ہوجائیں گے پھر یہ براتوں کے ساتھ منہ میں کلارنٹ دبائے فلمی دھنیں بجایا کرے گا۔ ہیرامنڈی سے گزرتے ہوئے اس کی کلارنٹ کا منہ اونچا ہوجایا کرے گا۔ گال دھونکنی کی طرح پھولیں گے۔ گلے کی رگیں اُبھر آئیں گی اور رنڈیاں کوٹھوں سے اس پر رحمتِ خداوندی کے پھول برسائیں گی۔"

توفیق تنگ آگیا۔ ہاتھ جوڑ کر نصیر سے کہنے لگا۔ "خدا کے لیے یہ بھانڈ پنا بند کرو۔"

نصیر نے جمیل کی طرف دیکھا۔ "لو صاحب! ہم بھانڈ ہوگئے۔ دُنیا بھر کی نقلیں یہ اُتاریں، زمانے بھر کی خرافات یہ بکیں اور بھانڈ ہم کہلائیں۔ یہ تو آج انھیں منہ میں گھنگنیاں ڈالے دیکھ کر میں نے چھیڑ خانی شروع کردی کہ شاید اسی حیلے انھیں منہ سے بولیں سر سے کھیلیں ورنہ جائے استاد خالی است، کجا رام رام، کجا ٹیں ٹیں۔" یہ کہہ کر اُس نے توفیق کے کف لگے ململ کے کُرتے کی شکن درست کی۔ "بھئی توفیق ذرا چہکو۔ کیا ہوگیا ہے تمھیں؟"

توفیق نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور کش لیتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز سے تاش کی گڈی اُٹھائی اور پیشنس کھیلنے لگا لیکن نصیر نے لپک کر پتے اُٹھالیے۔ "یہ بڈھے جرنیلوں کا کھیل ہے جو زندگی میں کئی بار اپنی کشتیاں جلاچکے ہوں۔ تم اتنے مایوس کیوں ہوگئے ہو؟ مارگریٹ نہ سہی کوئی اور سہی۔" یہ کہہ کر وہ جمیل اور ریاض سے مخاطب ہوا۔ "یارو! بتاؤ یہ قتالہ کون ہے؟ خوب صورت ہے؟ چندے آفتاب چندے مہتاب ہے؟ پانی پیتی ہے تو گردن سے دکھائی دیتا ہے؟"

جمیل توفیق کے پاس بیٹھ گیا۔ "وہ فارسی کا محاورہ کیا ہے؟ لیلا بنظرِ مجنوں باید دید۔ مارگریٹ بنظرِ توفی باید دید۔ کیوں توفی؟" توفیق خاموش رہا۔ "میں پوچھتا ہوں خوب صورت ہے؟ اُس کے بدن سے آئڈوفارم کی بھینی بھینی بو آتی ہے؟ اُس کی گردن دیکھ کر گردن توڑ بخار ہوتا ہے یا نہیں؟" نصیر یہ کہتا کہتا میز پر بیٹھ گیا۔ "مینڈکیوں کو جو زکام ہوتا ہے اُس کا علاج تو وہ ضرور جانتی ہوگی؟ خدا کے لیے مجھے اُس سے ضرور ملاؤ ورنہ مجھ پر ہسٹریا کے دورے پڑنے لگیں گے۔"

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا۔ "ریاض اُسے کئی مرتبہ دیکھ چکا ہے۔"

"ریاض کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے، اسے تو اندھوراتا ہے۔"

جمیل نے پوچھا۔ "یہ اندھوراتا کیا ہے؟"

نصیر نے ریاض کا چشمہ لگا چہرہ گھور کے دیکھا اور جمیل کو جواب دیا۔ "جناب یہ ایک بیماری کا نام ہے۔ اس کے مریض عورتوں کو نہیں دیکھ سکتے چاہے اصلی پتھر کا چشمہ لگائیں۔"

ریاض مسکرادیا۔ "شاید اسی لیے مجھے مارگریٹ میں وہ حُسن نظر نہیں آیا جس کی تعریف میں توفی نے زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے ہیں۔"

توفیق نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھا کے ریاض سے صرف اتنا پوچھا۔ "کیا وہ حسین نہیں تھی؟"

ریاض نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔ صاف ستھری لڑکی البتہ ضرور ہے۔"

"لانڈری سے تازہ تازہ آئی ہوئی شلوار کی طرح؟" نصیر ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔

ریاض بول پڑا۔ "ہاں یار! ایک دن اُس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اُن کپڑوں میں اچھی لگتی تھی۔ میں اور توفی موٹر میں تھے۔ توفی ڈرائیو کر رہا تھا۔ موٹر اسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو اسٹیرنگ توفی کے ہاتھوں کے نیچے پھسلا۔ لڑکی دیکھ کر ہمیشہ اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے سامنے دیکھا تو وہ شلوار قمیص پہنے مٹکتی چلی آرہی تھی۔ توفی نے موٹر عین اُس کے پاس روکی اور کہا۔ 'گڈ مورننگ'۔ وہ مسکرائی۔ لکھنوی انداز سے دایاں ہاتھ ماتھے تک لے گئی اور کہا: 'آداب عرض'۔ جیسا لباس ویسی بولی۔ لونڈیا ہے چالاک۔ توفی ابھی کوئی فقرہ موزوں کر رہا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے مگر تیز قدم اُٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ توفی نے فقرہ چھوڑا اور سینے پر دوہتڑ مار کر کہا: 'مار ڈالا'۔ اتنے میں مارگریٹ کا عکس بیک ویو مرر میں نمودار ہوا۔ توفی نے بڑے حقیر سے انداز میں ایک عدد چُما اُس کی طرف پھینکا اور موٹر اسٹارٹ کردی۔"

"تمھاری اس گفتگو سے کیا ثابت ہوا؟" نصیر نے اپنے گھنگھریالے بالوں کا ایک گچھا مروڑتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ جب تک یہ خاک سار

کرن کرن خوشبو

شکار کھیل رہا تھا۔ ایک بدّو نے اُس سے شکاری کتا مانگا۔ بدّو کی درخواست منظور کرلی گئی اور اُسے کتا مل گیا۔ اُس نے کہا "میں اس کے ساتھ دوڑ نہیں سکتا۔" ہارون نے اُسے گھوڑا دے دیا۔ بدّو نے کہا "میں شکار سے واپس آؤں گا تو میرا کھانا کون تیار کرے گا؟" ہارون نے ایک کنیز اُس کے حوالے کردی۔ بدّو نے کہا "مگر میں ان سب کو رکھوں گا کہاں؟" ہارون نے اُسے ایک مکان بھی دے دیا اور جاگیر بھی دی۔

☆

بقلم خود اس لونڈیا کو نہیں دیکھے گا، کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا۔ جھوٹ بولوں تو توفی کا منہ کالا ہو۔"

توفیق خاموش سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ جمیل نے اپنی کرسی ذرا آگے بڑھائی اور ریاض سے پوچھا "اچھا بھئی یہ بتاؤ' توفی نے کبھی اُسے موٹر کی سیر نہیں کرائی؟"

ریاض نے جواب دیا "ایک دفعہ اس نے کہا تو تھا اُس سے مجھے یاد نہیں رہا اُس نے کیا جواب دیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ توفی کو کھل کے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ٹمپریچر لینے یا ٹیکا لگانے کے لیے آتی ہے تو باپ کی موجودی میں یہ اس سے کیا بات کرسکتا ہے۔ پھر بھی اشاروں کنایوں میں کچھ نہ کچھ بات ہو ہی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ دونوں آج صرف اسی لیے ہیں کہ اس کے ابا جان دو تین دنوں میں اسپتال چھوڑنے والے ہیں کیونکہ زخم اب بالکل بھر چکا ہے۔ کیوں توفی؟"

توفیق نے صرف اتنا کہا "مجھے ستاؤ نہیں یار" اور اُٹھ کر باغ میں چلا گیا۔

نصیر نے اپنی ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑی اور چہرے پر گہری فکرمندی کے نشانات پیدا کرکے کہا "کہیں ملڈے کو اسک تو نہیں ہوگیا؟"

"توفیق اور عشق؟ دو متضاد چیزیں ہیں۔" ریاض کرسی سے اُٹھا اور سنجیدگی سے کہنے لگا "کوئی اور ہی چیز ہوئی ہے جناب کو۔ میرا خیال ہے لاہور میں اس کا جی لگ گیا ہے۔ والد ٹھیک ہوگئے ہیں تو اب اُسے مری واپس جانا پڑے گا۔"

"بکواس ہے۔" نصیر چلایا "کوئی اور ہی بات ہے۔ تم یہاں ٹھیرو۔ میں ابھی دریافت کرکے آتا ہوں۔"

نصیر اُٹھ کر باہر چلنے لگا تو جمیل نے اُس سے پوچھا "کس سے دریافت کرنے چلے ہو؟"

نصیر مسکرایا "گھوڑے کے منہ سے۔ انگریزی میں فروم دی ہارسز ماؤتھ۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے پوچھا "ہاں بھئی ریاض' یہ سلسلہ کیا ہے۔ توفی ایک دن بہت تعریف کررہا تھا اُس مارگریٹ کی۔ کہتا تھا کہ معاملہ پٹا سمجھو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہی ہوگا۔ میرا مطلب ہے' ایسا کون سا چتوڑ گڑھ کا قلعہ ہے جو توفی کو سر کرنا ہے۔ ایک دن کوری ڈور میں کافی میٹھی میٹھی باتیں کررہے تھے۔"

"کیا؟"

"میں نے پاکٹ بک میں نوٹ کی ہوئی ہیں۔ کسی دن پڑھ کے تمھیں سناؤں گا۔"

جمیل کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "مذاق کرتے ہو یار! سناؤ کوئی اور بات سناؤ۔ میرا مطلب ہے یہ بتاؤ کہ میں کبھی اُس نرس کو دیکھ سکتا ہوں؟"

"جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ اسپتال چلے جاؤ' فیملی وارڈ میں تمھیں نظر آجائے گی لیکن کیا کروگے دیکھ کر۔ تمھارا قد بہت چھوٹا ہے۔ وہ تم سے پورے ایک بالشت اونچی ہے۔"

"اس قد نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ بہتیرے علاج کروا چکا ہوں۔ ایک سُوئی برابر اونچا نہیں ہوا۔ اچھا میں نے کہا ریاض! باپ کی موجودی میں توفی اُس سے اشارے بازی کیسے کرتا ہوگا؟ نہیں' لڑکا ہوشیار ہے۔"

ریاض نے تاش کی گڈی اُٹھائی اور پتے پھینٹنے شروع کیے۔ "اچھی خاصی مصیبت ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا کہ والد دیکھ نہ لے' تاڑ نہ جائے۔ کہتا تھا جوں ہی اُن کی نگاہیں میری طرف اُٹھتی ہیں میں نظریں نیچی کرلیتا ہوں۔ جب وہ آتی تھی تو دس پندرہ منٹوں میں غریب کو صرف تین چار موقعے آنکھ لڑانے کے ملتے تھے۔"

جمیل نے پوچھا "ڈی' ایس' پی ہیں نا توفی کے ابا جان؟"

"ہاں بھائی' باپ ہونا ہی کافی ہوتا ہے' اوپر سے ڈی ایس پی۔"

جمیل نے آہ بھری "میرے تمام رومانس غارت کرنے والے میرے ابا جان ہیں۔ حج سے پہلے اُن کی غارت گری اتنے زوروں پر نہ تھی پر جب سے خانۂ کعبہ سے واپس تشریف لائے ہیں' آپ کی غارت گری عروج پر ہے۔ سوچتا ہوں شادی کروں' ایک لڑکا پیدا کروں اور میٹھا اُس سے اپنا انتقام لیتا رہوں۔"

ریاض مسکرایا "حج کرنے جاؤ گے؟"

"ایک نہیں' دس دفعہ۔ صاحب زادے کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے میز پر زور سے مکا مارا۔ آواز کے ساتھ ہی نصیر داخل ہوا۔ ریاض اور جمیل دونوں اُس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ نصیر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمیل کے دماغ میں گدگد ہونے لگی "کچھ دریافت کیا؟"

"سب کچھ۔" نصیر کا جواب مختصر تھا۔

ریاض نے پوچھا "توفی کہاں ہے؟"

نصیر نے جواب دیا "چلا گیا۔"

"کہاں ؟" ریاض نے سوال کیا۔

"واپس مری۔"

نصیر کا یہ جواب سن کر ریاض اور جمیل دونوں بیک وقت بول پڑے "مری واپس ؟"

"ہاں اس مری واپس چلا گیا ہے اپنی موٹر میں۔ اسپتال سے سیدھا یہاں آیا اور یہاں سے سیدھا مری روانہ ہو گیا ہے۔" نصیر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

جمیل حیران ہو گیا "آخر ہوا کیا ؟"

نصیر نے جواب دیا "حادثہ !"

جمیل اور ریاض دونوں ہی بول اٹھے "کیسا حادثہ ؟"

"بتاتا ہوں" یہ کہہ کر نصیر نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی جس میں کوئی سگریٹ نہیں تھا۔ ڈبیا ایک طرف پھینک کر وہ ریاض اور جمیل سے مخاطب ہوا "معاملہ بہت سنگین ہے۔"

جمیل نے ریاض سے کہا "میرا خیال ہے توفی پکڑا گیا ہوگا ؟"

ریاض نے کہا "معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی کب تک کسی کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ ڈی ایس پی ہے۔ فوراً تاڑ گیا ہوگا لیکن نصیر تم بتاؤ توفی نے تم سے کیا کہا ؟"

"بتاتا ہوں۔ ایک سگریٹ دینا جمیل !"

جمیل نے اُسے ایک سگریٹ دیا۔ اسے سلگا کر اُس نے بات شروع کی "باپ کی موجودگی میں اُس کی رس سے اشارے بازی ہوتی تھی۔ یہ تم لوگوں کو معلوم ہے۔ یہ سلسلہ اشارے بازی کا بہت دنوں سے جاری تھا۔ توفی اس میں خاصا کامیاب رہا تھا۔ باپ کی موجودگی کے باعث اُسے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ وہ ذرا گردن گھماتے تو یہ فوراً اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا۔ ان دقتوں کے باوجود اُس نے لڑکی سے ربط بڑھا ہی لیا۔ آف ڈیوٹی کے روز شام کو وہ اُسے ایک مرتبہ سینما بھی لے گیا۔"

جمیل گنگنایا "واہ۔"

ریاض نے کہا "مجھ سے اُس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

نصیر نے سگریٹ کا کش لیا "سینما میں وہ خوب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ رس کو توفی کا چنچل پن بہت پسند آیا۔ پرسوں کی ملاقات میں آج کی شام طے ہوئی کہ وہ توفی کے ساتھ دور تک موٹر کی سیر کرنے چلے گی اور توفی اپنی عادت کے مطابق اگر کوئی شرارت کرنا چاہے گا تو وہ برا نہیں مانے گی۔"

جمیل پھر گنگنایا "واہ۔"

ریاض نے اُسے ٹوکا "خاموش رہو جمیل !"

نصیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا "پرسوں کی ملاقات میں جو کچھ طے ہوا تھا میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ توفی بہت خوش تھا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ایک بہت بڑا میدان مارنے والا تھا۔ آج دن بھر وہ اسکیمیں بناتا رہا۔

کیتھرائن

سوئڈن کے گاؤں مرین برگ میں رہتی تھی۔ اس کے باپ کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ کیتھرائن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا باپ کہاں چلا گیا؟ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنتی۔ اُسے روکھا سوکھا کھانے کو ملتا مگر جب اس کا باپ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا تو اسے اپنی مفلسی کا احساس نہ رہتا۔ اب کیتھرائن کو صرف ماں کی رفاقت حاصل تھی۔ بیوہ ماں محنت مزدوری کرکے اس کا اور اپنا پیٹ پالنے کی کوشش کرتی مگر اُسے اتنا بھی نہیں ملتا تھا کہ وہ دو پیٹ بھر سکے۔ کیتھرائن کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی ماں زندہ ہے۔ ماں بھی اپنی بچی کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ آخر ایک رات وہ بھی کیتھرائن کو بے سہارا چھوڑ کے چل بسی۔ ایک پادری گسی کاف نے اس یتیم بچی کو اپنے گھر میں پناہ دی لیکن کیتھرائن کو یہاں بھی سکون نہیں ملا کیونکہ پادری کا بیٹا اُسے بری نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ پادری سے اس کی شکایت کرکے باپ بیٹے میں نفرت ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ایک رات اس نے چپ چاپ پادری کا گھر چھوڑ دیا۔ کیتھرائن ایک نئی دنیا بسانے کے لیے نکلی تھی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ حوصلے ٹوٹ رہے تھے لیکن وہ رات کے اندھیرے اور جنگل کی سائیں سائیں سے بے خوف ایک انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ چلتے چلتے اچانک اس نے پہلے تو گھوڑے کی ٹاپیں سنیں پھر کسی کی زبان سے اپنا نام سنا۔ پادری اُسے تلاش کرتا ہوا آ پہنچا تھا۔ کیتھرائن وہیں بیٹھ گئی۔ دل گرفتگی نے اس سے قوتِ گویائی کے علاوہ آگے بڑھنے کی طاقت بھی چھین لی تھی۔ پادری نہایت شفقت سے اصرار کرکے واپس لے گیا۔ ایک دن روس کا شہنشاہ پیٹر اعظم مرین برگ کا دورہ کرنے پہنچا۔ اس نے گسی کاف ہی کے گھر قیام کیا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ کیتھرائن بھی سلام کے لیے حاضر ہوئی۔ بادشاہ اس سادہ اور پُرکار حسن کے تماشے میں اتنا محو ہوا کہ دیکھنے والے چونک گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس دوشیزہ کی تربیت شاہی محل میں کی جائے۔"

کیتھرائن شاہی محل میں منتقل ہوگئی۔ اس کے دن پھر گئے اور ایک وقت وہ آیا کہ وہ روس کی ملکہ بنی۔ گھر گھر اس کے حسن کا چرچا تھا اور وہ پیٹر اعظم کے پہلو بہ پہلو تخت پر جلوہ افروز ہوتی تھی۔ کیتھرائن کو اپنا گزرا ہوا دور یاد آتا۔ دو وقت ملنے کی وجہ سے، باپ کی موت، سردی کے سبب ماں کا مرنا اور پادری کی مہربانیاں وغیرہ۔ اب وہ بہت مطمئن تھی لیکن بدقسمتی اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ ایک روز پیٹر اعظم نے اس پر ایک سرکاری افسر سے ناجائز تعلقات رکھنے کا الزام لگایا اور اس سے محبت کرنے کے بجائے نفرت کرنے لگا۔ کیتھرائن اپنے زوال کی منتظر تھی۔ وہ صبح و شام محل کے باغ میں ٹہلتی اور مرین برگ کی طرف دیکھتی رہتی۔ اسے پادری گسی کاف بہت یاد آتا۔ ایک دن پادری اس سے ملنے آیا۔ کیتھرائن نے اُسے صورتِ حال سے مطلع کیا۔ پادری نے اسی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا جیسے وہ اس کے بچپن میں اُسے گرجا لے جاتے وقت تھامتا تھا۔ پھر وہ دن گزر گیا، شام بھی گزر گئی۔ جب دوسری صبح طلوع ہوئی تو لوگوں نے یہ اعلان سنا کہ پیٹر اعظم اس دنیا سے رخصت ہوگیا ہے۔ اب سارے روس کی مالک کیتھرائن تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پادری گسی کاف نے محل کے باغ میں اس سے ایک جملہ کہا تھا کہ "اپنی عزت کے لیے سب کچھ کر گزرنا چاہیے۔"

پیٹرول کا انتظام اُس نے کر لیا۔ کرم الٰہی نے اُسے کچھ کوپن دے دیے تھے۔ اُسی کی پرمٹ پر بیئر کی کچھ بوتلیں بھی حاصل کر لی تھیں جو غالباً ابھی تک اقتیاز کے فرج یا بیئر میں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ توفی کی اسکیم یہ تھی کہ چنیوٹ کے پل تک چلیں گے۔ حسن و عشق کے دریا چناب کی لہریں ہوں گی۔ موسم بھی خوش گوار ہوگا۔ گلاس راستے میں خرید لیں گے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر اُڑے گی۔ خوب سرور جمیں گے لیکن...... " یہ کہہ کر نصیر ایک دم خاموش ہوگیا۔

جمیل نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "سارا معاملہ غارت ہوگیا؟"

نصیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سارا معاملہ غارت ہوگیا۔"

جمیل نے اور زیادہ بے چین ہو کر پوچھا۔ "کیسے؟"

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی اور کہا۔ "پروگرام یہ تھا کہ وہ شام کو چھ بجے اسپتال جائے گا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنے باپ کے پاس بیٹھے گا۔ اس دوران میں جب مارگریٹ آئے گی تو وہ سیر کی بات پکی کر لے گا۔ بات پکی ہو جائے گی تو وہ سیدھا اقتیاز کے ہاں جائے گا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے گا۔ بیئر کی ایک بوتل پیے گا۔ باقی پانچ موٹر میں رکھے گا اور جو جگہ مقرر ہوئی ہوگی وہاں مارگریٹ سے جا ملے گا۔ دل و دماغ سخت بے چین تھے۔ گھر سے وقت سے کچھ پہلے ہی نکل آیا۔ اسپتال پہنچا۔ موٹر ایک طرف کھڑی کی۔ وارڈ کی طرف چلا۔ سیڑھیاں طے کیں۔ اُوپر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے۔" نصیر ایک دم رُک گیا۔

جمیل اور ریاض دونوں بیک وقت بولے۔ "کیا دیکھتا ہے؟"

"وہ دیکھتا ہے کہ...... ٹھہرو۔" نصیر تھوڑی دیر کے لیے رُکا۔ "میں توفی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مارگریٹ پلنگ پر جھکی ہوئی ہے اور والد صاحب...... اور والد صاحب اُس کے ہونٹ چوس رہے ہیں۔"

جمیل اور ریاض قریب قریب اچھل پڑے۔ "سچ؟"

نصیر نے جواب دیا۔ "دروغ برگردن راوی۔"

جمیل جس کے دل و دماغ پر حیرت مسلط تھی، بڑبڑایا۔ "کمال کر دیا ڈی ایس پی صاحب نے۔"

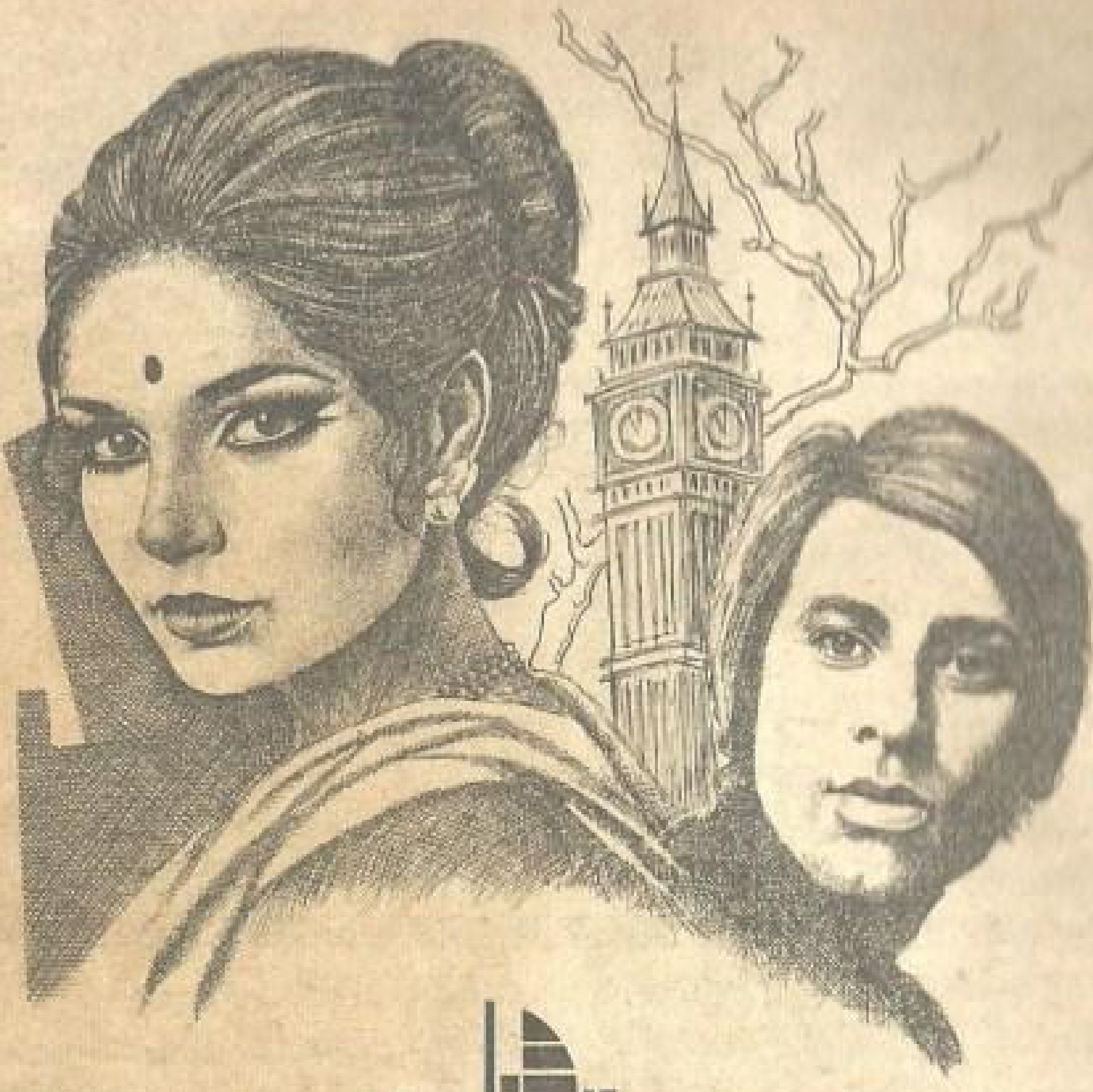
ریاض نے نصیر سے پوچھا۔ "توفی نے کیا کیا؟"

نصیر نے جواب دیا۔ "آنکھیں نیچی کر لیں اور چلا آیا۔"

جمیل ریاض سے مخاطب ہوا۔ "میرے والد صاحب قبلہ کبھی ایسے نظارے کا موقع دیں تو مزا آ جائے۔ پتہ نہیں توفی کیوں اس قدر پریشان تھا؟"

نصیر نے کہا۔ "توفی کی والدہ صاحبہ اُس کے ساتھ تھیں۔ توفی نے مجھ سے کہا میں تو نظریں نیچی کر کے چل دیا لیکن امی جان دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔"

جمیل نے بڑے افسوس لہجے میں کہا۔ "قبلہ والد صاحب کے ساتھ زیادتی ہوئی۔"



اُس شریر شخص کی کہانی، جس کا نام
کرشن چندر ہے۔ کرشن کے لفظوں کا ساز
سنیے۔ کرشن چندر کے لفظوں کا رقص دیکھیے
کرشن چندر کے ساتھ لفظوں کی جلوہ گاہ
میں چلیے اور کرشن چندر کی زندگی کو پا لیجیے

ایک لڑکی کی کہانی جسے کرشن چندر نے دیکھا

ایک دن من موہن سنگھ ہمیں لندن کی بیرا منڈی دکھانے لے چلا۔ ایک بیس مینٹ سے گزار کر ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کے دو تین غلام گردشوں میں چلتے ہوئے کبھی چڑھتے اور پھر چڑھتے ہوئے ہم لندن کی بیرا منڈی میں پہنچے جو پھر ایک بیس مینٹ میں واقع تھی اور میرے خیال میں اسی بلڈنگ میں تھی۔ یہ آنکھوں پر پٹی باندھنا اور بھول بھلیوں سے گزارنا محض ایک سنسنی کی خاطر تھا یا آتشِ شوق کو ہوا دینے کے لیے یا الف لیلوی ماحول پیدا کرنے کے لیے۔ یہ چکر بازی پولیس سے بچنے کے لیے نہیں تھی۔ لندن کی پولیس کسی طرح ہمارے یا کسی دوسرے ملک کی پولیس کی طرح نہیں۔ اس دنیا کا کون سا ایسا قحبہ خانہ ہے جو پولیس کی نگاہوں سے بچا ہوا ہو۔ پولیس کی مصلحت آمیز گریز کے بغیر اس طرح کا کاروبار کہیں بھی نہیں چل سکتا۔

بیروں کی اس منڈی میں ایک دوسرے سے ملحق چھ کمرے تھے۔ اُن میں کوٹھے والیاں تھیں اور ان کمروں کے باہر ایک نیم دائرے کی صورت

میں چھتا ہوا برآمدہ گھومتا تھا جس میں جا بجا چوبی ستون کھڑے تھے۔ ایک پھول باز گجرے والا ایک عطر والا اور ایک پان والا بھی۔ یہ سبھی اسی برآمدے میں اپنی اپنی دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ کسی چھوٹے سے فلمی سیٹ کی طرح اس چھوٹی سی جگہ میں ایک ہندوستانی قصبہ بازار کا لندنی نقشہ پیش کرنے کی پرکشش کوشش کی گئی تھی اور تجارتی اعتبار سے کامیاب بھی تھی۔ من موہن نے مجھے بتایا کہ یہ کاروبار عبدالعزیز اور منسا رام ساجھے میں مل کر چلاتے ہیں۔ عبدالعزیز پاکستان کا رہنے والا تھا منسا رام ہندوستان کا۔ اچانک میری نظر چار نمبر کمرے کے اندر جو پڑی تو میں اس کوٹھے والی کو پہچان کر اندر چلا گیا۔ چند لمحے تو ہم دونوں حیرت میں ڈوبے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر وہ کوٹھے والی اپنے سامنے رکھا ہوا ستار پرے سرکا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگ کر میری طرف بڑھی اور میرے کندھے پر سر رکھ کر سسک سسک کے رونے لگی۔ اتنے زور زور سے کہ سب لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

یہ درشنا تھی۔ میری...... کالج کے زمانے کی محبوبہ۔ میرا مطلب ہے کہ وہ میری محبوبہ تھی، میں اس کا محبوب نہیں تھا کیونکہ میں ایک غریب متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ تھی وہ بھی ایسی ہی، اس کا باپ ایک معمولی وکیل تھا لیکن درشنا خوب صورت تھی اس لیے وہ بہت اونچا اڑنا چاہتی تھی اور اسی لیے وہ مجھے کبھی پسند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پسند تو میں بھی اسے نہیں کرتا تھا لیکن وہ زمانہ ایسا تھا جب مجھے لمبے قد کی چوڑی چکلی منہ لگو لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ ایسی لڑکیاں جو مجھ سے تن و توش میں کم سے کم دگنی ہوں۔ ایسا کیوں تھا کالج کے زمانے میں، اور اب ایسا کیوں نہیں ہے؟ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان دنوں کالج کے کچے زمانے میں ایسی ہی لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ میں دل و جان سے درشنا پر فریفتہ ہو گیا تھا لیکن درشنا نے میرا پیار ٹھکراتے ہوئے کہا تھا "میں تو اسی لڑکے سے محبت کر سکتی ہوں جو مجھے لندن لے جائے"۔ نہ جانے کیوں بچپن ہی سے درشنا کے دل میں لندن جانے کی تمنا تھی۔ وہ ہمیشہ لندن کے خواب دیکھا کرتی تھی اور میں اسے لندن تو کجا لنڈی کوتل تک نہیں لے جا سکتا تھا اس لیے محبت کے بازار میں میری مساعی مشکور نہ ہو سکیں۔ وہ قد میں مجھ سے تین انچ اونچی تھی اس لیے اس کے دیکھنے کی سطح بھی مجھ سے اونچی تھی۔ وہ ٹینس کی بہت اچھی کھلاڑی تھی۔

ہمارا کالج اسکاٹش مشنریوں کا کالج تھا۔ درشنا کا اونچا لمبا قد، بے باک ہنسی مغربی عورتوں کی طرح اس کا تیز تیز چلنے کا انداز، گورا رنگ اور مضبوط بدن۔ اسے آؤٹ ڈور گرل کی تمام صفات سے متصف کرتے تھے۔

اس زمانے میں ایک آؤٹ ڈور گرل میرے نزدیک اعلیٰ حسن کا معیار تھی۔

درشنا نے کبھی میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔ کبھی اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں نہیں دیا، کبھی اپنا سر میرے کندھے پر نہیں رکھا اور وہ میرے ساتھ کبھی سینما نہیں گئی۔ کبھی اس نے مجھے اپنا ہاتھ تک نہیں چھونے دیا، کبھی اپنی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں دی چونکہ وہ لندن جانا چاہتی تھی اور میں اسے لندن نہیں لے جا سکتا تھا۔

جن دنوں اس نے یونیورسٹی کا میڈل جیتا تھا اور یونیورسٹی کی ساری کی ساری لڑکیوں میں ٹینس کے سنگل میچ میں اول آئی تھی، ان دنوں ہمارے کالج کے پروفیسر میک فرسن صاحب نے درشنا کو چند ماہ کے لیے کالج کے خرچ پر ٹینس کے سلسلے میں مزید تربیت حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا ارادہ کیا۔ شاید ان دنوں درشنا لندن چلی بھی جاتی۔ اس نے نئے کپڑے سلوا لیے تھے، پاسپورٹ بنوا لیا تھا، گھر والوں سے اجازت لے لی تھی لیکن عین وقت پر نہ جانے کیا ہوا، درشنا کی جگہ مس ربی رام لال چلی گئی۔ ربی ایک کرسچین لڑکی تھی اور ٹینس کے کھیل میں درشنا کے بعد دوسرے نمبر پر آئی تھی۔ عین موقع پر پروفیسر میک فرسن نے درشنا کے سامنے ایک ایسی خواہش کا اظہار کر دیا جسے درشنا پورا نہ کر سکی لیکن جسے ربی نے پورا کر دیا اس لیے ربی چلی گئی لیکن اس بات کی تصدیق کبھی درشنا سے نہ ہو سکی۔ اصل واقعہ کیا تھا، یہ درشنا نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ اس کے لندن نہ جانے پر میں نے طنز کیا تھا تو وہ دانت پیس کر بولی تھی "دیکھ لینا میں ایک دن ضرور جاؤں گی"۔ اس پر میں دیر تک ہنستا رہا اور وہ غصے میں ہونٹ چباتی رہی۔

دوسرے سال درشنا نے مشن کالج چھوڑ کر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں اس کی دوستی انگریزی پڑھانے والے لیکچرار نوبت رام سے ہو گئی۔ نوبت رام کا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا تھا اور اب وہ ہندوستانی سول سروس میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ درشنا پر بُری طرح فریفتہ ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے، جتنے چپو، دبو، کم رو طبیعت کے لیکن علم و فضل میں اعلا معیار رکھنے والے نوجوان ہوتے ہیں، انھیں درشنا ایسی لڑکیاں بہت بھاتی ہیں۔ نوبت رام گھر کا امیر نہیں تھا لیکن ذہین ایسا تھا کہ اس کا سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

درشنا نے بہت سوچ سمجھ کے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔

جب نوبت رام ہندوستانی سول سروس کے مقابلے میں بیٹھا تو دوسرے نمبر پر امتیازی شان سے کامیاب ہوا لیکن سول سرجن نے میڈیکل رپورٹ اس کے خلاف دے دی اس لیے بے چارہ نوبت رام ایک طرف سول سروس، دوسری طرف درشنا سے شادی کرنے میں ناکام رہا۔

اسی زمانے میں ایک دن درشنا مجھے ایکسل سیر تھیٹر کے لاؤنج میں مل گئی۔ وہ پکچر دیکھ کے نکل رہی تھی اور میں پکچر دیکھنے جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے ہم دونوں ملے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری طنزیہ نگاہ کی تاب نہ لا کر

اور پھر وہ اُٹھی اور مجھ سے کوئی بات کیے بغیر ہجوم میں غائب ہو گئی۔ وہ اپنے پیچھے ایک ایسا تاثر چھوڑ گئی تھی جو مجھ کو لگ گیا تھا کہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

پھر چند سال گزر گئے اور میں درشنا کو بھول گیا۔ کون کسے یاد رکھتا ہے۔ اگر خدا نے انسان کو بھولنے کی قوت نہ دی ہوتی تو زندگی انسان کے لیے عذاب ہو جاتا اس لیے یہ قوت انتخاب انسان کو دی گئی ہے کہ وہ کچھ چیزیں ہمیشہ کے لیے بھلا دے اور کچھ چیزیں یاد رکھے جو اس کی زندگی کے لیے ضروری ہے اور جب ضرورت نہ رہے انہیں بھی بھلا دے اور اگر پھر کسی وقت وہ ضروری امر ہو جائے تو پھر بھولی ہوئی چیز یاد آ جائے۔ یاد کا عمل بھی انسانی زندگی کا سب سے بڑی ... میں بھی چند ہی سالوں میں درشنا کو اس طرح بھول گیا جیسے وہ میری زندگی میں آئی ہی نہ تھی۔

پھر ایک دن میں نے اُسے بہت سالوں بعد اپنے دوست جیٹھانی کے آفس میں دیکھا۔ جیٹھانی ایک مشہور بزنس مین تھا اور درشنا اُس کی اسٹینو تھی پرسنل اسٹینو۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک چمک نمودار ہوئی تھی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے بجھ گئی۔ اُس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر ہلکی سی تلخی آ گئی تھی اور جب اُس نے مجھے نہیں پہچانا تو میں اُسے پہچاننے والا کون ہوتا ہوں اس لیے میں نے بھی اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور اس طرح زندگی میں ہم دونوں پہلی بار اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کو ملے اور اُسے دیکھ کر میرا دل پہلی بار نہیں دھڑکا وہ دل جو کبھی اُس کے قدموں کی چاپ سُن کر تیز تیز دھڑکنے لگتا تھا اور اب میری پسند دوسری تھی اور دوسری طرح کی تھی اور اُسے دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیوں اور کیسے اس طرح کی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ انسان کی محبت بھی اُس کی سوجھ بوجھ، اُس کی ذہنی سطح اور زندگی کے تجربے سے عبارت ہوتی ہے اور اگر زندگی کے کسی مرحلے پر اُس کی یہ سوجھ بوجھ ذہنی سطح اور تجربے کے انداز بدل جائیں تو اُس کی محبت بھی بدل جاتی ہے۔

بہت حیرت ہوئی یہ سوچ کر کہ محبت بھی کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ ایک زمینی جاندار مخلوق ہے جو بدل سکتی ہے جسے زخمی کیا جا سکتا ہے جسے مارا بھی جا سکتا ہے بھلایا بھی جا سکتا ہے جس پر فخر بھی کیا جا سکتا ہے اور کبھی ایسی محبت بھی کی جا سکتی ہے جس پر شرمندہ بھی ہوا جا سکتا ہے۔ محبت ایک ذی روح شے ہے اور جاں داروں کے سارے قوانین اُس پر عائد ہوتے ہیں۔

میں جیٹھانی کے ہاں اُس سے ایک سفارشی خط لینے آیا تھا جیٹھانی نے درشنا کو بلا کر خط اُسے ٹائپ کرنے کو دیا۔ درشنا وہ خط ٹائپ کر کے لائی۔ جیٹھانی نے دستخط کیے۔ دستخط کرتے وقت میں نے دیکھا کہ ایک خاموش سمجھوتا اُن دونوں کے درمیان ہے۔ بظاہر وہ مالک تھا اور وہ ملازم تھی اور بظاہر میرے سامنے وہ دونوں انتہائی ضبط اور سلیقہ شعاری کا ثبوت دے رہے تھے لیکن میں نے دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ یہ رشتہ کس طرح کا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ جیٹھانی کے چہرے کی مالکانہ رعونت اور رعونت کے ساتھ ساتھ ایک تضحیک لیکن بالآخر شفقت کا احساس مخفی رعونت کے ساتھ کہ تم ہم تو ہو لیکن ہم جو ہیں سو تم سے ذرا بلند ہیں اور جو سلوک ہم تم سے کرتے ہیں اُس میں ہماری محبت کے علاوہ ہماری مہربانی کو بھی دخل ہے۔ محبت اس رشتے میں تو یوں ہی داخل ہوتی ہے۔ ایک اسٹینو کی طرح ہاتھ میں کنٹریکٹ کا کاغذ لیے ہوئے جس پر کئی شرطیں ٹائپ شدہ ہیں اگر تم یہ تو میں وہ اگر تم یوں تو میں وہ اور اگر یوں نہ ہو سکا تو وہ بھی نہ ہو گا اگر وہ ہو گیا تو یہ بھی ہو جائے گا ورنہ...... آخر میں یہ تصدیق کرتی ہوں کہ مجھے یہ شرائط منظور ہیں۔ (درشنا) ادھر دستخط جیٹھانی کے اور یہ محبت کا پرزہ ذہن کے صفحے پر لکھا ہوا ٹائپ کیا ہوا محبت نامے پر موجود رہتا ہے۔ غیر مشروط محبت کس نے کی ہے اور اگر کسی نے کی ہے تو نباہی نہیں، ناممکن۔ ناممکن۔ درشنا کی کھلی بے باک ہنسی غائب تھی اور نگاہیں بھی بجھی بجھی تھیں اور چہرے پر تلخی تھی جو چند بے صبر تجربوں کے بعد آتی ہے لیکن ابھی وہ ٹوٹی نہیں تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسے اعتماد کی جھلک تھی جسے چند ناکامیوں نے اور بھی گہرا کر دیا ہو۔ اُس کے جسم کی دل رُبائی سے کنوارپن کا الھڑپن غائب ہو گیا تھا۔ دیکھنے میں وہ اب بھی کنواری معلوم ہوتی تھی لیکن کسی قدر مردآشنا۔ جیٹھانی نے اُس خط پر دستخط کر کے مجھے پڑھنے کو دیا۔ میں نے پڑھ کر اُسے واپس کر دیا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

جیٹھانی نے وہی خط درشنا کو دے کر کہا۔ "اسے لفافے میں ڈال کر لفافے پر پتہ لکھ کر صاحب کو دے دو۔"

درشنا خط لے کر چلی گئی چند منٹ بعد واپس آئی اُس نے ٹائپ شدہ لفافہ میری طرف بڑھا دیا میں نے لے کر جیب میں ڈال لیا۔ گھر آکر خط دوبارہ پڑھنے کے لیے میں نے جب لفافہ کھولا تو اُس سفارشی خط کے ساتھ درشنا کا بھی ایک خط تھا جس پر جلی ٹائپ میں صرف اتنا لکھا تھا۔

"میں لندن ضرور جاؤں گی۔ — درشنا"

خط پڑھ کر میں مسکرا دیا۔ وہ لندن جائے یا نہ جائے اب مجھے اُس سے کیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ اُس کی روح کے اندر کہیں میری وہ طنزیہ ہنسی اور نگاہ پھنسی ہوئی ہے مچھلی کے کانٹے کی طرح اور درشنا بالکل بے بس ہے۔ وہ اس کانٹے سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ لندن جائے بنا اس کی مکتی نہیں ہو سکتی۔ مکتی حاصل کرنے کے بھی کئی طریقے ہیں۔ مردوں اور عورتوں نے گزشتہ ہزاروں برسوں میں زندہ رہنا تو سیکھا نہیں پوری

طرح ہاں مُکتی حاصل کرنے کے لیے کئی طریقے اپنائے ہیں۔ چند ڈوبی کر، چالیس دن کا چلّا کھینچ کر، پارلیمنٹ میں لگاتار پندرہ دن تک بول کر یا زندگی بھر نہ بول کر، کانٹوں پر سو کر یا ٹوئسٹ ناچ کر یا چھ ماہ ایک ٹب میں نہائے بغیر پڑے رہ کر۔ اس دنیا میں مُکتی حاصل کرنے کے اتنے ہی طریقے ہیں جتنے لوگ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، لوگ زندہ ہو کر زندگی بہتر بنانے کے بجائے زندگی سے مُکتی پانے کی کیوں سوچتے ہیں؟ جو مُکتی پا کر انھیں کیا مل جائے گا؟ جو نیکی بدی، عذاب و ثواب، سزا و جزا کی دل کش شخصیت سے اوپر اُٹھ کر مُکتی کے اس خلائی ماحول میں انھیں کیا مل جائے گا، جہاں کسی لذت کا وجود نہیں، کسی گناہ کا ثبوت نہیں، کسی نیکی کی لطافت نہیں، کسی سزا کی ہلاکت نہیں، جہاں کسی تخلیق کا درد نہیں، کسی چاہت کی مسرت نہیں، کسی کاوش کا جمال نہیں، کسی ناکامی کا ملال نہیں۔ نہ جانے آدمی، آدمی ہو کر پتھر بن جانے کی خواہش کیوں رکھتا ہے؟

لیکن ورشنا کی خواہش تو ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ وہ لندن جانا چاہتی ہے جیسے کوئی ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنا چاہتا ہے اور کوئی چاند پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اس میں کیا بُرائی ہے جناب! اور آپ شاید اس لیے جل بھن رہے ہیں کہ یہاں آپ کا واسطہ ایک ایسی لڑکی سے پڑا ہے جو اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے آپ کی محبت بھی ٹھکرا سکتی ہے اور آپ اس کا ٹھکرانا کبھی بھلا نہ سکے۔ اسی لیے تو کبھی طنزیہ قہقہے لگاتے ہیں، کبھی شرربار نگاہوں سے اُسے گھورتے ہیں، کبھی بالکل اجنبی ہو کر اُس سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایک خاموش جنگ ہے جو اُس کے اور آپ کے درمیان چل رہی ہے۔ اس کے بجائے کہ آپ اس کے عزم کی داد دیجیے، آپ اُس کے استوار وعدے سے ہراساں ہیں جو اُس نے اپنی شخصیت سے کیا ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی میں کچھ وعدے کرتا ہے، اپنے آپ سے اور پھر ساری زندگی اُن کی تکمیل میں رہتا ہے۔ ایک سیدھی لکیر کی طرح نہیں بلکہ زندگی کی طویل تر پُرپیچ ٹیڑھی میڑھی لکیر کی طرح جو مختلف نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی بظاہر بالکل بے معنی اور بے مقصد نظر آتے ہوئے بھی اپنے اندر کسی مخفی خواہش یا خواب کا اہتمام کرتی ہے۔ کسی بھی آدمی کو اُس کی ناکامی یا کامیابی سے نہیں پہچاننا چاہیے۔ عقل اور جذبات کی اس بحث میں تم کہاں ہو ورشنا؟

میں نے بہت دیر باتیں کرنے کے بعد اُس سے سوال کیا۔ "اب جب کہ تم اپنی زندگی کی منزل پا چکی ہو یعنی لندن پہنچ چکی ہو لیکن ایک طوائف بن کر۔ تم نے کبھی یہ تو سوچا ہوگا کہ تمھیں اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کتنی بڑی قیمت دینی پڑی ہے؟"

"میں نے کبھی قیمت کا اندازہ نہیں کیا تھا۔" ورشنا نے سوچ سوچ کر کہا۔ "کم از کم پہلے دنوں میں نہیں کیا تھا جب میں یہاں پہنچی تھی تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی چاند پر پہنچ جائے۔

نہیں سمجھ سکتا ہوں۔"

"حالانکہ لندن نے بہت کنویں جھنکوائے مجھ سے۔ جیٹھا بھائی کو تم ملے تھے، وہ تمھارا دوست تھا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ لندن لے جانے کا وعدہ کیا تھا لیکن راستے میں تہران ہی میں اُس نے مجھے اُتار دیا اور خود اکیلا لندن ہو آیا اور پھر واپسی میں اُس نے مجھے تہران سے لیا۔ پھر دو اور تاجروں نے مجھے اسٹینو رکھا اور لندن لے جانے کا وعدہ کیا کیونکہ میں تو لندن جانے کے لیے بے تاب تھی اور ہر ناکامی میری روح میں اپنی منزل تک پہنچنے کی ناقابلِ بیان تڑپ پیدا کر دیتی تھی۔ اُن دنوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ لندن پہنچنے کی کوئی بھی قیمت ہو کم ہے۔ میں پھر اُن تاجروں کی باتوں میں آ گئی لیکن وہ دونوں مجھے بمبئی سے آگے کہیں نہیں لے گئے۔ پھر میں ایک اسمگلر کے ہتھے چڑھ گئی۔ آنکھیں بند کر کے نہیں، جان بوجھ کر اور وہ مجھے لندن لے آیا لیکن لندن لانے سے پہلے اُس نے میرا خوب امتحان لیا۔ مجھے تین سال گجرات، کچھ اور راجستھان کے بارڈر پر اسمگلر کا کام کرنا پڑا اور بمبئی میں بھی۔ اگر میں تمھیں وہ سب واقعات سناؤں اور اگر وہ ثابت ہو جائیں تو مجھے اتنے عرصے جیل میں رہنا پڑے کہ میری زندگی اس کے لیے کم ثابت ہو لیکن میں نے بالکل پروا نہیں کی۔ میں لندن پہنچنے کے لیے اتنی بے تاب تھی کہ ہر بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔ اس کا بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔"

"پھر تم اس حالت تک کیسے پہنچیں؟"

"اُس اسمگلر کو یکایک لندن سے بھاگنا پڑا، پولیس اُس کے پیچھے تھی، وقت اتنا کم تھا کہ وہ مجھے اطلاع نہ کر سکا۔ اس میں اُس کا بھی کچھ قصور نہیں۔ ہوٹل کا بل ادا نہیں ہوا تھا اور میں لندن میں اُس کے سوا کسی کو جانتی بھی نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے ہوٹل میں ٹھیرا ہوا تھا۔ مجھے اُس نے گریٹ رسل میں رکھا تھا، اپنی شرافت جتانے کے لیے۔ اُس کے یکایک بھاگ جانے پر میں بہت پریشان ہو گئی۔ چند دن اسی انتظار میں گزرے کہ وہ مجھے اطلاع دینے کی کوشش کرے گا لیکن جب اخباروں میں خبر آ گئی کہ پولیس نے اُسے ہونولولو میں گرفتار کر لیا ہے تو ہوٹل والے میرے سر ہو گئے کہ بل ادا کرو۔ میں کہاں سے ادا کرتی؟ ہوٹل والوں نے مجھے پولیس میں دینے کی دھمکی دی۔ بھلا ہو میرا کمرہ دیکھنے والے ویٹر کا، اُس نے مجھے سمجھائی کہ میں اگر بُرے راستے پر لگ جاؤں یعنی ٹھیک راستے پر لگ جاؤں تو مستقل طور پر اس ہوٹل میں قیام کر سکتی ہوں اور میرے ہوٹل کا بل بھی ادا ہو جائے گا اور لندن میں میرے مستقل قیام کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اُس وقت میں کیا کرتی؟ ناچار میں نے منظور کر لیا اور گریٹ رسل میں گویا لندن کے دل میں ہوٹل کے مخصوص اور امیر ترین گاہکوں کی دل داری کے لیے رہنے لگی۔ اس زندگی کی طرف یہ میرا دوسرا قدم تھا۔ پہلا قدم تو میں

ہی بھاگی تھی۔ کریٹ رسل سے اس اڈوپاک گھپ خانے میں آنا کوئی خوبصورت تو نہیں ہے جس پر تم یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ... لندن آگئی اور میں نے اپنا وعدہ تم سے ... آنسو پونچھے گی۔

... میں نے اس سے پوچھا۔

... اگر میں نے شروع ہی میں تمہارا کہا مان کر ... تو اچھا ہوتا۔ کہیں اچھا ہوتا۔ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں اس کے لیے نرم رومانی رحم کا ... پھر شادی کی دعوت دینے ہی والا تھا کہ وہ یکایک ... قہقہہ لگاتے ہوئے بولی "لیکن اب کون کرے گا مجھ سے شادی؟" اس کا چہرہ پھیکا، تلخ، ایک زرد سی چٹان کی طرح بدنما نظر آنے لگا۔ زبان جھوٹ بول سکتی ہے، ہونٹ جھوٹ بول سکتے ہیں، آنکھیں جھوٹ بول سکتی ہیں لیکن پورا چہرہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ورشنا لندن آنے سے پہلے اور لندن آنے کے بعد جن منزلوں سے گزرتی رہی تھی وہ غبار راہ کی طرح اس کے چہرے پر بکھری پڑی تھیں۔ اب یہ کسی کی دلہن کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ ہو بھی سکتا ہے لیکن اس چہرے کی برسوں دھلائی کرنی پڑے گی۔ دھلائی، پونچھائی اور پالش۔ تب کہیں یہ چہرہ اس قابل ہو سکے گا کہ اس پر اس گھریلو سکون اور اطمینان کے آثار نمودار ہوں جس سے اکثر گھر والیوں کے چہرے عبارت ہوتے ہیں لیکن اتنا وقت کہاں ہے میرے پاس؟ زندگی بہت مختصر ہے اور ورشنا نے اپنی زندگی میں اتنا کوڑا کرکٹ بھر لیا ہے کہ اسے صاف کرتے کرتے میری پوری زندگی صرف ہو جائے گی۔ نہیں جناب! یہ رومانیت مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ کہانیوں میں بہت اچھی لگتی ہے اس طرح کی جذباتیت لیکن میں بیسویں صدی کا آدمی ہوں جس کے عہد نے اسے بتا دیا ہے کہ شاعروں کا چاند بھی ایک بنجر زمین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بہت جلد وہ لوگ چاند پر اتر جائیں گے۔ پھر اس پر ہوائی اڈے قائم کریں گے۔ چاند کے ہوائی اڈوں سے کسی ملک پر کتنی آسانی سے بمباری ہو سکتی ہے، کتنی آسانی سے راکٹ پھینکے جا سکتے ہیں اور میں لگا ہوں گا ورشنا کی غلیظ زندگی دھونے میں۔ لعنت۔ میں کوئی دھوبی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی نوجوانی میں سچے دل سے ورشنا کو ایک چانس دیا تھا اور اس دنیا میں کسی کو بس ایک ہی چانس ملتا ہے۔ اس نے وہ چانس ٹھکرا دیا اور اب وہ لندن میں ہے اور وہ لندن آنا چاہتی تھی تو اب وہ خوش کیوں نہیں ہے؟

جس ورشنا سے میں شادی کرنا چاہتا تھا یہ وہ ورشنا بھی نہیں ہے۔ خدا جانے یہ کون ہے؟ ہو لوگ چاند پر میزائل فٹ کر رہے ہیں۔ کس کے پاس

کنکریاں

نقش الرفیق کا تحفہ

وفاداری	ایک کا ساتھ دینا، دوسرے سے دھوکا کرنا۔
یاد	ان کی جن کی ضرورت پڑے۔
پیرس	سنگھار میز کا پاکٹ ایڈیشن۔
ایمان داری	پکڑے جانے کا خوف۔
دولہا	زندہ جنازہ۔
پڑوسن	جسے آپ کے ذاتی معاملات آپ سے زیادہ معلوم ہوں۔
تجربہ	ماضی کی غلطیاں۔
اخبار	اشتہار، اغوا، قتل، حادثہ اور تقریر۔
امن	دو جنگوں کے درمیان خوف کا زمانہ۔

گندی زندگیاں دھونے کے لیے وقت ہے؟ چلو اپنے پھٹے چیتھڑوں میں حشر کے میدان میں چلے چلو۔ سامنے آگے پیچھے ہر جگہ ممکن ہے اور اس زمین پر جتنے خدا ہیں سب قہر گر ہیں۔ پھر کون کس سے منصفی چاہے گا؟ آل رائٹ! اگر یہ سچ ہے کہ انسان اپنے خوابوں سے پہچانا جاتا ہے تو ورشنا بے قصور ہے۔ اگر اس نے لندن جانے کا خواب دیکھا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور اور کیا غلطی تھی؟ کوئی بھی پیرس، نیویارک، بمبئی، ریو ڈی جنیرو یا ٹوکیو جانے کا خواب دیکھ سکتا ہے۔ اس میں کون سی غلطی کی بات تھی؟ میں بتاتا ہوں تمہیں ورشنا! تمہارا خواب برا نہیں تھا لیکن آخر تھا کیا خواب میں؟ لندن آکر تم کیا کرنا چاہتی تھیں؟ لندن تم کیوں آنا چاہتی تھیں؟ کوئی ایک شہر دوسرے شہر سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ صرف سڑکوں اور پارکوں کے نام مختلف ہوتے ہیں۔ بولنے والوں کے لباس اور ان کی زبان مختلف ہوتی ہے مگر بھاؤ کرنے والوں اور خریدنے اور بکنے والوں کے ضمیر مختلف نہیں ہوتے۔ ہر آدمی کو اپنے خواب کا مستقل تانا بانا یاد رکھنا چاہیے ورنہ وہ کسی وقت بھی دھوکا کھا سکتا ہے کیونکہ جس عہد میں ہم رہتے ہیں اس کا ضمیر شکستہ ہو چکا ہے۔ وہ کسی ٹیکسی کے خراب میٹر کی طرح بے چلتا نہیں ہے، صحیح بھاؤ نہیں بتاتا ورنہ ورشنا کو لندن پہنچنے کے لیے اپنا سب کچھ نہ گنانا پڑتا۔

گڈ بائی ورشنا! میری محبوب! ایک دن تم سے ہندوستان میں ملاقات ہوگی کسی میلے ہوئے اسپتال کے گندے کمرے میں کسی اندھی گلی کی متعفن موری کے کنارے تم پڑی ہوگی۔ ہو سکتا ہے تم لندن ہی میں مر جاؤ اور کوئی تمہاری لاش کا دعوے دار تک نہ ملے کیونکہ کسی کو فرصت نہیں ہے۔ ہم چاند تک جا رہے ہیں۔



ممکن ہے ایسے کردار آپ کو بھی نظر آئے ہوں اور آپ نے ان کو قاسمی صاحب کی طرح نہ محسوس کیا ہو، ساری بات احساس کی ہے۔ قاسمی صاحب ایک حساس اور زندہ آدمی ہیں۔ ان کی یہ نازک اور زود حسی ہی ان کی تحریر کا کمال ہے۔

اردو کے سرمایہ افتخار ادیب احمد ندیم قاسمی کی تحریر

اس قدر چونکا دینے والا زرد رنگ میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا جائے تو تتلیوں کے پروں کی طرح سونے کے سے ذرے چمٹ کر انگلیوں میں چلے آئیں گے۔ اسے دیکھتے ہی بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اس کا چہرہ مس کرنا چاہیے، سہلانا چاہیے، نچوڑ لینا چاہیے۔ نہ جانے یہ اس کی انتہائی غیر قدرتی اور آسیبی زردی کا اثر تھا یا اس کی سرراہ لٹ کر جانے والی جوانی کا تقاضا لیکن مجھے صرف اتنا اعتراف کرنا ہے کہ اس کی رنگت کی زردی میں بجلی کی لہروں کا سا اثر تھا۔ کچھ ایسا اثر تھا جیسے میں اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہوں اور پھر ایک دم ذہن سنسنا دینے والا جھٹکا محسوس کرتا تھا اور میں دبی زبان سے صرف اتنا ہی کہہ پاتا تھا۔ "اور کیا لکھنا ہے؟"

وہ صرف مجھ سے خط لکھواتی تھی۔ میں ان دنوں بیمار اور

پھر بڑا ہو کر گاؤں چلا آیا تھا۔ وہاں ڈی ایچ لارنس اور آسکر وائلڈ کی کتابوں سے بھی واسطہ پڑا تھا اور جب ان کی گرگراتی ہوئی لذتیت میرے اعصاب میں جھنجھناتی تھی تو اقبال کے شکوے میری دست گیری کے لیے آ پہنچتے تھے۔ اقبال مجھے فلسفے کی شاہراہوں سے ماضی میں لے جاتا تھا اور مجھے عباسی خلفا کے درباروں میں گھسیٹ لے جاتا تھا اور پھر ایک دم وہیں بجتی تھیں اور ناچنے والیوں کا ایک انبوہ کہیں سے امڈ پڑتا تھا۔ پھر اچانک مجھے ان ناچنے والیوں میں آسکر وائلڈ کی سلومی دکھائی دے جاتی تھی اور عنبر و ریحان کی لہریں میرے حواس میں گھس کر رگوں میں لہرانے لگتی تھیں۔ تم مجھے بہر نہیں لینے دیتے تھے نا؟ نہیں لینے دیتے تھے؟" اور پھر میں سلومی پڑھنے لگا تھا۔

میں سلومی ہی پڑھ رہا تھا جب وہ دبے پاؤں میرے قریب آئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سلومی کتاب کے صفحوں سے نکل کر میرے سامنے آ گئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں اُسے گھورتا رہ گیا اور وہ بھی کہ میں اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں شاید اسی لیے وہ بولی "میں گلابو ہوں۔ گلابو دھوبن۔"

میں گلابو دھوبن کو جانتا تھا لیکن گلابو دھوبن کے چہرے کی زردی میرے لیے اجنبی تھی۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی لیکن عام چیزوں کے ہجوم میں بھی ایک نہ ایک چیز میں کوئی خصوصیت ایسی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم اُسے چن لیتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ چیز ان سب چیزوں سے اچھی ہے۔ کیوں اچھی ہے؟ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہوتا اور اسی لیے میرے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ جب گلابو ایک عام سی لڑکی تھی تو ایک زمانے میں وہ گاؤں کے سب نوجوانوں کی گفتگو کا موضوع کیوں بن گئی تھی؟ میں نے ایک بار اس کے ہونے والے منگیتر رمضو سے یہی سوال کیا تھا تو وہ دم بخود سا رہ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ مسکرا دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک آ گئی تھی جیسے اس کی پتلیوں کے ادھر اچانک چراغ جل اٹھے ہیں اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا: "جس دن مجھے یہ پتہ چل گیا، اس دن میرے لیے گلابو مر جائے گی۔ مزا تو اسی میں ہے کہ کچھ خبر نہ ہو اور لٹ جاؤ۔"

اور اب یہی گلابو سرسوں کے پھولوں کا سا زرد چہرہ لیے میرے سامنے کھڑی تھی اور مجھ سے اپنا تعارف کرا رہی تھی اور باہر صحن سے اماں کی آواز آ رہی تھی۔ "اسے جلدی سے خط لکھ دو بیٹا، بے چاری بڑی ستم رسیدہ ہے۔ میں تو جب بھی اسے دیکھتی ہوں کلیجا دھک سے رہ جاتا ہے۔ لکھ دو بیٹا جلدی سے۔"

"خط لکھوانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں، درخواست لکھوانی ہے، کمانڈنگ افسر کے نام۔ پنشن کا جھگڑا ہے۔" وہ پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گئی اور پھر بغل کے اندر سے ایک تڑا مڑا کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس چٹھی کا جواب لکھنا ہے۔"

چٹھی پڑھ کر مجھے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ رمضو مر چکا ہے۔ وہ ۴۲ء میں بھرتی ہو کر کلکتے گیا تھا اور پھر برما میں پسپا ہوتے وقت مارا گیا۔ بعد میں مجھے اس کے ایک ساتھی نے بتایا کہ جب برما کے جنگلوں سے گزرتے ہوئے ایک دم گنجان جھنڈوں میں سے اُن پر گولیوں کی بوچھار ہونے لگی تو وہ سب دھب سے زمین پر لیٹ گئے اور جب وہ درختوں کے تنوں کی آڑ لینے کے لیے رینگ رینگ کر بڑھنے لگے تو رمضو اُن کے ساتھ نہیں تھا وہ اسی طرح منہ کے بل زمین سے چمٹا رہ گیا اور جب اس کے ساتھی نے رمضو کے پاس جا کر اُسے پکارا اور اس کا سر اٹھایا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی اور لہو کے چند قطرے اُس کی ناک سے پھوٹ کر اس کی مونچھوں کی جڑوں میں جمع ہو رہے تھے۔ "پھر؟" میں نے رمضو کے ساتھی سے پوچھا اور اُس نے مجھے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میرا سوال قطعی احمقانہ ہے۔

"پھر کیا؟ پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔"

ٹھیک ہے، میرا سوال واقعی احمقانہ تھا۔ اس کے بعد سب وہاں سے چلے آتے ہیں۔ سرکاری رجسٹروں میں دو لفظوں کا اندراج ہوتا ہے۔ پنشن کے جھگڑے چلتے ہیں۔ مرحوم سپاہی کی قیمت چکائی جاتی ہے۔ اس کے والدین اور اس کی بیوی بچوں کے درمیان دس یا پندرہ یا بیس روپیوں کی ننھی سی دیوار ایک فصیل بن کر ابھر آتی ہے اور ان فصیلوں کے رخنوں سے کوئی پیار سے نہیں جھانکتا۔ یہاں سے ایک دوسرے کی طرف صرف گالیاں منتقل کی جاتی ہیں اور ماں باپ کے ہاتھوں میں رعشہ آ جاتا ہے اور بیواؤں کے چہروں پر سرسوں پھولتی ہے۔

میں نے زرد زرد گلابو کی طرف دیکھا۔ میں افسوس کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا جب اس نے بغل سے ایک اور صاف ستھرا کاغذ نکالا اور بولی: "درخواست کے لیے یہ میں ایک کاغذ بھی لیتی آئی ہوں۔ انگریزی میں اتنا لکھ دیجیے کہ حضور، یہ میں مانتی ہوں کہ رمضان کی پنشن پر اس کے باپ کا حق ہے اس لیے کہ وہ بوڑھا ہے، پر اس کی بیوی کا بھی تو حق ہے اس لیے کہ وہ جوان ہے اور اس کے تین بچے ہیں اور غلہ مہنگا ہے اور کپڑا ملتا ہی نہیں اور جب عورت کے پاس نہ شوہر باقی رہے نہ روپیہ تو...... تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ آپ ذرا کوئی اچھی سی بات بنا کر ڈھنگ سے لکھیں گے۔ میری تو بکواس کی عادت ہو گئی ہے۔"

بات بنی بنائی تھی۔ میں نے گلابو کی پنجابی انگریزی میں منتقل کر دی۔ وہ درخواست لے کر چلی گئی اور پھر سلومی نے کتاب کے صفحوں میں سے اُٹھ کر

کہا: "اچھا تو تم مجھے بوسہ نہیں دو گے؟ نہیں دو گے؟"

اُسی روز شام سے پہلے میں کھیتوں میں ٹہلنے نکل گیا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور شام سے پہلے ڈھلتی دھوپ اور لمبے لمبے سایوں کے اتصال سے ایک بڑی لطیف سی خنکی ہوا میں رچ جاتی تھی۔ اعصابی بیماری کے باوجود مجھ پر اس لذیذ خنکی کا یہ اثر ہوتا تھا کہ کبھی میں گنگناتا ہوا دور نکل جاتا، کبھی کسی ٹیلے پر چڑھ کر چھاتی پھلا لیتا، لمبی لمبی سانسیں لیتا اور مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے رقص سے کچھ دیر پہلے رقاص کو محسوس ہوتی ہوگی لیکن اس شام مجھے نہ گنگنانے کا خیال آیا نہ لطیف خنکی پھیپھڑوں میں جمع کرنے کا۔ میں کچھ سوچتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ "کچھ" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ بعد میں جب میں ان سوچوں سے چونکا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک رو میں نہیں سوچ رہا تھا۔ ابتدا گلابو کے چہرے سے ہوئی تھی، پھر مجھے لاہور میں بسنت کا تہوار یاد آ گیا تھا۔ جب میرے ایک ہندو دوست نے مجھے انڈوں کی زردی کا حلوہ کھلایا تھا۔ اس کے بعد جانے مجھے چین کیوں یاد آ گیا۔ بہر حال میں نے چین کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچا تھا۔ قدیم چینی شہنشاہ اور پھر قبلائی خاں کے دربار کی شان و شوکت اور اس کے مردہ جسم پر سجے ہوئے شاہی گھوڑوں کا ناچ۔ قبلائی خاں کی زرد سی ہوئی لاش نے مجھے اپنا ایک دوست یاد دلایا جس نے ہڑتال اور سنکھیا پھانک کر خودکشی کر لی تھی اور اس کی محبوبہ جو تنور میں روٹیاں پکا کر گزر کرتی تھی "وہ تیرے ہی روز ایک تنور والے کے ہاتھ اپنی مرضی سے ایک سو روپے میں بک گئی تھی اور اس نے کہا تھا "بیکلے نے خواہ مخواہ مجھ بے چاری کو بدنام کر دیا ورنہ میری ایسی صورت والے تو ایک ہزار میں بھی سستے ہیں۔" روپوں کی جھنکار سے مجھے رمضو کی پنشن یاد آ گئی اور پھر گلابو اور پھر جب میں چونکا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ دور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں پر اونگھ رہی تھی۔ سرسوں کے پھولوں کی صاف ستھری صحت مند زردی میں چمک سی آ گئی تھی اور آسمان کے وسط میں اڑتی ہوئی ایک پتلی سی بدلی ڈوبتے ہوئے سورج نے بسنتی دوپٹے میں بدل دی تھی۔

اور یوں جب میں اپنی بے ربط اور غیر مسلسل سوچوں کا جائزہ لے رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اور میرے ذہن میں زرد رنگ تیر رہا تھا تو اتفاق سے وہاں پگڈنڈی پر حافظ سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ گلابو کا بوڑھا خسر تھا۔ اندھا تھا اس لیے لوگ اسے حافظ کہنے لگے تھے۔ آنکھوں کا کام لاٹھی سے لیتا تھا۔ اس کی لاٹھی سانپ کے پھن کی طرح اٹھتی تھی اور پھر جھک کر پگڈنڈی کا صاف ستھرا سینہ ٹٹول لیتی تھی اور حافظ ایک دم دو قدم آگے بڑھا لیتا۔ میں سیدھا پگڈنڈی پر آ رہا تھا اس لیے اب کے حافظ کی لاٹھی کا پھن اٹھا تو جھکا نہیں بلکہ مجھے سونگھ کر خبردار ہو گیا اور حافظ رک گیا۔ "کون ہے بھائی؟" اس نے پوچھا اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو ایک دم اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "مجھ سے تمہیں کیا دشمنی تھی بیٹا؟ میں تو تمہارے سارے خاندان کا پرانا خادم ہوں۔ میں تو برسوں تمہارے بزرگوں کی رکاب تھام کر کوسوں پیدل چلا ہوں اور اپنے مقسوم پر ناز کیا ہے اور اب بیٹا! تم میرے رمضو کی پنشن اس حرام زادی کے نام لگوانا چاہتے ہو جس نے تین بچے جنے ہیں تو دس نکلوائے ہیں اور جس نے مسجد کا تیل چرا کر اپنے یاروں کے لیے پکوڑے تلے ہیں اور جس روز میرے رمضو کی موت کا تار آیا ہے تو اسی روز اس نے کاجل لگایا ہے اور بین کرتے ہوئے سارے گاؤں کو بتایا ہے: 'میں سہاگن ہوں۔ میں سدا سہاگن ہوں'۔" بوڑھے حافظ نے یہ الفاظ عورتوں کی طرح بین کرنے کے انداز میں کہے اور پھر اس کے چہرے میں تناؤ سا پیدا ہو گیا: "نہیں بیٹا! تم اس کے لیے چٹھیاں نہ لکھا کرو۔ یہ پندرہ روپے رمضو کے ماں باپ کے لیے بنتے ہیں۔ رمضو کی گھر والی تو خود بڑی کماؤ ہے۔"

میں نے بوڑھے سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا لیکن اس کے بعد روزانہ بار بار میرا جی چاہا کہ حافظ اور گلابو کے ہاں جا کر سب کو جمع کروں اور رمضو کی پنشن کے سلسلے میں ان کی آپس میں صلح کرا دوں۔ یوں ہی خواہ مخواہ اپنائیت کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ جیسے پندرہ روپے کے پیچھے یہ کشمکش خود میرے گھر میں ہو رہی ہے۔ اور ایک دن جب میں نے امی سے بھی اس کا ذکر کر دیا تو وہ باغ باغ ہو گئیں: "جاؤ بیٹا! ابھی جاؤ۔ دس دن دنیا، ستر دن آخرت۔ جو ایک بھلا کرے گا اس کا سدا بھلا ہوگا۔ ان سے کہو آدھی آدھی پنشن بانٹ لیا کریں۔"

میرے سامنے اچانک رمضو کی لاش ابھری۔ ٹھک سے ایک تلوار گری اور رمضو دو ٹکڑے ہو کے رہ گیا اور پھر جیسے ایک حصہ اس کے ماں باپ گھسیٹے لیے جا رہے تھے تو دوسرے حصے سے اس کے بیوی اور بچے چمٹتے چلے گئے تھے اور اب میرے سامنے جمے ہوئے خون کے ایک نالے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے فوراً وہ تصور جھٹک دیا۔ اعصابی بیماریوں پر قابو پانے کے لیے میں کوئی تصور، کوئی خیال، کوئی سوچ سختی سے جھٹک ڈالنے کا عادی ہو رہا تھا مگر اس کے بعد ایک دم جیسے میں چکرا کر رہ گیا۔ میرے سامنے گلابو کھڑی تھی۔

گلابو سے کچھ کہے بغیر یکایک امی نے بڑے غصے اور رقت سے بولنا شروع کر دیا: "حافظ بکواس کرتا ہے۔ اس کی ساری عمر بکواس کرتے گزری ہے۔ اس نے کچہری میں جا کر قرآن شریف کی قسمیں کھائی ہیں اور جھوٹی گواہیاں دی ہیں اور اب وہ گلابو کے خلاف بکتا ہے؟ بکنے دو۔ چاند کا تھوکا منہ پر آتا ہے۔ تم افسر کو ایک اور چٹھی لکھ دو۔ پورا زور لگا دو اپنے قلم

[illegible] دشمن کا رول ادا کر رہا ہے تو یہ گلابو ہے۔ اس کی بیوی
[illegible]

[illegible] جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی نے [illegible] کی بجائے اس سے بددل ہو کر منہ لٹکا [illegible] "تو میرے آنے سے پہلے اس گھر میں میرا ہی [illegible]

[illegible] اس کے آنے سے پہلے اُس کا ذکر [illegible] ڈالی۔ امی نے تو خیر حسب عادت [illegible] شروع کر دیا۔ اس کی بے بسی اور بے کسی پر وہ قربان [illegible] اس کی ساری تفصیلات گن گن کر انھیں رد کرتی رہیں [illegible] میں چلا آیا اور ابھی ٹھیک سے بیٹھنے بھی [illegible] میں آئی۔ پلنگ کے پائے سے لگ کے [illegible] ایک لفافہ نکال کر بولی "یہ جواب آیا ہے پڑھ دیجیے"۔

[illegible] خود رضو نے اپنی زندگی ہی میں تنخواہ اور پنشن [illegible] اور سو برس پورے ہونے بھی اُسی کے نام کی سفارش [illegible] اس کے باپ ہی کے نام جائے گی۔ گلابو اگر چاہے [illegible] "تم چاہو تو اپیل کر سکتی ہو" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔

"اپیل بھی کروں گی۔ میرا کیا لگتا ہے" گلابو نے بڑے اطمینان سے [illegible] مسکرا کر کہنے لگی "میرے آنے سے پہلے آپ میرا ہی ذکر کر [illegible]

"ہاں!" میں نے تعجب سے کہا اور سوچا کہ کیا اس کا ذکر اس کی اپیل [illegible] رکھتا ہے" "حافظ تمھارے خلاف بہت بک رہا تھا"

میرے یہ الفاظ اس کی مسکراہٹ بجھانے کے لیے کافی تھے مگر وہاں تو جیسے جلتی پر تیل پڑ گیا۔ مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی اور وہ بولی۔ "پندرہ روپے بڑھے کے دماغ میں اس زور سے بجے ہیں کہ میں تو کہتی ہوں اگر اب اسے جیتا جاگتا رضو مل جائے تو پنشن بند ہو جانے کے ڈر سے وہ اسے اپنے ہاتھوں مار ڈالے گا۔ رہ گئے میرے بچے سو بچے تو گلیوں میں رلتے رلتے بھی پل جاتے ہیں اور میرے بچوں کے سر پر تو ایک چھت بھی ہے۔" اس نے اپنی مسکراہٹ سمیٹ لی اور پھر ایک صاف ستھرا لفافہ نکال کر بولی "اپیل لکھ ڈالیے اور آخر میں لکھیے کہ خدا آپ کا بھی بھلا کرے اور میرا بھی۔ ملک پنجاب میں لوگ بھوک سے ذرا کم ہی مرتے ہیں اور میں مر جاؤں گی پر اپنے بچوں کو بھوکوں نہیں مرنے دوں گی۔ آپ نے پنشن بڈھے کے نام لگا کر اپنے سپاہی کے بچوں کو مارنا چاہا پر میں بھی انھیں مرنے دوں، اور میں انھیں نہیں مرنے دوں گی" رک کر اس نے [illegible] صاف کیا پھر ذرا بدلی ہوئی آواز میں بولی "جی چاہتا ہے، ایک موٹی سی گالی بھی لکھوا دوں" اور پھر مسکرا کر کہنے لگی "انگریزی میں بھی گالیاں ہوتی ہیں جی؟"

میں بھی مسکرا دیا اور پلنگ کے پائے کا سہارا چھوڑ کر اس نے اپنا ایک بازو پلنگ پر پھیلا دیا اور اس پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر مسکرانے چلی گئی۔ ایک معقول اپیل لکھ کر میں نے اس کے حوالے کی۔ اس نے کاغذ تہہ کر کے اُسے بغل میں رکھا اور پھر اسی طرح بازو پر ٹھوڑی رکھ کر بولی "سارا گاؤں کہتا ہے، آپ کے قلم میں بڑی طاقت ہے۔ سوچتی ہوں اگر آج رضو زندہ ہوتا تو آپ سے ایک خط اس کے نام لکھواتی" میں اداس ہو گیا اور وہ مسکراتی رہی۔ پھر ایک دم جیسے اُسے کچھ یاد آیا، وہ بڑبڑا کر اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک بیٹھا لارنس کی ایک کہانی پڑھتا رہا مگر جب چند صفحے پڑھ لینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس دوران میں پڑھا کچھ بھی نہیں بلکہ سوچا ہے اور وہ بھی گلابو کے بارے میں تو میں سلومی کا ڈراما پڑھنے لگا اور جب سلومی اپنے سوتیلے باپ اور سگی ماں کے سامنے ناچنے لگی تو مطالعہ ختم ہو گیا اور ناچ شروع ہو گیا اور جب میرے اعصاب تن کر تقریباً بج اٹھے تو امی اندر آئیں، بولیں "پڑھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "امی! سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے پاس ہر مہینے پندرہ روپے ہوتے تو میں انھیں حافظ کے سامنے بجا کر گلابو کو دے آتا۔ بڑا غصہ آ رہا ہے۔"

"پندرہ روپے ہوتے تو میں اپنے بچے کا لحاف نہ بنوا لیتی؟" وہ کھیل سے چکر آتے ہوئے بولیں "ایسی باتیں نہیں سوچتے بیٹا! تمھارے پاس علم کی دولت ہے وہ جتنی چاہے بانٹو۔ روپے بانٹنے کی نہ سوچا کرو۔ کبھی بتاؤ آج کتنے دنوں سے میں نے تمھاری چائے کے ساتھ پراٹھا نہیں پکا لیا ہو؟"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری شدید اعصابی بیماری پھر سے عود کر آئی ہے۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ یہ بیماری ذہنی ہوتی ہے۔ آج وہ ڈاکٹر میرے سامنے ہوتا تو میں اس سے کہتا "لاؤ میری دونوں جیبیں روپیوں سے ٹھونس دو، پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ یہ بیماری ذہنی ہے یا اقتصادی؟" میں فوراً اٹھ کر باہر کھیتوں میں چلا گیا اور کچھ سوچتے ہوئے بہت دور نکل گیا۔

"کچھ نہیں ابہام ہے اور میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن جب سوچوں میں کوئی تسلسل نہ ہو تو اور کہا ہی کیا جائے؟" اتنا یاد ہے کہ میں روپے کے بارے میں اور پھر جنوبی افریقہ میں سونے کی کانوں کے متعلق اور اس کے بعد شاید ڈوبتے چاند کے بارے میں اور پھر سرسوں کے پھولوں کے متعلق سوچتا رہا۔ اس روز اختلاج قلب بھی بڑھ گیا اور خون کا دباؤ اتنا شدید ہو گیا کہ معلوم ہوتا تھا کنپٹیوں میں سیسہ بھر دیا گیا ہے۔ پھر جب میں واپس آیا تو یہ واپسی بھی میری سوچوں ہی کا ایک حصہ تھی اور گلابو کے گھر میں داخل ہوا تو یہ بھی محض ایک سوچ ہی تھی۔ بعض سوچیں

اس نوعیت کی بھی تو ہوتی ہیں کہ سوچ میں جسم بھی ذہن کا ساتھ دیتا ہے۔ جسم بھی سوچتا ہے اور جب جسم سوچتا ہے تو اس سوچ میں حرکت ہوتی ہے۔ یہ سوچ کا عمل ہوتا ہے اور یہی سوچ مجھے گلابو کے گھر میں لے آئی لیکن جب انگنی کے غیر مانوس ماحول اور بچوں کی چیخ پکار نے میرے ذہن اور جسم کو اس کیفیت سے چونکایا تو ٹھٹک کر رہ جانے کے بجائے میں تیورا کر پیچھے ہٹا۔ جیسے کسی نے میری ٹھوڑی کے نیچے زناٹے کا مکا مارا ہے اور میں بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ میں نے محاورہ استعمال نہیں کیا۔ میں وہاں سے سچ مچ بھاگ آیا مگر بھاگ کر گھر نہیں گیا، کھیتوں میں نکل گیا۔ اس وقت سرسوں کے پھول اندھیرے میں ڈوب چکے تھے البتہ ادھر ادھر چند جگنو یوں اڑتے پھر رہے تھے جیسے سرسوں کے پھولوں کو پر لگ گئے ہیں۔

گھر واپس آکر میں نے اکٹھی چار خواب آور گولیاں کھائیں اور رات بھر سلومی کے ہاتھوں پر سجے ہوئے سنہرے طشت میں سلومی کے محبوب کا کٹا ہوا سر دیکھتا رہا جس کے نیم وا مردہ ہونٹوں پر بار بار سلومی کے جذبات اور وحشت سے ابھرے ہوئے ہونٹ پیوست ہو جاتے تھے اور سلومی کہتی تھی "اچھا تو تم مجھے بوسہ نہیں لینے دیتے تھے نا؟ نہیں لینے دیتے تھے؟"

شاید میں نیند میں سلومی کے الفاظ بھی بڑبڑاتا رہا اس لیے کہ جب دوسرے دن کافی دن چڑھے امی نے مجھے جگایا تو ان کی چتون پر کچھ ایسے ہی بل تھے جیسے اس روز ابھرے تھے جب میرا اوولٹین ملا دودھ پی جانے پر میں نے بلی کو ماں کی گالی دے دی تھی۔ نیم خوابی کی حالت میں چائے پی کر میں پھر سو گیا اور دن ڈھلے اٹھا۔ میرا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا اور امی جو باہر صحن میں بیٹھی تھیں، بولیں "نہ خدا کا نام، نہ رسول کا۔ بس پڑا پلنگ توڑ رہا ہے۔ شام کو سویا ہے تو اب دوسری شام ہونے کو آئی ہے کہ آنکھ کھل سکی ہے۔ یہ تم بیمار ہو کہ کوئی نشہ پیتے ہو؟" وہ اسی طرح بولے چلی گئیں اور میں حالات سنبھالنے کے لیے لپک کر ان کے پاس پہنچا، ان سے لپٹ گیا، ان کے ہاتھ چومے، ان کے پاؤں دابے اور بڑی لجاجت سے کہا۔

"نہیں امی! سچ پھر ایسا نہیں ہوگا۔ رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے نیند لانے والی گولیاں کھا لیں۔ یہ سب انھی کا کیا دھرا ہے اب تک آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں۔"

"اور یہ تم رات بھر کیا بکتے رہے؟" امی کی چتون کے بل اور گہرے ہو گئے۔

"خواب دیکھتا رہا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "وہ میں ایک کتاب پڑھ رہا ہوں، اس میں ایک شہزادی ہے جو......"

"بس بس، مجھے بخشو۔" وہ بولیں "سوتے میں تھوڑے بکے ہو کہ اب پوری کہانی سنانے چلے ہو مجھے؟ اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ اولاد کو علم پڑھاؤ، اور جو پڑھاؤ تو سوتے جاگتے شہزادیاں دکھی جارہی ہیں اور ان سے ......ان سے بچو اس کی جا رہی ہے۔"

بڑی مشکل سے امی کو منا کر میں یہ تہیہ کر کے اٹھا کہ آسکر وائلڈ کی کتاب تلف کر دوں گا۔ ادب و فن اعصابی امراض میں اضافے کا موجب ہوتے ہیں اور خاص طور سے آسکر وائلڈ تو سراسر اعصاب ہے۔ میں اٹھا ہی تھا کہ حویلی کے دروازے سے گلابو داخل ہوئی اور اچانک میں نے سوچا کہ اس کتابی سلومی کو تلف کروں یا اس جیتی جاگتی سلومی کا گلا گھونٹ دوں جو میرے پاس چار منٹ بیٹھتی ہے تو مجھے چار خواب آور گولیوں کا محتاج کر جاتی ہے۔

امی کے پاس بیٹھ کر اس نے چادر کا پلو کھولا اور مسکرا کر بولی "ابھی ابھی شیرا یہ ننھے ننھے بیر لایا ہے۔ میں نے کہا موسم کا پہلا پھل ہے شاید یہ پسند کریں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

میں گھبرا کر بیر دیکھنے لگا۔ خون کے آنسو میں نے کبھی دیکھے نہیں اس لیے بیروں کو ان سے تشبیہ نہیں دوں گا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گلابو کے دامن میں ننھے ننھے بیر نہیں بلکہ وہ اپنے ہی خون کے آنسو جمع کر لائی ہے لیکن وہ تو مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بڑی صاف ستھری چمک تھی۔ خدا نہ کرے ایسی آنکھیں کبھی روئیں اور وہ بھی خون کے آنسو۔ ایسی آنکھیں تو صرف چمکنے کے لائق ہیں لیکن یہ چمک آتی کہاں سے ہے؟ خون میں بھی تو چمک ہوتی ہے۔ میں نے حسب عادت سر جھٹکا اور یہ خیالات شبنم کی طرح جھاڑ دیے۔ مٹھی بھر اٹھا کر میں بولا۔ "بڑے خوب صورت بیر ہیں۔"

"میٹھے بھی ہیں۔" اس نے کہا۔

"اتنے پیارے بیر میٹھے نہیں تو کیا کھٹے ہوں گے۔" امی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، حسن کا ذائقہ بڑا لطیف ہوتا ہے۔" میں نے فلسفہ بگھارا لیکن افسوس ہے کہ نہ اسے امی سمجھیں نہ گلابو۔

امی نے پوچھا "کیا کہا؟"

گھبرا کر میں نے اپنی تھیوری کی تشریح کی "خوب صورتی کا بھی ذائقہ ہوتا ہے۔ ہم خوب صورت چیز آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ذائقہ زبان پر محسوس ہوتا ہے۔"

"اے ہے اس میں تو کیڑا ہے۔" امی نے بڑی نفرت سے ایک بیر دور پھینک دیا۔

گلابو کی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ اس کا رنگ ایک دم خوف ناک حد تک زرد پڑ گیا اور وہ گنہگاروں کے سے انکسار سے بولی "میں تو سمجھی تھی کہ اس موسم میں کیڑے ہوتے ہی نہیں۔"

"کیڑوں کا بھی کوئی موسم ہوتا ہے۔" امی نے بیر گلابو ہی کے دامن سے ڈھانک دیے تھے اور پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "پھینک دے

انھیں اُٹھ تو پہلے ہی بیمار ہے۔"

میں دو گونہ صدمے سے دوچار تھا۔ ایک تو حسن کے ذائقے کی تھیوری غلط ہو گئی تھی، دوسرے گلابو اداس ہو گئی تھی اور گلابو کی اداسی تھیوری کی شکست سے زیادہ اہم تھی اس لیے میں نے کہا "کھاؤں گا نہیں امی! انھیں اپنے پاس رکھوں گا۔ بڑے خوب صورت ہیں۔ موتی ہیں بالکل۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

پھر جب گلابو میرے پاس آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میری اس بات نے اُسے کافی سنبھالا دیا ہے، چہرے کی زردی سے آسیب کا عنصر غائب ہو چکا ہے۔ وہ آکر چپ چاپ میرے پاس کھڑی ہو گئی اور چینی کی وہ پلیٹ دیکھنے لگی جس میں ننھے ننھے تازہ بیر چمک رہے تھے۔

"ایک دن کی بہار ہے۔" وہ بولی "کل تک مرجھا جائیں گے۔"

نہ جانے مجھے یوں کیوں محسوس ہوا جیسے گلابو کو میرے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ کیسی باتیں؟ یہی بہار کی اور مرجھا جانے کی۔ کیوں نہیں کرنی چاہئیں؟ بس نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ شوق سے آئے، خط پڑھوائے، خط لکھوائے اور اپنی راہ لے۔ یہ آگ مانگنے آنا اور گھر کی مالکن بن بیٹھنا تو خلاف تہذیب بھی ہے اور بھونڈا بھی۔ "کوئی خط پڑھوانا ہے؟" میں نے اسی جذبے کے تحت یہ سوال کیا۔

اُس کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا اور اُس وقت اُس نے مجھے یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کہ اگر میں فوراً نظریں نیچی نہ کر لیتا تو میری پتلیاں پھٹ جاتیں۔ میں یوں ہی نیچے دیکھ رہا تھا جب وہ پلٹی اور چلی گئی اور جب وہ چلی گئی تو مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ فوراً اس کے تعاقب میں بھاگوں اور اُس سے معافی مانگ لوں اور کہوں کہ ہاں یہ بیر تو مرجھا جائیں گے مگر مرجھا کر بھی یہ خوب صورت رہیں گے۔ حسن تابوت میں بند ہو کر بھی حسن ہی رہتا ہے وغیرہ وغیرہ مگر باہر امی کا پہرا بیٹھا تھا اور اوپر آسمان پر سورج منہ پھاڑے کھڑا تھا اور گلیاں جل رہی تھیں۔ میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔

میں کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر جب باہر آیا تو امی نے پوچھا "کیا کہتی تھی گلابو؟" بڑا بے ڈھب سوال تھا۔ جب سوال کے جواب میں کوئی جھوٹ گھڑنا پڑے تو سوال کو بے ڈھب نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ میں نے فوراً تو نہیں البتہ تھوڑا سا سر کھجا کر ایک آدھ بار کھانس کر ایک بھونڈا سا جھوٹ گھڑ ہی لیا "کہتی تھی کل ایک اپیل کمانڈنگ آفیسر کے نام لکھی ہے۔ آج ایک اور کمانڈر انچیف کے نام لکھ دو۔"

"لکھ دیتے۔" انھوں نے کہا۔

"موڈ ٹھیک نہیں تھا۔" میں نے ٹالنا چاہا۔

"کیا ٹھیک نہیں تھا؟" انھوں نے پوچھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" میں نے تشریح کی۔

اور امی کو غصہ آگیا۔ "اور کھاؤ نیند کی گولیاں۔" اور اس کے بعد انھوں نے طعن و تشنیع کا ایک سلسلہ جاری کر دیا اور میں وہاں سے چلا آیا۔ نہ جانے آج امی کو کیا ہو گیا تھا کہ بات بے بات ایک تقریر کر ڈالتی تھیں۔

حسب معمول کھیتوں میں ٹہلنے کے بعد دیا جلے میں گاؤں میں داخل ہوا تو گلیاں سنسان تھیں۔ میں گلابو کے گھر کی طرف سے ہو کر گزرا تو میں نے جھانکا۔ اندر کوٹھے میں مٹی کے تیل پر ٹین کا دیا جل رہا تھا اور گلابو اپنے بچوں کے ساتھ زمین پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ کوٹھے سے دروازے تک پہنچنے میں مجھے کافی مسافت طے کرنی پڑی، یہی ذہنی مسافت۔ بڑی عجیب سی بات تھی نا۔ میں گلابو دھوبن سے شام کے سناٹے میں معافی مانگنے آیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ معافی کیسے مانگوں گا اور کیا وہ مجھے معاف کرے گی اور اگر وہ معاف نہ کرے گی تو میرا کیا بگڑے گا۔ یہی نا کہ وہ مجھ سے چٹھیاں نہیں لکھوائے گی، نہ لکھوائے اور پھر یکا یک مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میرا جسم کسی بوڑھے درخت کا کھوکھلا تنا بن کر رہ گیا ہے، خلا۔ خلا اور اسی کیفیت میں پلٹنے کے بجائے آگے بڑھتا گیا اور اسی لیے مجھے کافی مسافت طے کرنی پڑی۔ "آپ؟" وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ بچوں کے ہاتھ اور منہ بھی جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ سب سے چھوٹے بچے کا نوالہ منہ کے قریب آکر رک گیا تھا۔ پتلی دال کے قطرے اُس کی انگلیوں سے ہوتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔

اگرچہ میں بول نہ سکا مگر شاید میرا سارا وجود مجسم عذر خواہی بن گیا تھا۔ گلابو نے فوراً پلنگ پر کھیس بچھایا اور بولی "اندر آجائیے نا۔ آئیے، میرے دل پر آپ کی بات سے ذرا سا بھی میل آیا ہو تو مرتے دم مجھے کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو۔ آئیے۔"

میں اندر گیا اور پھر جب باہر آیا تو اتنا معلوم ہے کہ اس وقت تک میرے وجود کا سارا خلا پُر ہو چکا تھا۔ گلابو نے مجھے معاف کر دیا تھا اور وہ حیران تھی کہ میری آمد کی خوشی میں کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ وہ ہانپنے لگی تھی۔ اُسے ایک جگہ چین سے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مجھے مسلسل دعائیں دیے جا رہی تھی اور مسلسل مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اس نے رضو کی پنشن کا ایک بار بھی ذکر نہیں کیا۔ بوڑھے حافظ کی زیادتی کا قصہ ایک بار بھی نہیں چھیڑا۔ بچوں تک کی پروا نہ کی اور جب میں وہاں سے اٹھا تو بولی "برا نہ مانیے گا۔ ایک بات کہنی ہے۔ ان بیروں میں کیڑے ویڑے نہیں ہیں۔ یہ جو آپ کی امی نے ایک بیر میں کیڑا دیکھا تھا نا، تو یہ کیڑا بیری میں نہیں تھا، مجھ میں تھا اور آج کل مجھ سے کیڑے نکالنے کی رسم گاؤں میں عام ہو رہی ہے۔ آپ برا نہ مانیے گا۔"

گلابو کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن جس اپنائیت سے اُس نے یہ بات کی تھی، وہ کچھ ایسی مبہم نہیں تھی۔ دروازے سے نکل کر جب میں باہر گلی میں آیا تو اچانک میرے تھنے سے ایک گھڑی بجی۔

[illegible] اُس نے اندھیرے میں کہا اور [illegible] وہ دیر تک خاموش رہا جیسے میرا جواب [illegible] چند لمحوں بعد وہ کچھ بولے بغیر اٹھی [illegible] موڑ پر جا رک گیا اور جیسے اُسے [illegible] جگہ کھڑا ہوں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں [illegible] کوئی بات نہیں۔ وقت وقت اور زمانے زمانے [illegible]

"بےوقوف!" میں نے جی ہی جی میں کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

[illegible] میں چائے پینے کے لیے اٹھا تو امی نے پوچھا: "کل [illegible] گئے تھے؟"

"کہاں؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"وہاں نہ جایا کرو۔" انھوں نے ذرا تلخی سے کہا۔ "بیواؤں کے [illegible] نہیں جایا کرتے۔"

"پر آخر کیوں امی؟" میں جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"لوگ باتیں بناتے ہیں۔"

"کیسی باتیں؟"

"بکواس۔"

یوں تو بات آگے نہ چل سکی مگر میرے خیالوں میں چلتی رہی اور [illegible] بعد میں نے امی سے جا کر پوچھا: "آپ کو کس نے بتایا تھا؟"

"گلابو کی ساس نے۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں۔"

بہت دنوں تک گلابو میرے پاس نہ آئی اور نہ میں اُس کے [illegible] گیا۔ البتہ اس کے بارے میں ادھر اُدھر سے باتیں سنتا رہا اور کڑھتا [illegible] کہ آخر وہ کون سی بیوہ ہے جس پر الزام نہیں تھوپے گئے۔ حوالدار [illegible] بیگ کی بیوہ کے متعلق تو یہ تک کہہ دیا گیا تھا کہ رات کو اپنے صحن میں [illegible] لیٹ جاتی ہے اور یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کرتی کہ کون آیا اور کون گیا اور پھر گلابو تو مقصود دھوبی کی بیوی تھی اور پھر وہ غریب تھی اور اس کے تین بچے تھے۔

میں نے ایک دن امی سے ان افواہوں کا ذکر کیا تو وہ بولیں: "الزام کس کس پر نہیں دھرے گئے بیٹا۔ حضرت مریم کو، حضرت عائشہ کو، ہندوؤں کے رام کی بیوی سیتا کو لو۔ بکواس بھی کبھی رکی ہے بیٹا؟ آدمی بکواس نہ کرے تو آدمی کیسے کہلائے؟ نیا نیا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دینے والا اذان نہیں پڑھتا، وہ روپے کو یاد کرتا ہے جو اذان کے بدلے میں اسے ملے گا۔ اب بتاؤ، اس بچے کو اللہ اور رسول کے نام کی برکت ملے گی کہ روپے کا لالچ اور اس لالچ کے پیچھے بکواس کرنے کی عادت؟"

"میرے کان میں کس نے اذان دی تھی امی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا مگر امی کو ایک دم ہنسی چھوٹ گئی اور مجھے ہلکے سے ایک چپت مار کر بولیں: "بکواس نہیں کرتے۔"

ایک روز منشی جی نے قصبے سے آیا ہوا ڈاک کا تھیلا کھولا تو میں بھی وہیں موجود تھا۔ اس میں گلابو کے نام ایک سرکاری چٹھی بھی تھی۔ باقی ڈاک دیکھے بغیر میں سیدھا گھر آگیا اور اس یقین کے ساتھ کہ گلابو یہ خط پڑھوانے ضرور آئے گی۔ میں دن بھر بیٹھا سلومی پڑھتا رہا۔ آج کل یہ ڈراما صرف وقت ٹالنے کے کام آتا تھا۔ اس لیے اسے میں نے کئی مرتبہ پڑھ ڈالا تھا اور آج ایک بار پھر پڑھ رہا تھا۔ اب نہ چاند کی زردی مجھے متاثر کرتی تھی، نہ سلومی کا حسن، نہ اس کے محبوب کی بے نیازی اور نہ مردہ ہونٹوں سے زندہ چپکتے ہوئے ابھرے ابھرے ہونٹوں کا لمس۔ میرے تمام حواس سماعت میں بدل گئے تھے۔ آنکھوں تک سے سننے کا کام لے رہا تھا۔ قدموں کی ذرا سی چاپ مجھے چونکا دیتی تھی مگر شام ہو گئی اور پھر رات آگئی مگر گلابو نہ آئی۔

گلابو دوسرے دن بھی نہ آئی۔ وہ تیسرے دن بھی نہ آئی۔ چوتھے دن جب امی مجھے یوں بیکار گھر میں پڑے رہنے پر جھڑک رہی تھیں تو گلابو کا بڑا لڑکا شیرا آیا اور میرے پاس آکر بولا: "ماں کہتی ہے، میری ایک بات سن جائیے گا۔"

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"شام کو۔" وہ بولا۔ "ابھی تو وہ پانی بھرنے جا رہی تھی۔"

"پانی بھرنے جا سکتی ہے اور یہاں آتے ہوئے اُس کے پاؤں گھستے ہیں۔" امی نے ڈپٹ کر کہا۔ "جا کے کہہ دو کہ نہیں آئے گا میرا بیٹا۔ کام ہے تو خود آ جائے۔" لڑکا ایک کل کی طرح مڑ گیا۔

مجھے امی پر بڑا غصہ آیا اور یہ غصہ ابھی بڑھ ہی رہا تھا کہ شیرا دوبارہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے امی تھیں۔ وہ بولا: "ماں کہتی ہے میں تو جاؤں، پر آپ کی بدنامی کا ڈر ہے۔"

امی نے میری طرف گھبرا کر دیکھا اور بچہ چپ چاپ جواب کے انتظار میں کھڑا رہا۔ "آؤں گا۔" میں نے کہا اور وہ کل کی طرح گھوم گیا۔

امی بھی چپ چاپ پلٹ گئیں۔ ایک لمحے بعد وہ آئیں تو آنسو پونچھ رہی تھیں: "یہ لوگ بیچاری بیوہ عورتوں کو جینے تک نہیں دیتے۔ دے الزام پر الزام اور بدنامی پہ بدنامی اور وہ لڑکی دھوبن ہو کر بھی اتنی شریف ہے کہ کہتی ہے، میں آؤں گی تو آپ بدنام ہو جائیں گے۔ پیسے پیسے کو بھی ترسو اور محنت کی لعنتیں بھی ڈھوتے پھرو اور یہ بھی کوئی جینا ہے۔"

امی کی آنکھوں میں اچانک بہت سے آنسو آگئے۔ انھیں پونچھ کر وہ بولیں: "شام کو چلے جانا پر بیٹا! چھپ کے جانا۔ بدنامی کا ڈر ہے۔"

شام سے پہلے میں کھیتوں میں چلا گیا اور دیا جلے واپس آیا تو سیدھا گلابو کے آنگن میں جا نکلا۔ وہ میرے انتظار میں تھی۔ اندر کوٹھے میں ٹین کے

بکس پر بیری کا لیمپ جل رہا تھا اور بچے وقت سے پہلے سو گئے تھے۔

میں نے یہ کہانی گلابو کے زرد رنگ سے شروع کی تھی مگر آج اتنے دنوں بعد میں نے گلابو کو دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ کیا گلابو کا رنگ واقعی کبھی زرد بھی تھا۔ اس وقت تو گلابو کے چہرے کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا چھو لو تو جیسے مساموں سے لہو کی دھاریں پھوٹ نکلیں گی۔ سچی بات کیوں نہ کہہ دوں۔ چند لمحوں کے لیے تو میں اُسے دیکھتا رہ گیا اور جب اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اُسے گھور رہا ہوں تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی مسلسل مجھے گھورے جا رہی ہے۔ لیکن نہیں، وہ مجھے گھور نہیں رہی تھی، صرف دیکھ رہی تھی اور اس دیکھنے میں کتنی بہت سی کیفیتیں تھیں۔ آج نہ تو وہ مجھے دعائیں دے رہی تھی اور نہ بے چین تھی۔ بڑے سکون سے مجھے اس طرح دیکھے جا رہی تھی جیسے کوئی آسمانی صحیفہ پڑھ رہی ہے۔ میں اس تسلسل سے کچھ گھبرا سا گیا اور بے چین ہو کر بولا۔ "چٹھی پڑھنی ہے؟"

وہ یک وقت ہنس دی اور رو دی۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے اور اس نے پہلی بار میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر کہا۔ "چٹھی جائے بھاڑ میں، مجھے پڑھیے۔"

میں کھسیانا سا ہو کر مسکرایا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بچے نئے صاف ستھرے لحافوں میں سو رہے تھے۔ سب سے چھوٹے لڑکے کا ایک ہاتھ کھاٹ کی پٹی سے لٹک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں مٹھائی تھی اور گلابو کا رنگ گلابی تھا۔

"میں جیسے جھٹک کر کسی دوسری دنیا میں چلا آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا؟"

جیسے آپ باغ میں سیر کرتے جا رہے ہوں اور اچانک ایک پتھر تڑ سے آپ کی کنپٹی پر پڑے اور آپ درد سے زیادہ خوف کے مارے دم بخود رہ جائیں بالکل اسی طرح گلابو نے تڑ سے یہ جملہ میرے دماغ پہ دے مارا۔ "مجھے آپ سے پیار ہے۔" میں دم بخود رہ گیا۔ "یہ سرخ رنگ..... یہ سرخ رنگ!" اُس نے اپنے گال اپنے ہی ہاتھوں سے رگڑ لیے۔ "یہ سرخ رنگ۔" اب اُس کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے اور چہرے کے جو حصے ہاتھوں نے ملے تھے، اُن میں سرسوں پھول رہی تھی۔ "آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ آپ کو تو مجھ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔"

میں خاموش رہا۔ گلابو کی چوٹ کا خوف تو دور ہو چکا تھا مگر اب شدید درد اور کرب نے میرے حواس بکھیر دیے۔ اسی لیے میں کچھ نہ بول سکا اور وہ جیسے مجھے یقین دلانے کے لیے دوبارہ بالکل رو کر بولی۔

"مجھے آپ سے پیار ہے۔"

"پھر؟" میں نے بالکل ڈاکٹروں کے سے انداز میں کہا۔

"پھر؟" وہ یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے منجدھار میں گھر گئی ہے۔ "پھر؟" اُس نے یہ لفظ سرگوشی میں دہرایا۔

اور پھر ایک لمحے کی خاموشی میں اچانک میرے ذہن میں اس مسئلے کا حل ابھرا۔ خواہ مخواہ میرے ذہن پر سلومی کا کتابی کردار چپاں ہو کر رہ گیا تھا۔ اُسے جھٹک کر میں نے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "دیکھو گلابو! میں تمھارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ انسان واقعی ایسے حالات میں مجبور ہو جاتا ہے۔" وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور آنسو پونچھ ڈالے۔ میں نے کہا۔ "تمھیں مجھ سے پیار ہے، اس لیے کہ تم بیوہ ہو اور تمھارے تین بچے ہیں اور تمھارے مرحوم شوہر کی پنشن میں سے تمھیں ایک کوڑی تک نہیں ملتی لیکن گلابو میرے پاس بھی تو کچھ نہیں ہے۔ میں تمھارے اس پیار کا کیا بدلہ دوں؟ میں بھی تو غریب ہوں۔"

گلابو کی آنکھوں میں جو آنسو آ چکے تھے وہ تو خیر آ ہی چکے تھے اور وہ بھی پلکوں کی جڑوں میں پھیل گئے تھے لیکن اس کے بعد اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہ چھوٹا۔ اس کے ہونٹ بُری طرح کانپنے لگے اور ہونٹوں کے ساتھ ٹھوڑی بھی اور پھر اس کے سارے جسم میں رعشہ سرایت کر گیا اور گالوں پر ہلدی کے سے پیلے پیلے داغ اُبھر آئے۔ اُس کی انگلیاں مرگی کے مریضوں کی طرح اینٹھ گئیں اور اس کے منہ سے آواز کچھ اس طرح نکلی جیسے وہ بہت گہرے کنوئیں کی تہہ میں پڑی بول رہی ہے۔ "میں غریب نہیں ہوں۔ غریب ہوں آپ کے اور میرے اور میرے بچوں کے دشمن۔ میں کیوں غریب رہوں؟ میں نے کون سا گناہ کیا تھا کہ مجھے بھوکوں مرنے کی سزا دی گئی؟ پر میں یہ سزا نہیں بھگتوں گی، میں نہیں مروں گی، نہ اپنے بچوں کو مرنے دوں گی۔ میں نے روپے کا انتظام کر لیا ہے جب تک یہ سرخ رنگ میری زردی چھپا سکتا ہے میری پنشن بندھ گئی ہے۔ ہفتے میں ایک دو، ایک دو چھوکرے ضرور پھانس لیتی ہوں اور ہر چھوکرے سے دو روپے بھی لوں تو مہینے میں پندرہ بیس، پندرہ بیس روپے تو ملتے ہی رہیں گے۔ کیا آپ نے ہمارے نئے لحاف نہیں دیکھے؟ آپ نے میری لالٹین نہیں دیکھی؟ آپ نے میری یہ سوسی کی قمیص اور تہمد بھی نہیں دیکھا؟ آپ نے تو صرف یہ پڑھا ہے کہ مجھے پیسہ چاہیے۔" اس کی آواز میں حکم سا آ گیا۔ "نہیں، پیسہ دینے والے اور بہت ہیں۔ مجھے آپ سے پیار ہے۔ آپ سے مجھے پیسہ نہیں چاہیے، بوسہ چاہیے۔ آپ مجھے بوسہ دیں گے؟"

میں جھجک کر پیچھے ہٹا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے سے نکل جانے کی ٹھانی لیکن وہ مجھ پر یوں جھپٹی جیسے باز شکار پر جھپٹتا ہے۔ "تو کیا آپ مجھے پیار کے بدلے میں پیار نہیں دیں گے؟ نہیں دیں گے؟ نہیں دیں گے؟"

اور میں سوچتا ہوں کہ کیا سلومی کے محبوب نے اپنے مُردہ ہونٹوں پر سلومی کے تر و تازہ، جذبات کی شدت سے ابھرے ابھرے ہونٹوں کے مس کی چکرا دینے والی تلخی میری طرح محسوس کی تھی؟ لیکن یہ بالکل دوسری کہانی ہے۔

نوادر کے شوقین ایک نکتہ دان پروفیسر کا جنون انگیز واقعہ

اُس کا نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ یہ اُس کے [illegible] تھا۔ مقتول ہنری کی کھوپڑی سے اُبلنے والا خون اُس کے لیے [illegible] تھا اس لیے وہ دامن نہ بچا سکا اور اُس کا لباس خون آلود ہو گیا۔ لاش [illegible] کے بعد وہ سوچنے لگا کہ لباس سے خون کے دھبے کس طرح [illegible] جا سکتے ہیں؟ ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ عجائب خانے کا چوکیدار [illegible] داخل ہوا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اب پروفیسر [illegible] اپنے جرم سے انکار کرنا فضول تھا۔

اس معاملے کی تفتیش لیفٹیننٹ فرنر کے سپرد ہوئی۔ لیفٹیننٹ ایک [illegible] اور تجربہ کار افسر تھا۔ وہ پروفیسر وان کے سامنے ایک میز کے پیچھے [illegible] تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے دھیمی آواز اور پُرسکون لہجے [illegible] وان سے پوچھا: ”پروفیسر! کیا آپ ہنری کو قتل کرنے کا اعتراف کرتے ہیں؟“ کمرے میں ایک سٹینو گرافر بھی موجود تھا۔ وہ سوال و جواب کا ایک ریکارڈ نوٹ کر رہا تھا۔

پروفیسر نے کہا: ”جی ہاں میں..... مقتول کا کیا نام بتایا آپ نے؟ ہنری؟ اگر اُس کا یہی نام تھا تو بے شک میں اُسے قتل کرنے کا اعتراف کرتا ہوں۔“

”کیا آپ کو اُس کا نام معلوم نہیں تھا؟“ لیفٹیننٹ نے طنز و تحیر سے دریافت کیا۔

”جی نہیں۔“ پروفیسر نے جواب دیا: ”میں اُس کی شکل تک سے ناآشنا تھا۔ آج اُسے میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں اُسے قطعی نہیں جانتا۔“

لیفٹیننٹ چند لمحوں تک خاموشی سے پروفیسر کو دیکھتا رہا، پھر اُس نے آہستہ سے کہا: ”مقتول کا نام ہنری تھا اور وہ یونیورسٹی میں قدیم آثار کے شعبے کا طالب علم تھا۔ قدیم آثار میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے وہ صرف چند ماہ قبل جارجیا سے یہاں آیا تھا۔ اب کچھ یاد آیا آپ کو؟“

”میں نے کہا نا کہ میں مقتول سے قطعی ناواقف تھا۔ اُس کا نام تک مجھے

آزراہِ کرم آخری حصہ پڑھنے سے
پہلے چند لمحے غور ضرور کیجیے
کہ پروفیسر کو یہ انتہائی
قدم اٹھانے کی ضرورت کیوں پڑی؟
شوق کا اصل شرط ہے!

ایڈورڈ ڈی ہاک ٭ ش م رحیل



آپ سے معلوم ہوا ہے۔"

لیفٹیننٹ نے میز پر پڑی ہوئی پنسل انگلیوں میں دبائی اور اُس سے کھیلنے لگا۔ "اس طرح کام نہیں چلے گا پروفیسر صاحب! آپ نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ اب جرم کا محرک بھی بتا دیجیے۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیا آپ دونوں کے درمیان کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی تھی؟ یا دست درازی کی نوبت آ گئی تھی؟"

"جی نہیں، ہمارے درمیان سرے سے کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی۔"

"دیکھیے جناب، قتل کوئی معمولی جرم نہیں ہوتا اور اس کے کچھ نہ کچھ محرکات ضرور ہوتے ہیں۔ نفرت، خوف، انتقام، حسد، نفع، عورت؟"

"جی نہیں، ان میں سے کوئی محرک نہیں تھا۔"

"تو کیا مقتول کوئی مجہول الحواس شخص تھا؟ کیا اس کی کوئی حرکت آپ کو ناگوار گزری تھی؟"

"اس نے میرے سامنے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو مجھے ناگوار گزرتی۔ میں اپنی بات پھر دُہراتا ہوں کہ میں اُس سے قطعاً ناواقف تھا۔ میری اُس سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور میں نے آج پہلی بار آپ سے اُس کا نام سنا ہے۔"

لیفٹیننٹ نے ایک گہری سانس لے کر پنسل میز پر رکھ دی۔ "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بس مقتول کمرے میں داخل ہوا اور آپ نے اُسے قتل کر دیا؟"

"جی ہاں، صحیح صورت حال یہی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"معاف کیجیے گا۔ اس صورت میں کیا آپ کو فاتر العقل سمجھا جائے؟"

"جی نہیں، میں فاتر العقل نہیں ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے اُسے خواہ مخواہ قتل نہیں کیا ہے۔" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"گویا ایک قطعی اجنبی شخص کو قتل کرنے کی کوئی وجہ آپ کے پاس موجود تھی اور وہ وجہ آپ بتانا نہیں چاہتے؟ شاید آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح اس بہیمانہ جرم کی سزا سے بچ جائیں گے؟"

"ہاں میرا خیال تو یہی ہے حالانکہ جب میں نے اُسے قتل کیا تھا تو اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ میرا مقصود صرف اُسے قتل کرنے تک محدود تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے یہ جرم ایک پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہے؟"

"جی ہاں، آپ قانونی نقطۂ نظر سے یہ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ میں نے قتل کرنے سے پہلے چند منٹ اس اقدام کے متعلق غور کیا تھا۔ پھر اسے عملی جامہ پہنا دیا اور اب چونکہ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے اس لیے میرے مقصد کے حصول میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے حالات جس نہج پر جا رہے ہیں وہ نہج میرے حق میں زیادہ بہتر ہے۔"

"کس طرح؟" لیفٹیننٹ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں آپ کو شروع سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ اس طرح آپ کو میرے جرم کا محرک سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ میرا پورا نام پیٹرک بوون ہے۔ میں گزشتہ بیس سال سے یونی ورسٹی میں ملازمت کر رہا ہوں۔ مشرق اوسطٰی کی تہذیب کے پروفیسر کی حیثیت سے میرا تقرر چند سال قبل ہوا ہے۔ میرے بنیادی فرائض میں یہ امر بھی شامل ہے کہ میں یونی ورسٹی کے عجائب خانے کے ایک حصے کا مکمل انتظام اپنے ہاتھ میں رکھوں۔ اُس کمرے میں مصر کے قدیم نوادر محفوظ ہیں۔ اُسے مصری کمرہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہی کمرہ ہے جہاں میں نے ہنری نامی طالب علم کو قتل کیا تھا۔ مصری کمرے کا برٹش میوزیم کے مصری شعبے سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ برٹش میوزیم کے درجنوں کشادہ کمروں میں مصر کے متعلق نوادر بھرے ہوتے ہیں۔ ہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارا ذخیرہ مختصر ہے۔ لیکن اُس کے نوادر خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر تانبے کی وہ بلی بہت اہم ہے جو بارہ انچ اونچی ہے اور جس کی آنکھوں میں بڑے بڑے صاف شفاف زمرد لگے ہوئے ہیں۔ وہ بلی نائل کیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم مصر کے باشندے اُسے مسرتوں کی دیوی سمجھتے تھے اور اس کی عبادت کرتے تھے۔ اُسے قدیم آثار کے ماہروں کی ایک جماعت نے ۱۹۲۰ء میں دریائے نیل کے قریب کھدائی کرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ مصری نوادر میں اُسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ خوب صورت بلی ورنے نامی ایک شخص کی ملکیت تھی۔ ورنے کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بلی ہمیں مستعار دی تھی۔ بلی کی قیمت کا تخمینہ ڈھائی لاکھ ڈالر ہے اور اتنی ہی رقم میں اس کا بیمہ کرایا گیا۔

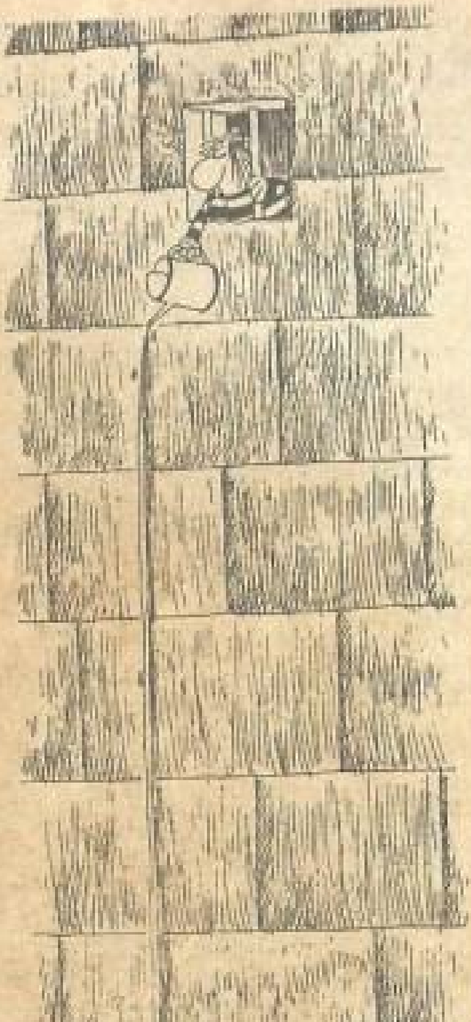
میں نے بیس سال قبل ورنے سے یہ بلی یونی ورسٹی کے لیے مستعار لی تھی اور یونی ورسٹی کے عجائب خانے میں مصری شعبہ قائم کیا تھا۔ ورنے سے ہمارا یہ معاہدہ ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی اپنی بلی واپس نہیں لے گا۔ اُس کی حفاظت، نگہداشت اور بیمے کے ذمے دار ہم ہوں گے۔ بلی بدستور اُس کی ملکیت رہے گی اور اُس کی موت پر دوسری جائداد کے ساتھ اُس کے وارثوں کی ملکیت بن جائے گی۔ اگر اُس کے وارث اُس کی خواہش کے احترام میں بلی عجائب خانے ہی میں رہنے دیں گے تو اُس کی روح کو تسکین پہنچے گی لیکن اگر اُس کے وارث وہ بلی فروخت کرنے کے لیے یونی ورسٹی سے واپس لینا چاہیں گے تو ہمیں بلی واپس کرنی پڑے گی۔ ورنے کا انتقال ابھی چند ماہ قبل ہوا ہے۔ اُس کی عمر اکیاسی سال تھی، اس لیے مجھے اُس کی موت پر افسوس ضرور ہوا لیکن تعجب نہیں ہوا۔

دو ہفتے پہلے اُس کی شادی شدہ بیٹی مسز کلارک مجھ سے ملنے آئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے والد کی واحد وارث ہے اور بلی واپس لینا چاہتی ہے تاکہ اپنے شوہر کی خواہش کے مطابق اُسے فروخت کر دے۔ مجھے اُس کی بات سن کے بہت تعجب ہوا۔ میں نے سوچا کہ یہ بلی بھلا کون خریدے گا۔ ہمارے ملک میں قدیم نوادر سے بہت کم لوگوں کو دلچسپی ہے اور وہ بہت کم لوگ بھی اس کی صحیح قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ خیال اُس پر ظاہر

[illegible] بلکہ فرانسیسی حکومت
[illegible] فرانس میں ایک نیا عجائب
[illegible] ہو رہا ہے۔ بلی کا مجسمہ اسی نے
[illegible] مسٹر کلارک نے کہا کہ میں نے یہ پیشکش
[illegible] میں یہ مجسمہ حکومت فرانس کے
[illegible] وقت پر مجسمہ نہ ملا تو وہ اس کی جگہ ایک
[illegible] آج کل اپنے قومی عجائب خانے کی زینت
[illegible] درخواست کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی
[illegible] کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی اور یا اس کا
[illegible] مجسمہ اس کے حوالے کرنے کے لیے ضروری کارروائی
[illegible] کے چلی گئی اور میرے خیالات میں زبردست انتشار
[illegible]

[illegible] آپ کے لیے میرے خیالات جاننا ضروری ہے۔
[illegible] عجائب خانے میں مصری شعبہ قائم کیا تھا۔ نمبر دو میں
[illegible] میں نے ہی اس کے لیے ورثے سے
[illegible] میں نے ہی وقتاً فوقتاً مصری کمرے کے
[illegible] اس طرح سجایا کہ بلی کو پورے ذخیرے میں
[illegible] مقام حاصل ہے۔ آپ کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے
[illegible] میری زندگی ہے اور میرا مشغلہ ہے اور میری راحت
[illegible] شادی ضرور کی تھی مگر میری بیوی کا انتقال بہت پہلے
[illegible] میری کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ بیوی کی موت کے بعد میرا تمام
[illegible] عجائب خانے کے کاموں میں صرف ہوتا رہا۔ مجھے عجائب خانے
[illegible] سے محبت ہے۔ میں نے تمام نوادر کی مکمل تاریخ جمع کی ہے
[illegible] نوادر کی صفائی خود کرتا ہوں۔ ہر چیز کی نگہداشت بھی خود کرتا ہوں۔
[illegible] یونی ورسٹی نے ملازمین رکھے ہوئے ہیں لیکن میں انھیں
[illegible] نہیں دیتا۔ میری جاں نشانی کی وجہ سے مصری شعبے کو اب
[illegible] میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور مصری کمرہ یونی ورسٹی کے
[illegible] باعث بن چکا ہے۔ اس صورت میں آپ ہی بتائیے، یہ
[illegible] کتنا روح فرسا ہوگا کہ میں بہت جلد اپنی عزیز ترین
[illegible] محروم کر دیا جاؤں گا۔

چنانچہ میں نے عہد کیا کہ آسانی سے شکست تسلیم نہیں کروں گا اور
[illegible] بلی کا مجسمہ اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔
[illegible] کے مطابق ورثے کے وارث اس وقت تک ہم سے مجسمہ واپس
[illegible] سکتے جب تک وہ اسے فروخت نہ کر دیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا
[illegible] حکومت کی پیشکش بے حد عمدہ ہے اور قسمت ایسا سنہرا
[illegible] زندگی میں صرف ایک بار فراہم کرتی ہے۔ نائل کیٹ میرے لیے اہم



ہو سکتی ہے یا فرانس کے نئے عجائب خانے کے لیے اہم ہو سکتی ہے لیکن کوئی دوسرا شخص شاید ہی اس کی اتنی بھاری قیمت ادا کرے۔ عموماً دوسرے عجائب خانے بھی اتنے قیمتی نوادر نہیں خریدتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس اس شعبے کے کچھ نوادر موجود ہوں۔ میرے سامنے دو صورتیں تھیں کہ یہ فروخت کسی طرح کالعدم کرا دوں یا کوئی ایسی ترکیب کروں کہ مجسمہ آئندہ ماہ تک حکومتِ فرانس کو نہ مل سکے تاکہ وہ اس کی جگہ کوئی دوسری شے خرید لے۔ اس طرح یہ سودا خود بخود ختم ہو جائے گا۔

فرانسیسی عجائب خانے کا ایک نمائندہ نیویارک میں موجود ہے۔ میں نے ایک ہفتے قبل اس سے تفصیلی گفتگو کی تھی۔ اسے سمجھایا تھا اس کی خوشامد کی تھی کہ وہ یہ سودا ختم کروا دے لیکن وہ میری بات ماننے پر آمادہ

نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس ناکامی پر میں نے پہلی بار مجسمے کے اصل مالک کی بیٹی مسز کلارک کو قتل کرنے کے متعلق سوچا۔ ایسے ہولناک جرم کا خیال پہلی بار میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر مجھے مسز کلارک کو قتل کر کے بھی مجسمہ بچانا پڑا تو میں اس جرم کا ارتکاب کرنے سے دریغ نہیں کروں گا لیکن ایسا کرنا میرے لیے ناممکن ہو گیا کیوں کہ مسز کلارک مجھ سے ملاقات کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ یورپ کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس کے علاوہ میرا یہ اقدام بھی مجسمہ نہیں بچا سکتا تھا کیوں کہ مسز کلارک کے مرنے کی صورت میں اُس کا شوہر یا اُس کے بچے اس کے وارث بن جاتے اور انھیں مجسمہ فروخت کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا۔ ڈھائی لاکھ ڈالر کی رقم کم نہیں ہوتی۔

پھر ایک اور منصوبہ میرے ذہن میں آیا مگر وہ پہلے والے منصوبے سے زیادہ ناقص تھا۔ اس پر عمل ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بلی کا مجسمہ میں خود خرید لوں اور بینک سے ڈھائی لاکھ ڈالر قرض لے کے اس کی قیمت ادا کر دوں لیکن میری سالانہ تنخواہ بارہ ہزار ڈالر ہے۔ میں نے بینک منیجر سے اس سلسلے میں گفتگو کی تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ میری پوری تنخواہ گروی رکھ کے بھی کوئی بینک مجھے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ میری ملازمت کی مدت ختم ہونے میں صرف چھ سال باقی رہ گئے ہیں۔ بینک منیجر نے مجھ سے سوال کیا کہ میں آخر چھ سال کی قلیل مدت میں اتنا بڑا قرض کیسے ادا کروں گا۔ جب کہ اس کا سود بھی اصل رقم میں شامل ہوتا ہے گا۔ اس نے پوچھا کہ کیا میری آمدنی کے کچھ دوسرے ذرائع بھی ہیں؟ میرا جواب نفی میں تھا۔

میرے سامنے کھلے ہوئے تمام دروازے ایک ایک کر کے بند ہو گئے تھے۔ میں گزشتہ رات مصری کمرے میں گیا اور کئی گھنٹوں تک نائل کیٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ میں اسے چوری کر کے کہیں چھپا دوں تاکہ مقررہ میعاد گزرنے تک فرانسیسی حکومت کو مجسمہ نہ مل سکے۔ اس طرح سودا خود بخود ختم ہو جائے گا لیکن اس اقدام میں یہ قباحت تھی کہ میں مجسمہ دوبارہ منظر عام پر نہیں لا سکتا تھا اور نہ اُسے اپنے عجائب خانے کی زینت بنا سکتا تھا۔ عجائب خانہ مجسمے کا صحیح مقام تھا اور مجسمہ وہاں رکھنا ہی میرا بنیادی مقصد تھا۔ چوری کرنے سے میرا مقصد فوت ہو جاتا۔ اس منصوبے میں دو خرابیاں اور تھیں۔ مجسمہ چوری ہوتے ہی مسز کلارک سمجھ جاتی کہ یہ صرف میری حرکت ہے۔ وہ پولیس کو فوراً میرے پیچھے لگا دیتی۔ پولیس میرے مکان کی تلاشی لیتی۔ میں آخر اتنا قیمتی مجسمہ اپنے گھر کے سوا کہاں چھپا سکتا تھا۔ ظاہر ہے تلاش کرنے پر وہ برآمد کر لیا جاتا۔ میں اُسے تباہ بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ اپنے ہاتھوں سے اسے کوئی گزند پہنچا سکتا تھا۔ یہ درست ہے کہ بیمہ کمپنی مسز کلارک کو رقم ادا کر دیتی لیکن میں خواہ مخواہ پریشانیوں میں گھر جاتا اور میرا مقصد بھی پورا نہ ہوتا۔

پھر آج مسز کلارک نے مجھے فون کیا۔ اُس نے مجھے اطلاع دی کہ اُس کا ایک نمائندہ مکمل شناختی کاغذات اور نمائندگی کی قانونی دستاویزات لے کر کل صبح میرے پاس پہنچے گا اور مجسمہ اپنی تحویل میں لے لے گا۔ گویا آج کی رات میری آخری رات تھی۔ آج کی رات عجائب خانے میں مجسمے کی آخری رات تھی۔ میں نے فون پر مسز کلارک سے دوبارہ درخواست کی کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے۔ میں نے اُسے سمجھایا، اُس کی خوشامد کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ نائل کیٹ بچانے کے لیے میری تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔

میں سارا دن اپنے دفتر میں بند ہو کے بلی کا مجسمہ بچانے کی ترکیبیں سوچتا رہا مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔ میں شام کے وقت دفتر سے اُٹھ کے مصری کمرے میں چلا گیا اور نہایت حسرت سے بلی کا مجسمہ دیکھتا رہا۔ اُس کی رفاقت صرف چند گھنٹوں کی مہمان تھی۔ پھر اچانک میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک منصوبہ کوندا۔ میں نے نظر اٹھا کے ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ چند منٹ بعد نوجوان ہنری کمرے میں داخل ہوا اور وہ حنوط شدہ لاشیں دیکھنے لگا جو دیواروں کے ساتھ نصب ہیں۔ میں نے تالا کھول کے شوکیس سے بلی کا مجسمہ باہر نکالا اور دبے قدموں ہنری کے پیچھے گیا۔ پھر موقع پا کر میں نے مجسمہ پوری قوت سے اُس کے سر پر مار دیا۔ وہ تانبے کا ایک بھاری بھرکم مجسمہ تھا۔ ہنری کی کھوپڑی اُس سے شکست کھا گئی۔

"اب آپ سمجھے میں نے یہ جرم کیوں کیا؟" پروفیسر ورٹن نے لیفٹیننٹ سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔" لیفٹیننٹ ششدر رہا۔

پروفیسر مسکرایا۔ "شاید آپ نے غور نہیں کیا لیفٹیننٹ! اگر غور کریں تو یہ نکتہ آسانی سے آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔" وہ چند لمحوں تک لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "ذرا غور کیجیے۔ آلۂ قتل بلی کا وہی مجسمہ ہے۔ اس لیے اس واردات میں اُسے مرکزی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ مجسمہ شہادت کے طور پر عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے پولیس کی تفتیش میں ہفتوں لگیں گے۔ پھر مقدمے کی کارروائی میں مہینوں گزر جائیں گے۔ پھر مقدمے کا فیصلہ میرے خلاف ہو گا کیوں کہ میں نے جرم کا اعتراف کر لیا ہے لیکن اس ریاست میں مجھ جیسے مجرموں کو بھی اعلیٰ عدالت میں بے گناہی کی اپیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا میں بے گناہ ہونے کی اپیل ضرور کروں گا۔ دوسرا مقدمہ شروع ہونے میں بھی کئی ماہ لگ جائیں گے۔ اس کے بعد میں دوبارہ اپیل کروں گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ پولیس مسز کلارک کو مجسمہ واپس نہیں کر سکے گی۔ اُسے مجسمہ کئی سال بعد واپس مل سکے گا۔ دوسری طرف یہ ایک یقینی امر ہے کہ اخبارات میں جیسے ہی اس واردات کی خبر شائع ہو گی، فرانسیسی حکومت اپنی پیشکش واپس لے لے گی۔

تماشا



ترجمہ ● اثر نعمانی

کرنسی چند کہتے ہیں کہ ہر قتل کی اپنی ایک زندہ اور متحرک ہستی ہوتی ہے

ایک واردات کی دلچسپ روداد

اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مکمل لباس پہنے ہوئے تھا اور خراب حالت میں ایک معمولی کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ باہر سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ آوازوں کے ساتھ شرابیوں کے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ اُس نے [illegible] آنکھوں سے وقت دیکھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ [illegible] سوچا۔ اس وقت تک پال کی لاش یقیناً دریافت کر لی گئی ہوگی۔ پال کو اسی نے قتل کیا تھا۔

☆

پال اور وہ دونوں ایک ہی کمپنی میں ملازم تھے۔ پال اکاؤنٹینٹ تھا۔ [illegible] جنہیں چرانے پر ڈیجرو نے پال سے ساز باز کر کے [illegible] کا منصوبہ بنایا اور منصوبہ [illegible] انداز میں پال [illegible] سے اس جرم میں اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ پھر [illegible] منصوبے پر عمل کیا۔ منصوبہ کامیاب رہا۔ دونوں کی جیبیں [illegible] دونوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہوا۔ وہ دونوں قدم [illegible] معاون رہے۔ پال کے بارے میں ڈیجرو نے [illegible] قائم [illegible] ساتھی ہے لیکن جلد ہی اُسے اپنی رائے [illegible] بدلنی پڑی۔

[illegible] نہیں گزرا تھا۔ ڈیجرو کو ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ آڈیٹر فرم کے حسابات جانچنے کے لیے آنے والے ہیں۔ اس خبر نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ پہلی فرصت میں پال سے ملا۔ "پال! پال! کچھ سنا تم نے؟" اس کے ماتھے پر شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

"کیا؟" پال نے فائلوں کے انبار سے سر اٹھا کے سرسری انداز میں پوچھا۔

"آڈیٹر حسابات جانچنے کے لیے آنے والے ہیں۔" ڈیجرو کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ "میں کتنے دنوں سے بھونک رہا ہوں کہ ہمیں یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے مگر تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔" وہ تک کے پال کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل تلاش کرنے لگا۔ پال کی آنکھوں سے غور و فکر جھلکنے لگی تھی۔ ڈیجرو نے دبی آواز میں کہا۔ "اب بھی وقت ہے پال! میری بات پر سنجیدگی سے غور کرو۔ جس طرح بھی ممکن ہو، ہمیں جلد از جلد یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ میں صرف تمہارے انتظار میں رکا ہوا ہوں۔"

پال سر تھام کے چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر قدرے فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "میں فرار نہیں ہو سکتا ڈیجرو! ہرگز نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کمپنی کے ساتھ بددیانتی کرنے میں تم سے تعاون کیا اور اپنا زندگی بھر کا اصول غارت کر کے رکھ دیا لیکن اب میرا خیال ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے، ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا اور تمہارے لیے بھی میرا مشورہ یہی ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ڈیجرو نے تقریباً چیخ کے کہا پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ ان کی گفتگو کوئی اور نہ سن لے اس لیے اس نے نرمی اختیار کی اور

اُس نے کہا: "دیکھو پال! یہ انتہائی بے وقوفی کی بات ہوگی کہ ہم دونوں خود کو خواہ مخواہ ایک اذیت ناک مصیبت میں مبتلا کر لیں جب کہ ہمارے لیے بچ نکلنے کا راستہ بند نہیں ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تم اس وقت مایوسی اور اعصابی دباؤ کا شکار ہو۔ شاید تمھیں شراب کے ایک جام کی ضرورت ہے۔ حالات ابھی اتنے نہیں بگڑے ہیں کہ درست نہ کیے جا سکیں۔ آؤ، ذرا میرے ساتھ چلو۔"

وہ دونوں سرِ شام شراب خانے پہنچ گئے اور رات تک چسکیاں لیتے ہوئے گفتگو کرتے رہے۔ رچرڈ نے پال کو بہت سمجھایا۔ اس کی بہت منت کی مگر وہ کسی طرح اسے اپنی تجویز تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ اسے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ پال کس قدر ضدی آدمی ہے۔ پال کو شراب بہت پسند تھی۔ رچرڈ کے لیے نشے میں مدہوش کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ بظاہر وہ بھی پال کے ساتھ جام پر جام خالی کرتا رہا۔ پھر جب اسے یہ محسوس ہوا کہ اب پال نے خاطر خواہ مقدار میں شراب پی لی ہے تو وہ اسے لے کے چلا۔ چلتے وقت اس نے بھی یہ ظاہر کیا کہ وہ بے حد نشے میں ہے حالانکہ وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ شراب خانے سے نکل کے اس نے پال سے کہا: "پال! ہم دونوں کو بہت نشہ ہو گیا ہے۔ ہمیں کچھ دیر کار میں گھوم کے ٹھنڈی ہوا کھانی چاہیے۔" پال اس قدر نشے میں تھا کہ وہ رچرڈ کی بات نہیں سمجھ سکا۔ رچرڈ نے اسے سہارا دے کے کار میں بٹھایا اور خود اسٹیئرنگ سنبھال کے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔

ابھی بہت کم فاصلہ طے ہوا تھا کہ پال گہری نیند سو گیا۔ رچرڈ کو اسی موقع کا انتظار تھا۔ کار پال کی تھی اس لیے رچرڈ اسے پال ہی کے گیرج میں لے گیا۔ پال نے کروٹ تک نہیں بدلی۔ رچرڈ نے کار کا انجن چلتا ہوا چھوڑ دیا اور خاموشی کے ساتھ کار سے اتر کے باہر آ گیا۔ باہر آ کے اس نے گیرج کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔ پھر دوبارہ شراب خانے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے اپنی حرکات و سکنات سے سب کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ بہت مست ہے۔

اب رچرڈ شراب خانے کے عقبی کمرے میں بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر سے پھر قہقہے بلند ہوئے۔ رچرڈ کمرے سے نکل کے ڈگمگاتا ہوا شراب خانے میں پہنچا۔ کچھ لوگ ایک مختصر ہجوم کی صورت میں ایک جگہ جمع تھے۔ وہ سب شراب خانے کے فرش پر کوئی چیز نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ رچرڈ نے آگے بڑھ کے دیکھا۔ فرش پر ایک چوہا لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے پاؤں بہکے بہکے انداز میں اس طرح اٹھ رہے تھے جیسے وہ رقص کر رہا ہو۔ شراب خانے کے مالک فارسٹ نے رچرڈ کی طرف دیکھا۔ "ہیلو!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رات تو تم بہت زیادہ وہسکی پی گئے تھے۔ اتنی وہسکی عام طور پر دو آدمیوں کے لیے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اب کیسے ہو؟ کیا محسوس کر رہے ہو؟"

رچرڈ نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا: "فرش پر کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

"تم نے نہیں دیکھا؟ ایک چوہا رقص کر رہا ہے۔" فارسٹ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "آج صبح میں نے شراب خانہ کھولا تو یہ اسی طرح رقص کر رہا تھا۔ ہے نا عجیب بات! اچھا، یہ بتاؤ کچھ پینے کے لیے دوں؟"

"ضرور۔ منہ کا مزہ سخت خراب ہو رہا ہے۔" رچرڈ نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ایک پولیس انسپکٹر شراب خانے میں داخل ہوا۔ رچرڈ نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور بدستور بیئر پیتا رہا۔ وہ مکمل طور پر مطمئن تھا لیکن انسپکٹر سیدھا اسی کی طرف آیا۔ "کیا آپ کا نام رچرڈ ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

سب لوگ یکایک خاموش ہو گئے۔ وہ رقاص چوہے کا تماشا چھوڑ کے پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ فارسٹ ایک گلاس صاف کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی رک گئے۔ رچرڈ نے بیئر کے گھونٹ سے حلق تر کر کے کہا: "جی ہاں، میرا نام رچرڈ ہے۔"

"میں آپ ہی کی تلاش میں تھا مسٹر رچرڈ!" انسپکٹر نے کہا۔ "معلوم ہوا ہے کہ رات آپ مسٹر پال کے ساتھ تھے؟ آپ کو یہ خبر سناتے ہوئے مجھے افسوس ہے کہ آج صبح مسٹر پال اپنے گیرج میں مردہ پائے گئے ہیں۔" رچرڈ کا منہ حیرت سے کھل گیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ انسپکٹر نے بتایا: "آج صبح ان کے ایک پڑوسی نے لاش دریافت کی تھی۔ پولیس سرجن لاش کا معائنہ کر چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مسٹر پال کی موت کاربن مونو آکسائڈ گیس سے واقع ہوئی ہے۔"

"اُف!" رچرڈ کے چہرے پر غم اور افسوس کی علامتیں ابھریں۔ "مگر یہ کیسے ہوا انسپکٹر؟ کیسے ہوا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"یقین کر لیجیے مسٹر رچرڈ! حقیقت تلخ ہوتی ہے مگر اس پر یقین کرنا پڑتا ہے۔" انسپکٹر نے افسردگی سے کہا۔ "ہمیں معلوم ہوا کہ مسٹر پال آپ کی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ کیا یہ درست ہے؟"

رچرڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے چند لمحوں تک توقف کیا۔ پھر آہستہ سے بولا: "ایک افسوس ناک خبر اور ہے مسٹر رچرڈ! آج صبح آپ کے دفتر میں آڈیٹر پہنچے تھے۔ انھوں نے حسابات جانچے تو یہ انکشاف ہوا کہ کمپنی سے بہت بڑی رقم غبن کر لی گئی ہے۔ پوری رقم کا اندازہ نہیں کیا جا سکا مگر ان کا خیال ہے کہ پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ کا غبن کیا گیا ہے۔"

"تو...." رچرڈ نے لکنت سے کہا: "کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ غبن پال نے کیا ہوگا اور اب راز افشا ہو جانے کے خوف سے خودکشی کر لی ہے؟"

"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کر سکتا!" رچرڈ نے چیخ کے کہا۔ "میں پال کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ نہ غبن کر سکتا ہے نہ خودکشی۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا انسپکٹر! یقین کیجیے وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔"

انسپکٹر نے کہا: "ہمیں بھی یقین نہیں ہے کہ مسٹر پال نے خودکشی کی ہے۔"

رچرڈ کے ہاتھ شراب خانے کا کاؤنٹر مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اسے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں۔ اس نے بہت کوشش سے خود کو سنبھالا۔ انسپکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مسٹر پال نے خودکشی نہیں کی ہے۔ ہمیں چوہے کا ایک ٹکڑا دست یاب

ہوا ہے۔ وہ بحرلاؤں کے گیرج کے دروازے میں باہر سے پھنسا دیا گیا تھا۔ اس اقدام کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ دروازہ کھل نہ سکے۔ یہ کام مسٹر پال خود نہیں کر سکتے تھے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر بولا۔ "کیا آپ رات انہیں گھر پہنچانے گئے تھے مسٹر رچرڈ؟"

"بات یہ ہے" رچرڈ نے ایک خفت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ "میں اس سوال کے جواب میں نہ اقرار کر سکتا ہوں نہ انکار۔ مجھے رات کی کوئی بات یاد نہیں ہے۔"

"آپ کو ان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔" انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس لیے آپ انکار نہیں کر سکتے۔"

"مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے ازحد شرمندگی ہے۔" رچرڈ نے مرتعش آواز میں کہا۔ "لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں رات بہت زیادہ نشے میں تھا۔ پال میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں نے معمول کے خلاف اپنی برداشت سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ممکن ہے آپ درست کہہ رہے ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ میں پال کو پہنچانے گیا تھا یا نہیں۔ آپ شراب خانے کے مالک فارسٹ سے پوچھ سکتے ہیں۔ میں نشے میں قطعی مدہوش ہو گیا تھا اور اس نے مجھے اسی شراب خانے کے ایک کمرے میں پہنچا دیا تھا۔"

رچرڈ کی نگاہ تصدیق طلب انداز میں فارسٹ کو تلاش کرنے لگی۔ چوہا اب بھی فرش پر اسی طرح ناچ رہا تھا لیکن فارسٹ کاؤنٹر کے پیچھے موجود نہیں تھا۔ رچرڈ نے ادھر ادھر دیکھا۔ فارسٹ شراب خانے کے ایک گوشے میں جھکا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ یہ وہ گوشہ تھا جہاں رات رچرڈ اور پال نے شراب پی تھی۔

"وہ رہا فارسٹ۔" رچرڈ نے انگلی کے اشارے سے انسپکٹر کو بتایا۔ "آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں نشے میں تھا یا نہیں۔"

[illegible] نے مڑ کے دیکھا کہ فارسٹ کیا کر رہا ہے؟ فارسٹ نے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز ایک طرف ہٹا دی تھی۔ فرش میں لکڑی کا ایک تختہ جڑا ہوا تھا۔ وہ اسے کسی سلاخ سے کرید رہا تھا۔ انسپکٹر فارسٹ کی طرف بڑھا۔ رچرڈ بھی [illegible] انسپکٹر نے فارسٹ سے پوچھا۔ "مسٹر فارسٹ! از راہ کرم [illegible] آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا مسٹر رچرڈ رات بہت زیادہ نشے میں تھے؟"

"[illegible] نشے میں تو تھے۔" فارسٹ نے نگاہ اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "[illegible] مدہوش ہو گئے تھے۔ انہیں اٹھا کے پچھلے کمرے تک لے جانا [illegible]" ایک تختے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ فارسٹ اسے سلاخ کے [illegible] کوشش کر رہا تھا۔ "لیکن جب یہ مسٹر پال کو پہنچا کے واپس [illegible] مدہوش ہی تھے۔"

[illegible] نے پوچھا۔ "تم یہ کیا کر رہے ہو فارسٹ؟"

[illegible] مصروف رہا۔ اس نے تختہ اکھاڑ کے ایک سوراخ سا [illegible] کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ [illegible] وسکی کی مقدار [illegible] کی تعداد کے اعتبار سے مسٹر پال کا پورا پورا ساتھ دئیے رہے تھے لیکن مسٹر پال بہک گئے تھے اور انہیں پورا ہوش نہیں تھا۔ رات جب یہ مسٹر پال کو پہنچا کے آئے تھے تو مجھے شبہ ہوا تھا کہ انہیں نشہ وغیرہ نہیں ہے بلکہ محض بن رہے ہیں۔ صبح تک مجھے صرف شبہ تھا لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ اس سوراخ سے ایک چوہا نکلا ہے اور ناچ رہا ہے تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا اور اب میں اپنے یقین کا ثبوت بھی پیش کر سکتا ہوں۔"

رچرڈ چلا کے اس کے دعوے کی تردید کرنا چاہتا تھا مگر اس کی آواز حلق میں پھنس کے رہ گئی۔ فارسٹ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں روئی کا ایک گندا اور گیلا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ وہ ٹکڑا اس نے انسپکٹر کی ناک کے سامنے کر دیا۔

"انسپکٹر! چوہا بے وجہ رقص نہیں کر رہا ہے۔ سوراخ میں وسکی انڈیلی گئی تھی۔ وہ اسی وسکی کے نشے میں لڑکھڑا رہا ہے۔ آپ اسکاچ وسکی کی بو تو پہچان سکتے ہیں نا؟" انسپکٹر نے روئی سونگھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ فارسٹ نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسٹر رچرڈ رات وسکی اپنے حلق میں نہیں بلکہ چوہے کے بل میں منتقل کر رہے تھے۔"

رچرڈ نے تیزی سے گھوم کے دیکھا مگر فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چوہا اب بھی رقص کے انداز میں لڑکھڑا رہا تھا۔ رچرڈ نے جھلا کے اسے فرش سے اٹھایا اور پٹخ دیا لیکن چوہا بہت بے شرم تھا۔ اسے شراب پینے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ وہ فرش پر گر کے ایک لمحے تک ساکت پڑا رہا پھر فوراً اٹھ کے دوبارہ ناچنے لگا۔

کرشن چندریات

♥ آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے۔ عقل کے سوا ہر چیز کے دام بڑھ گئے ہیں۔ آج کل گوبھی مہنگی ہے مگر عقل سستی ہے۔ کپڑا مہنگا ہے مگر عقل سستی ہے۔ مکان مہنگا ہے مگر عقل سستی ہے۔ اتنی سستی ہے کہ بازاروں میں پڑے پڑے سڑ رہی ہے اور کوئی پوچھتا نہیں۔

♥ قتل ذاتی ہو یا میدان جنگ میں، ہمیشہ کہیں نہ کہیں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے اور چھوڑتا رہتا ہے اور اپنی ہستی کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ ہر قتل کی اپنی ایک زندہ اور متحرک ہستی ہوتی ہے۔ قاتل اور مقتول سے الگ اس کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ قتل ہمیشہ بولتا ہے اور اسے کبھی موت کے گھاٹ نہیں اتارا جا سکتا۔ قاتل اور مقتول کے مرنے کے بعد بھی قتل زندہ رہتا ہے۔ وہ جگہ بولتی ہے جہاں قتل ہوا تھا۔ وہ ہوا کراہتی ہے جس کی فضا میں گلا گھونٹا گیا تھا۔ لہو دھونے کے بعد خنجر کی زبان زندہ رہتی ہے۔

♥ جب ہم شکست کھاتے ہیں تو صلح کر لیتے ہیں اور جب عزت ہارتی ہے تو مکمل طور پر سپرد کر دیتی ہے۔



ترجمہ • نرجس شیخ

ایثوری

ایک جوہر شناس کی داستان، جو کہتا تھا کہ تاریخ میں
جواہر کے چور کی حیثیت سے اُس کا مقام سب سے بلند ہے

ایک رنگین اور شوخ تحریر

"آہ دوست" اُس نے اپنی بھوری نکیلی ناک شوکیس کے شیشے میں گویا گھسیڑتے ہوئے کہا۔ "میں جواہر کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ قیمتی پتھروں کے متعلق میرا علم مکمل ہے۔ وہ دیکھو میرے نوجوان دوست! وہ ہیرا دیکھ رہے ہو جس پر آٹھ سو پچاس پاؤنڈ کی قیمت درج ہے اور جس کا رنگ زردی مائل ہے؟ جُھش۔ وہ کوئی ہیرا ہے۔ اُس کی صحیح قیمت صرف تین سو پندرہ پاؤنڈ ہے۔ ایک تنگ کم ز ایک تنگ زیادہ۔ لوگ عموماً بڑے ہیرے پسند کرتے ہیں، خاص طور پر عورتیں بڑے ہیروں پر جان دیتی ہیں۔ وہ ایک بدرنگ لیکن اخروٹ کے برابر ہیرے کو ایک اچھے، خوب صورت اور بےداغ ہیرے پر ترجیح دیتی ہیں مگر ایک بانفق آدمی یہ غلطی کبھی نہیں کرے گا۔ ایک زمانے میں مجھے بھی ہیرے جمع کرنے کا شوق تھا۔"

"کیا تم ہیرے خرید کر جمع کرتے تھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"خریدنے کا کام صرف احمق کرتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ وہ زمرد کا ایک ٹکڑا بھوکی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے بچے ٹیپ آئس کریم تکتے ہیں۔ اُس نے کہا۔ "ہیرے، جواہرات اور قیمتی پتھر جمع کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انھیں خریدا نہیں بلکہ چرا کر اپنے ذخیرے میں شامل کیا جائے۔ خرید کر ہیرے جمع کرنے میں بالکل لطف نہیں آتا۔ میں نے جواہر ہمیشہ چوری کیے ہیں۔ جواہر کے چور کی حیثیت سے میرا مقام تاریخ میں سب سے بلند ہے۔ سنو، کیا تم نے وہ مشہور واقعہ سنا ہے کہ ہیروں کا چالیس ہزار کا ایک جڑاؤ کنگن اور آٹھ ہزار پاؤنڈ کا ایک زمرد غائب کر دیا گیا تھا؟"

"ہاں، میرا خیال ہے کہ میں نے وہ واقعہ سنا ہے۔"

"وہ کارنامہ اسی خاکسار کا تھا۔" اُس نے نہایت انکسار سے کہا۔ "مجھے یاد آرہا ہے کہ پولیس وہ کیس حل نہیں کر سکی تھی۔ کنگن اور زمرد

[illegible] تک گرفتار نہیں ہوا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"
"[illegible] جہاں تک کیس حل نہ ہونے کا سوال ہے میں
[illegible] کوئی بھی ایسی نہیں ہوتی جو حل نہ کی
[illegible] اس کا حل موجود نہ ہو۔ ہر جرم کا حل دنیا
[illegible] کے پاس ضرور ہوتا ہے چاہے وہ شخص مجرم
[illegible] اور چالاک مجرم پر اپنے غلیظ پنجے جمانے
[illegible] کا معاملہ ناقابلِ حل اور پُراسرار وغیرہ کہہ کر دفتر میں
[illegible] محنت ہو، ان بے وقوفوں پر جو سامنے کی چیزیں
[illegible] اس دنیا میں چالاکوں کی نسبت بے وقوفوں کی تعداد زیادہ ہے
[illegible] کے پاس سے ہٹ جاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔ جوہری
[illegible] نظروں سے گھور رہا تھا۔
[illegible] اس کیس میں دھرا ہی کیا ہے؟ پتھر کے چند ٹکڑے؟
[illegible] نے۔ بچوں کے کھیلنے کی گوریاں، چالیس ہزار پاؤنڈ
[illegible] میں جا سکتی ہے۔ میں بھلا اس بیزگاری میں کیں
[illegible] سکتا ہوں۔ میں تو ہمیشہ اونچا ہاتھ مارنے کا عادی ہوں۔
[illegible] کیا تمھارے پاس چائے کی ایک پیالی کے پیسے ہیں؟"
[illegible] تین پنیس ہیں۔"
[illegible] بھی تین پنیس ہیں۔ چلو کسی کیفے میں چل کے
[illegible]
[illegible] ریستوران میں بیٹھ گئے۔ "چائے لاؤ۔" اس نے ریستوران کی
[illegible] رعب سے حکم دیا۔
[illegible] والے جڑاؤ کنگن کا ذکر کر رہے تھے؟"
[illegible] یہ واقعہ بہت عرصے پہلے ویانا میں پیش آیا
[illegible] ویانا ہی میں تھا۔ وہ ایک خوب صورت شہر ہے
[illegible] بکھری رہتی ہے۔ آنکھوں والے دولت سمیٹے سمیٹے
[illegible] زمانے میں بہت خوش حال اور وجیہہ تھا۔ لڑکیاں
[illegible] جتی تھیں اور مرد حسد سے گھورتے تھے۔ وہ میری جوانی
[illegible] میری شخصیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں خوابوں کا
[illegible] ریاست کا ولی عہد نظر آتا تھا۔ لڑکیاں میری
[illegible] تھیں اور مرد میرے دبدبے سے کانپتے تھے لیکن
[illegible] سے بور نہیں کروں گا۔
[illegible] ویانا کے سب سے بارونق بازار میں چہل قدمی کر رہا تھا۔
[illegible] پڑی۔ وہ چیز دیکھ کے میرے قدم رک گئے میں
[illegible] معلوم ہوتا تھا کسی نے آسمان سے بہت سے
[illegible] کیس میں پھینک دیے ہیں۔ وہ ایک جڑاؤ کنگن تھا۔
[illegible] خوب صورت اور چمک دار ہیرے جڑے ہوئے تھے اور

میرے نوجوان دوست! میرے پاس وہ الفاظ موجود نہیں ہیں کہ میں اس کنگن کی تعریف کرسکوں اور اس کی خوب صورتی کا حق ادا کرسکوں۔ پتھر کے ان ٹکڑوں میں نظروں کو خیرہ کردینے والا نور مقید تھا۔ وہ جگ مگا رہے تھے، دمک رہے تھے اور مجھے اس طرح اپنی طرف کھینچ رہے تھے جس طرح ایک طاقت ور مقناطیس سوئی کھینچتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہے تھے اور چپکے چپکے اشارے کر رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں آؤ آؤ آگے بڑھو اور ہمیں اٹھالو۔

کنگن پر قیمت درج نہیں تھی اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بھلا کوئی جگ مگاتے ستاروں کی بھی قیمت لگاتا ہے میں نے اپنا وسیع تجربہ اور گہرا علم کام میں لاتے ہوئے ان کی قیمت کا اندازہ چالیس ہزار پاؤنڈ لگایا۔ کوئی احمق بھی اس کنگن کے عوض دکان دار کو فوراً چالیس ہزار پاؤنڈ ادا کرسکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ قسمت نے مجھے صرف اسی لیے گھسیٹ کر لائی ہے کہ میں یہ کنگن حاصل کروں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اسے قیمت ادا کیے بغیر حاصل کرکے رہوں گا۔ وہاں سے میں سیدھا اپنے مکان گیا اور اس مسئلے پر غور و فکر کرنے لگا۔ میں جب سوچنا شروع کرتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی ذہنی توانائی فضول باتوں پر ضائع نہیں کرتا میں ہر مسئلے کا انتہائی معقول اور صحیح حل تلاش کرکے دم لیتا ہوں۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ میں ایک جینئس آدمی ہوں۔

اس زمانے میں ویانا نفسیات کے علم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دنیا کے تمام خبطی اور دیوانے ویانا کا رخ کرتے تھے۔ ان کا مقصد نفسیات کے علم میں اپنی ذہانت کا ڈنکا بجانا ہوتا تھا یا وہ کسی ایسے ذہنی مرض کا علاج کروانے کے لیے وہاں جاتے تھے جس کا وجود صرف ان کے تصورات میں ہوتا تھا۔ نفسیاتی تجزیے کے ذریعے دماغی امراض کا علاج نیا نیا رائج ہوا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دماغی امراض کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا بلکہ میرا خیال ہے کہ دنیا کی بیشتر آبادی صرف ذہنی طور پر بیمار ہوتی ہے لیکن وہ لوگ عموماً قطعی تن درست ہوتے ہیں۔ جو اپنی ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرانے کے لیے نفسیات کے ماہروں سے رجوع کرتے ہیں۔ انھیں علاج کرانے کا جنون ہوتا ہے۔ جب کوئی نفسیات کا ماہر ان کا باقاعدہ علاج شروع کردیتا ہے تو وہ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ فرائڈ واقعی ایک عظیم انسان تھا، وہ ایک جینئس تھا اور نفسیات کے تمام ماہروں کا استاد تھا لیکن وہ اعلا طبقے کے خبطیوں کے ہاتھوں کبھی بے وقوف نہیں بنا۔ اُسے صرف تحقیق سے دلچسپی تھی۔ اسی نے نفسیات کا علم صحیح معنوں میں علم بنایا اس کی بات ہی اور تھی۔ ویانا میں نفسیات کے جس ماہر کو فرائڈ کے بعد دوسرے درجے پر سمجھا جاتا تھا اس کا نام پروفیسر ٹروز تھا۔ وہ فیشن ایبل طبقے کا روحِ رواں تھا۔ اس سے علاج کروانے والے اعلا طبقے میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھیں ذی حیثیت اور معزز تسلیم کیا جاتا تھا۔

پروفیسر ٹروز ایک چالاک اور ذہین آدمی تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ نفسیات کا ایک اچھا ماہر بھی تھا۔ اسے دولت سے اور دولت سے حاصل ہونے



کفایت اشعار

والی آسائشوں سے مشتق تھا۔ وہ اپنے ہر مریض کی کھال اس کی حیثیت دیکھ کر اتارتا تھا۔ اس کے ذہنی شفاخانے میں یورپ بھر کی فیشن ایبل عورتوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ہر ملک کی وہ عورتیں اس سے علاج کروانے کے لیے آتی تھیں جن کا شمار اعلا سوسائٹی میں کیا جاتا تھا۔ اس کے شفاخانے کا نام ٹروز سینی ٹوریم تھا۔ شفاخانہ بہت بڑی کوٹھی پر مشتمل تھا۔ وہاں بے داغ لباس پہنے ہوئے بے شمار ملازم ہر وقت اور ہر طرف گھومتے پھرتے تھے۔ بیک کے ذہن میں جیسے ہی پروفیسر ٹروز کا خیال آیا، میں سمجھ گیا کہ اب بیک مجھے کنگن حاصل کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ تم سمجھ رہے ہو نا دوست! پروفیسر ٹروز دنیا کا ایک مشہور ترین شخص تھا لیکن وہ اپنی تصویر کی اشاعت پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنی شخصیت پُراسرار بنائی ہوئی تھی اور یہی سبب تھا کہ فیشن ایبل عورتیں دوڑی ہوئی اس کے شفاخانے پہنچتی تھیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس کی شخصیت بودی تھی یا وہ کوئی عام سا آدمی نظر آتا تھا۔ وہ بہت تخیل دار شخصیت کا مالک تھا۔ دراز قد، دُبلا بدن اور بڑی بڑی مونچھیں۔ اس کی مونچھیں مشہور فلسفی نطشے کی مونچھوں کی طرح تھیں اور اس کے ڈیل ڈول پر بہت جچتی تھیں۔

'میں ایک روز اس کے سینی ٹوریم گیا۔ میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ ملازم کے ہاتھ اندر بھیجا۔ کارڈ پر فرانس کے ایک قدیم اور بے حد معزز خاندان کے سربراہ کا نام چھپا ہوا تھا۔

'خوش آمدید موسیو ڈیوک!' پروفیسر ٹروز نے دھیمے اور میٹھے لہجے میں مجھ سے کہا۔ لہجے کی مٹھاس کا سبب یہ تھا کہ میں جس خاندان کے سربراہ کا نام استعمال کر رہا تھا، وہ یورپ کے دولت مند ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ 'میری خوش بختی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے۔'

'پروفیسر!' میں نے کہا، 'میں آپ سے ایک معاملے میں مشورہ کرنا چاہتا

'ہاں لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے۔ اس کا تعلق میرے بھائی سے ہے۔'

'میں ہمہ تن گوش ہوں جناب والا۔'

'میرا بھائی ہر لحاظ سے تن درست اور ہوش مند ہے۔ اسے صرف ایک بیماری ہے اگر اسے بیماری کہا جا سکے تو.....'

'کیا بیماری ہے جناب؟'

'اس کی عجیب و غریب بیماری سے ہم بہت پریشان ہیں اور وہ خود بھی خوش نہیں رہتا۔'

'جی۔ پھر؟'

'وہ بیک کے جواہر کا لفظ سنتے ہی پاگل ہو جاتا ہے۔'

'لیکن کیسے صاحب؟ آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟'

'مثال کے طور پر اگر آپ اسے کوئی جڑاؤ کنگن دکھا دیں تو وہ اچانک پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگے گا اور تشدد پر اتر آئے گا۔'

'بہت دلچسپ، بہت حیرت انگیز۔'

'بے شک۔ بیک کا لفظ سنتے ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ شروع میں ہم نے اس کی اس بیماری پر کوئی توجہ نہیں دی اور یہ فرض کر لیا کہ وہ خود ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس کی بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں بیٹھے بیٹھے ہیروں اور جواہر کا خیال آ جاتا ہے اور وہ چیخنے چلانے لگتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں پروفیسر! صورت حال کتنی سنگین اور ہمارے لیے کس قدر پریشانی کا باعث ہے۔'

'میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔ واقعی یہ بہت پریشان کن صورت حال ہے۔'

'اگر آپ اسے تن درست کر دیں پروفیسر تو میں آپ کو منہ مانگی فیس ادا کروں گا۔ مجھے اپنے بھائی سے بہت محبت ہے۔ میں اسے تن درست دیکھنے کے لیے اپنی تمام دولت خرچ کر سکتا ہوں۔'

'مجھے آپ کی مدد کر کے بہت خوشی ہوگی جناب والا!'

'لیکن،' میں نے کہا، 'آپ کو ایک بات کا خیال رکھنا پڑے گا۔ وہ یہ کہ اسے یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اسے علاج کے لیے ذہنی امراض کے کسی شفاخانے میں لایا گیا ہے۔'

'آپ فکر نہ کیجیے جناب!'

'میری تجویز یہ ہے کہ میں کسی بہانے اسے یہاں لے آؤں اور آپ کے پاس چھوڑ دوں۔'

'بہت عمدہ تجویز ہے۔ آپ اس پر عمل کرنا کب پسند کریں گے؟'

'کل!'

'مناسب ہے۔ کس وقت تشریف لائیں گے آپ؟'

'چار بجے سہ پہر کو۔'

'بہتر ہے۔' پروفیسر ٹروز نے ملاقات کا وقت اپنی نوٹ بک میں

[illegible]

"اب میں گزارش کروں گا کہ آپ اپنی فیس کا ایک حصہ پیشگی قبول
کر لیجیے۔"

"قطعی نہیں۔"

"آپ کو قبول کرنا ہوگا پروفیسر۔"

"میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا جناب!"

"میں اصرار کرتا ہوں پروفیسر!"

"جناب! آپ میرے معزز مہمان ہیں۔" اُس نے شکست خوردہ لہجے
میں کہا۔ "مجھے آپ کی بات ماننی ہی پڑے گی۔"

میں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بہت موٹا بٹوا نکالا اور اُس
میں سے دس ہزار اسٹرلنگ کھینچ کر میز پر ڈال دیے۔ پروفیسر نے انھیں گنے بغیر
دراز میں ڈال دیا۔ "اس کی رسید؟" اُس نے قلم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "براہِ کرم آپ اپنے ملازمین کو یہ ہدایت
[illegible] کل جب میں اپنے بھائی کے ساتھ یہاں آؤں تو وہ کوئی سوال کیے
[illegible] بغیر جھجک آپ کی انتظار گاہ میں پہنچا دیں۔ آپ کے ملازمین نے اگر
[illegible] سوال کیا، نام پوچھا یا کسی قسم کی جھجک ظاہر کی تو میرے بھائی کو فوراً
[illegible] ممکن ہے کہ اُسے قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے۔"

"آپ فکر نہ کیجیے جناب! آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا جائے
گا۔ میں ملازمین کے نگراں کو بلا کر آپ کے سامنے یہ ہدایتیں دے دیتا
ہوں۔ [illegible] آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ وہ خود آپ کا استقبال کرے گا۔"

[illegible] گاڑی کے پہیے کی طرح آسانی سے چڑی پر مسرورسا
[illegible] اس جوہری سے ملاقات کرنا تھا جس کے عارضی قبضے میں جڑاؤ
[illegible] میری راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ موتی کے لوزینج
[illegible] اس دکان میں داخل ہوا۔ میں نے دکان کے مالک سے
[illegible] ظاہر کی۔ اس بار میں نے دوسرا ملاقاتی کارڈ استعمال کیا۔ کون جا
[illegible] بات نہیں سمجھے؟ پروفیسر ٹروز کا کارڈ۔ اس پر ٹروز
[illegible] ہوا تھا۔ "میں پروفیسر ٹروز ہوں" میں نے جوہری سے کہا۔
[illegible] "پروفیسر! آپ سے مل کے بڑی مسرت ہوئی۔"

[illegible]

[illegible] میری منگنی ہے۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔
[illegible] ہزاروں لاکھوں مبارکبادیں قبول فرمائیے۔"
[illegible] منگنی کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ پہلے میں اپنی
[illegible] چاہتا ہوں۔"
[illegible] تحفہ دینے کے لیے بہت مناسب ہے۔" جوہری کی باچھیں
[illegible] کہ پروفیسر ٹروز اور اس کی دولت کا ذکر سنا ہو۔
[illegible] بہت عمدہ اور بے حد نفیس چیز۔ مثال کے طور پر یہ جڑاؤ کنگن



جو باہر شوکیس میں رکھا ہے۔"

کنگن فوراً میری خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ آہ میرے نوجوان دوست!
تمھیں کیا بتاؤں کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔
میں نے خود پر بڑا جبر کر کے انھیں کانپنے سے روکا۔ جوہری نے کنگن کی جو
قیمت بتائی وہ کسی بھی شخص کو آسانی سے بے ہوش کر سکتی تھی لیکن میں اس
وقت کوئی معمولی آدمی نہیں پروفیسر ٹروز تھا۔ میں نے قیمت سن کر پلکیں بھی نہیں
جھپکائیں۔ پروفیسر ٹروز کے لیے ساٹھ ہزار پاؤنڈ کیا حقیقت رکھتے تھے اور خصوصاً
ایسی صورت میں کہ اس کی ہونے والی بیوی مادام وانڈرنگ تھی۔ جوہری کو میں نے
اپنی منگیتر کا یہی نام بتایا تھا۔ دنیا کے بچے بچے کو معلوم تھا کہ مادام وانڈرنگ ایک
بے حد ثروت مند بیوہ ہے اور ٹوج ایسٹ انڈیز کا بیشتر حصہ اس کی ملکیت ہے۔

"ظاہر ہے۔" جوہری نے کہا۔ "مادام وانڈرنگ کو کوئی معمولی تحفہ نہیں دیا جا
سکتا۔ ان کے لیے تحفہ بھی ان کے شایانِ شان ہونا چاہیے۔"

"آج کل اس کی طبیعت ناساز ہے۔" میں نے جوہری کو اطلاع دی۔

"اوہ۔" جوہری نے تاسف سے کہا۔

"آج کل وہ میرے سینی ٹوریم میں میری زیرِ علاج ہے۔"

"آہ۔" جوہری نے تجربہ کارانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ایک آنکھ دبائی۔ وہ
جہاں دیدہ آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ پروفیسر نے سونے کا انڈا دینے والی مرغی پھانس لی ہے۔

میں نے سخت نظروں سے اُسے گھورا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے
ساتھ سینی ٹوریم چلو اور مادام وانڈرنگ کی پسندیدگی کے لیے یہ کنگن خود اس کی
خدمت میں پیش کرو۔ کنگن کے علاوہ مجھے ایک انگوٹھی کی ضرورت بھی پڑے
گی۔ انگوٹھی زمرد کے نگینے والی ہو تو بہتر ہے لیکن زیادہ مہنگی نہ ہو۔ اس کی قیمت
بس پانچ چھ ہزار پاؤنڈ کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔"

اس جملے کے اختتام پر میرا منصوبہ مکمل ہو گیا۔ اب مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اپنی محنت کا پھل توڑ لوں۔ جوہری نے جڑاؤ کنگن اور آٹھ ہزار پاؤنڈ کی ایک بے حد خوب صورت انگوٹھی، دونوں تحفے چمڑے کے ایک خوشنما بریف کیس میں رکھے اور بریف کیس ایک آہنی زنجیر کے ذریعے اپنی کلائی سے منسلک کر لیا۔ اس نے مجھے ایک ریوالور دکھایا اور اسے اپنی جیکٹ کے نیچے ہولسٹر میں ڈال لیا۔ "کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔" اس نے کہا۔

"درست ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "آج کل اچکوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔"

ہم بیتھنی لورم پہنچے تو چار بج کر چند منٹ ہوئے تھے۔ میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ ملازموں کا نگران میرا انتظار کر رہا ہے۔ جب ہم کوٹھی کے داخلی دروازے میں گھسے تو دربان نے ٹوپی اٹھا کے مجھے سلامی دی۔ راہداری سے گزرتے وقت ایک ملازم نے جھک کر مجھے تعظیم دی اور ہمارے راستے سے ہٹ کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ملازموں کے نگران نے آگے بڑھ کے میرا استقبال کیا۔ اس نے تقریباً جھک کر میرے قدموں کو بوسہ دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ پذیرائی اور احترام دیکھ کر جوہری کو یقین ہو گیا کہ میں ہی پروفیسر ٹروز ہوں۔ اس بیتھنی لورم کا مالک۔ اگر میرے متعلق اس کے ذہن میں پہلے کوئی شک ہوگا بھی تو اب وہ شک باقی رہنا ناممکن تھا۔

میں جوہری کو پروفیسر کی انتظار گاہ میں لے گیا۔ "اب تم کنگن اور انگوٹھی مجھے دے دو۔ میں دونوں چیزیں مادام کو دکھا کے ابھی آتا ہوں۔ تم یہیں میرا انتظار کرنا۔"

"ضرور ضرور مسٹر پروفیسر! اگر مادام نے یہ چیزیں پسند کر لیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ضائع نہیں ہوئی۔ ان کی پسندیدگی سند کا درجہ رکھتی ہے۔"

اس نے چابی سے زنجیر کا قفل کھولا اور بریف کیس زنجیر سے علیحدہ کر کے میرے حوالے کر دیا۔ کنگن اور انگوٹھی دونوں چیزیں بریف کیس میں موجود تھیں۔

میں سرسری انداز میں پروفیسر ٹروز کے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ "شش۔ آپ خاموش رہیے۔ میرا بھائی باہر موجود ہے۔ آپ مجھے دوسرے دروازے سے باہر نکال دیجیے کیونکہ جب اسے احساس ہوگا کہ میں اسے دھوکے سے بیتھنی لورم میں چھوڑ گیا ہوں تو وہ بہت چیخے گا، چلائے گا۔ یہ منظر میرا دل توڑ دے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں جناب! آپ کے لیے یہ منظر واقعی اذیت ناک ہوگا کیونکہ آپ اپنے بھائی سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

پروفیسر ٹروز نے مجھے دوسرے دروازے سے باہر نکال دیا۔ میں گنگناتا ہوا اس کی کوٹھی سے باہر آ گیا۔ میرا گنگنانا حالات کے عین مطابق تھا۔ جس کنگن نے میری راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں، وہ میری جیب میں موجود تھا۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا یہاں تک کہ چائے سانس لینے والی نلکی میں داخل ہو گئی۔ وہ میز پر گھونسے برساتا ہوا بری طرح کھانسنے لگا۔ میں نے اس کی کمر پر زور سے گھونسے مارے۔ اس طرح اس کی کہانی ختم ہوئی جو اپنے سال کا سب سے بڑا لطیفہ تھا۔ میرے دوست جیمز نے بھی سنا، ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔

میرے رخصت ہونے کے بعد اصلی پروفیسر ٹروز اپنے کمرے سے نکلا ہوگا۔ اس کے اور جوہری کے درمیان ہونے والے مکالمے کچھ ایسے ہوں گے۔ "کیا مادام کو جڑاؤ کنگن اور انگوٹھی دونوں چیزیں پسند آ گئیں جناب؟" جوہری نے بے تابی سے دریافت کیا ہوگا۔ وہ پروفیسر ٹروز کو میرا نائب وغیرہ سمجھ رہا ہوگا۔

"آپ تشریف رکھیے محترم! اس موضوع پر ہم کچھ دیر بعد گفتگو کریں گے۔"

"لیکن میرے ... میرے ...؟"

"بس بس، چیخنے چلانے کی کوشش نہ کیجیے جناب!" اس نے کہا۔ "ہم اس موضوع پر کچھ دیر بعد گفتگو کریں گے۔ مطمئن رہیے۔ ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔"

"میرا جڑاؤ کنگن؟ میری زمرد کی انگوٹھی؟" جوہری نے زور سے چیخ کے اپنا ریوالور نکال لیا ہوگا۔ پروفیسر ٹروز نے بڑی مہارت سے اس کی کلائی پر ایک زوردار ٹک لگائی ہوگی۔ جوہری کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا ہوگا۔ پروفیسر نے ملازموں کو آواز دی ہوگی اور ملازموں نے دس سیکنڈ کے اندر اندر جوہری کو شکنجے میں کس کے بے بس کر دیا ہوگا۔ وہ بدنصیب گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخ چیخ کے اپنے کنگن اور انگوٹھی کے متعلق سوال کر رہا ہوگا۔ پھر پروفیسر ٹروز پر بہت دیر بعد یہ انکشاف ہوا ہوگا کہ جوہری دراصل دیوانہ نہیں، ایک دکان والا ہے، کسی ڈیوک کا بھائی وائی نہیں ہے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو گئی ہوگی۔ میں ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار تھا اور ٹرین تیزی سے وارسا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب میں ایک ہندوستانی مہاراجا کے روپ میں تھا اور بے حد خوش تھا۔"

"میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں میرے نوجوان دوست کہ میں جڑاؤ کنگن کی خوب صورتی کا حق ادا کر سکوں اور ہاں وہ انگوٹھی بھی بہت خوب صورت تھی۔ زمرد کا نگینہ تو انتہائی خوب صورت تھا۔ مجھے زمرد بہت پسند ہیں۔ انھیں صحیح معنی میں ہیرے کہا جا سکتا ہے لیکن اب؟ اب ہیروں کے نام پر کیا چیزیں فروخت کی جاتی ہیں؟ پتھر کے بدرنگ ٹکڑے، رنگین شیشے، بچوں کے کھیلنے کی گڑیاں۔ تم نے وہ ہیرے دیکھے تھے جو اس دکان کے شوکیس میں رکھے ہوئے تھے؟ میں پتھروں کے وہ ٹکڑے تحفے میں بھی قبول نہیں کر سکتا، ہرگز نہیں۔ اگر تم ان کے ساتھ کچھ نقدی دو تب بھی میں انھیں قبول نہیں کروں گا۔ خیر چھوڑو یہ باتیں۔ کیا تمھارے پاس سگریٹ خریدنے کے لیے پیسے ہیں؟ نہیں ہیں؟ چلو چھوڑو۔ آؤ کچھ دیر چہل قدمی کرتے ہیں۔"



ڈینس ہیلی * مظفر کاظمی

ایک عورت کی کہانی، جس نے اپنے آپ سے منافقت کی تھی

عاشقوں کے لیے نشانِ عبرت

آج سارا کو دفتر میں معمول سے زیادہ کام کرنا پڑا تھا۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ چھٹی ہونے کے باوجود وہ دفتر میں رکی ہوئی تھی۔ دوسرے سب لوگ جا چکے تھے۔ دفتر کے صحن میں اس نے کچھ دیر چہل قدمی کی اور چند لمبی لمبی سانسیں بھریں۔ پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو ایک لمحے کے لیے سُن ہو کے رہ گئی۔ اس کی میز کے سامنے ملاقاتیوں کے لیے کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا پھر بھی ایک کرسی پر کوئی شخص ڈھیر تھا۔ اس شخص کا سر اور ہاتھ سارا کی میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ سارا دوسری ہی نظر میں اسے پہچان گئی۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ "جان! تم؟"

جان کرسی سے اٹھ گیا۔ اس نے بوجھل قدموں سے سارا کے قریب پہنچ کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "گھبراؤ نہیں، معاف کرنا میں نے بے وقت آ کے تمھیں ڈرا دیا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ تم جا چکی ہو گی۔" وہ شہر کا ایک مشہور و معروف وکیل تھا۔ سارا اس کے دفتر میں ملازم تھی۔

سارا نے غور سے جان کا چہرہ دیکھا۔ "تم کچھ بیمار نظر آ رہے ہو جان! کیا میں تمھاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟ میرے لائق کوئی خدمت"

"مجھے کچھ پینے کی طلب ہو رہی ہے۔" جان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "الماری سے شراب کی بوتل اور دو گلاس نکال لو۔ مجھے تم سے گفتگو بھی کرنی ہے۔"

"الماری میں تو صرف موکلوں کی تواضع والی شراب ہے۔ تمھاری پسندیدہ شراب......؟"

"چھوڑو یہ تکلفات۔" جان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو شراب ہے، وہی لے آؤ۔" سارا بوتل نکالنے کے لیے مڑی۔ جان

کہہ رہا تھا: "میں تو اب وکالت کا پیشہ اختیار کر کے پچھتا رہا ہوں۔ کاش میں کسی اور پیشے سے منسلک ہوتا۔ وکالت مجھے برباد کر ڈالے گی۔"

سارا نے جان کے سامنے ایک چھوٹی میز رکھ دی اور وہ میز شراب کی بوتل اور ایک گلاس سے سجا دی۔ پھر اپنے لیے کرسی کھینچنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج بہت دنوں بعد جان کی نگاہ پھر اس کے بدن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ سارا کے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹیں۔ اس نے تصور میں خود کو آئینے کے سامنے دیکھا۔ اس کے بال اب بھی سنہرے تھے اور بدن اب بھی گداز تھا۔ اس نے ملائمت کے ساتھ جان سے کہا: "تمھاری طبیعت کیسی ہے جان؟" اس نے شراب بوتل سے گلاس میں انڈیلی۔

"لو، جام ہونٹوں سے لگاؤ۔"

جان نے ایک گھونٹ بھر کے کہا: "ہلکی سی اعصابی پژمردگی ہے۔"

سارا چند لمحوں تک اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر دھیمی آواز میں بولی: "میرا خیال ہے تم کچھ پریشان ہو۔ میں تمھارے دُکھ سُکھ میں ہمیشہ شریک رہی ہوں۔ تمھیں اپنی پریشانی کے متعلق مجھ سے کھل کر گفتگو کرنی چاہیے۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہوگا۔"

جان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گھٹنے پر تھپکی دی: "سارا! تم بہت اچھی ہو۔ ہمارے روابط کو کتنی مدت ہو گئی؟ پندرہ برس بلکہ شاید پندرہ برس سے زیادہ۔ تم میری پرائیویٹ سیکریٹری رہی ہو، قابلِ اعتماد دوست رہی ہو، محبت شعار محبوبہ رہی ہو اور کبھی کبھی ایک بہت اچھی نرس بھی۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ پھر دکھ سے کہنے لگا: "مگر مجھے افسوس ہے میں نے تمھاری قدر نہیں کی۔ میں ایک نادان اور خود غرض آدمی ہوں۔" اس نے ایک آہ بھری: "سارا! آج اتنے برسوں بعد تمھارے اتنے قریب بیٹھ کے مجھے بہت مسرت ہو رہی ہے۔ میرا اعتماد واپس آ رہا ہے۔ تم نے درست کہا کہ میں پریشان ہوں۔ میری پریشانی کا سبب سنو گی؟ اگر میں تمھیں کچھ نہ بتاؤں، پھر بھی چند روز بعد تمھیں میری پریشانی کا سبب معلوم ہو جائے گا کیونکہ چند روز بعد یہ پریشانی ایک اسکینڈل کی شکل اختیار کر چکی ہوگی مگر میں تمھیں سب کچھ خود بتاؤں گا کیونکہ مجھے تم پر اعتماد ہے، صرف تم پر۔ تم جانتی ہو گزشتہ پندرہ برس سے میں زندگی کے معاملے میں کیسے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہوں۔ میں نے ہر قدم پر اس بات کا خیال رکھا کہ میری نیک نامی کسی اسکینڈل میں ملوث نہ ہو جائے۔ مجھے آج جو عزت، شہرت اور حیثیت حاصل ہے، تم جانتی ہو اسے حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے دل پر کیا کیا جبر کیے، کیسے کیسے جذبوں کا خون نہیں کیا مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے میرے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا اور میری ساری تگ و دو کا حاصل اور ماحول، ایک ہی چنگاری مجھے خس و خاشاک کی طرح جلا دے گی۔"

"ہوا کیا؟ تم اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہو؟" سارا نے سوال کیا۔

"میں وکلا کی ایک عظیم الشان فرم کا سینئر پارٹنر ہوں۔ تمھی بتاؤ مجھے جب پلے بوائے کی سطح پر اُتار دیا جائے گا تو کیا کچھ نہ ہوگا۔" سارا کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ ساکت پتلیوں سے جان کی طرف دیکھتی رہی۔ جان نے ماتھے پر ہتھیلی مار کے کہا: "سارا! اب تم سے کیا چھپانا۔ مجھے معاف کر دینا۔ گزشتہ دنوں مجھے ایک عیار لڑکی نے ورغلا لیا اور میں بے وقوف اس کے دام میں پھنس گیا مگر کیا یہ کون سی انہونی بات ہے؟ تمھی بتاؤ، کون سا مرد یہ روگ نہیں پالتا اور کون سی لڑکی یہ چکر نہیں چلاتی؟ سبھی ایسا کرتے ہیں اور انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا، کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھاتا لیکن میں بدقسمتی سے ایک وکیل ہوں۔ وکیلوں کو لوگ شاید آدمی نہیں سمجھتے، انھیں فرشتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے بارے میں اگر کوئی ایسی ویسی بات مشہور ہو گئی تو میں برباد ہو کے رہ جاؤں گا۔"

سارا کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ پندرہ برس پیچھے پہنچ کے ماضی میں کھو چکی تھی۔ پندرہ برس پہلے وہ اس فرم میں نئی نئی آئی تھی۔ جان اس وقت فرم کا جونیئر پارٹنر تھا۔ سارا کو جان سے محبت ہو گئی تھی۔ جان بھی اس کی طرف ملتفت تھا۔ وہ اس سے غیر دفتری اور غیر کاروباری انداز میں ملتا تھا۔ جب جان نے پہلی بار اس سے کہا تھا: "سارا! مجھے مسٹر نہیں جان کہا کرو۔" تو سارا پھولی نہیں سمائی تھی۔ پھر جان اُسے ایک قصبے کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور ہر لمحے ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ سارا وہ دن اور راتیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جان کے والہانہ اصرار پر معمولی تذبذب کے بعد خود کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جلد ہی شادی کی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں جگمگانے لگے گی۔ قصبے سے لوٹ کے بھی وہ اسی اُمید میں جان کے اشاروں پر چلتی رہی۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ پھر ایک دن اچانک جان نے اس سے کہا: "ڈارلنگ! آج کل میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔ تنگی اور عسرت کی وجہ سے میں نہ تمھیں خوش رکھ سکتا ہوں اور نہ کسی مالی سہارے کے بغیر خود زندہ رہ سکتا ہوں۔"

اس زمانے میں جان کے پاس ماریا نامی ایک لڑکی کا بہت آنا جانا تھا۔ جان کی یہ بات اس امر کی تمہید تھی کہ وہ ماریا سے شادی کرنے والا ہے۔ ماریا عمر میں جان سے بڑی ہونے کے علاوہ بدصورت اور بد دماغ بھی تھی۔ اس کی واحد خوبی اس کی دولت تھی۔ وہ اپنی دولت کی بلاشرکتِ غیرے مالک تھی۔ ماریا کی اس خوبی نے جان کو سارا سے جدا کر دیا۔ وقتی طور پر سارا کو شدید دھچکا لگا تھا مگر ماریا سے شادی کے بعد جلد ہی جان کو دل کا دورہ پڑا۔ سارا کو معلوم ہوا تو وہ تڑپ گئی۔ اپنے محبوب کے لیے اس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ صبر تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی اب اس نے حالات سے سمجھوتا بھی کر لیا۔ فرم کا کاروبار روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ملازمت کی مصروفیات میں اسے اپنی محبت کی ناکامی پر رونے کا وقت بہت

جاپانی کہاوتیں

قیصر سلطانہ ملک

- ☆ اچھے کاری گر کو روزگار ڈھونڈنے کے لیے کسی دُور کے ملک میں نہیں جانا پڑتا۔
- ☆ خوشی اور خالی پیٹ کی دوستی نہیں نبھتی۔
- ☆ کنگال کا گھر گلی کا گشت بھی پہچانتا ہے۔
- ☆ گھر آنے والے غریب رشتے دار کے پاؤں نہیں چومے جاتے۔
- ☆ منحوس صورت والے کو دُکان داری نہیں کرنی چاہیے۔
- ☆ پیادے کا درد گھڑ سوار کیا جانے۔
- ☆ بارش ٹوٹی ہوئی جھونپڑی پر زیادہ زور سے برستی ہے۔
- ☆ پانی ہی نہ ہو تو جہاز کیا چلیں گے۔
- ☆ دانا لوگ احمقوں سے کبھی تکرار نہیں کرتے۔
- ☆ مہمان سے نہ پوچھیے کہ کیا مرغی ذبح کر دوں؟

کم ملتا تھا۔ پھر کئی سال بعد ایک لڑکی این اُس کے دفتر میں مُلازم ہوئی۔ این ایک خوب صورت مگر فلرٹ لڑکی تھی۔ اُس نے فرم کے کئی لوگوں کو بے وقوف بنایا اور جان پر بھی ڈورے ڈالنے شروع کر دیے سارا کے زخم ہرے ہونے لگے۔

سوچتے سوچتے وہ چونکی۔ جان کہہ رہا تھا۔ "سارا! میں عام مردوں کی طرح اپنے دفاع میں روایتی جملے نہیں کہوں گا۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ دُنیا کی کوئی لڑکی مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی مگر این نے میری خوش فہمی دور کر دی ہے۔ اُس نے مجھ سے میرے ہوش و حواس چھین لیے ہیں۔ میں سخت پریشان ہوں۔"

"میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔" سارا نے طنز آمیز آہستگی سے کہا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہے؟"

"کیا؟" جان نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "کیا تمھیں میرا اور این کا معاملہ معلوم ہے؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔" سارا نے بے پروائی سے کہا۔ وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ جان! تم یہ سوال مجھ سے کر رہے ہو؟ مجھ سے؟ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ بھلا مجھ سے تمھاری کوئی بات کیسے چھپ سکتی ہے مگر وہ جان سے یہ بات نہیں کہہ سکی۔ کہنے لگی۔ "این بڑی آوارہ اور چالاک لڑکی ہے۔ اُس نے آہستہ آہستہ تم پر ڈورے ڈالے۔ تم نے اُس کی باتوں میں آ کے اور جذبات میں بہہ کے اُسے اپنے ساتھ ایک رُومانی ہفتہ منانے کی تحریری دعوت دے ڈالی۔ اُسے تڑپ کے اسی پتّے کی ضرورت تھی، وہ اسے مل گیا۔ اب وہ تمھاری تحریر تمھارے خلاف استعمال کرنے سے باز نہیں رہے گی۔"

"تو کیا تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مجھے بلیک میل کر رہی ہے؟" جان نے بے اختیار پوچھا۔

"نہیں، یہ محض میرا اندازہ تھا۔ خیر، کتنی رقم طلب کر رہی ہے وہ؟"

"دو ہزار ڈالر مگر تمھیں یہ اندازہ بھی ہو گا کہ دو ہزار ڈالر کی رقم صرف پہلی قسط ہو گی۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جائے گی۔" اُس نے غصے اور بے بسی سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ "آہ، میں یہ معاملہ عدالت میں بھی نہیں لے جا سکتا۔"

"ہاں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تمھی کیا، کوئی بھی وکیل اس قسم کے اسکینڈل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُس کی ذات سے کوئی اسکینڈل وابستہ نہیں ہوتا، اُس کی پریکٹس خوب چلتی ہے لیکن جیسے ہی اس قسم کی کوئی بات مشہور ہوئی، سارا کاروبار ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وکلا ایسے معاملات عدالت سے باہر خفیہ طور پر طے کر لیتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، مجھے یہ بات تمھی نے بتائی تھی۔" سارا نے جان کا مرتعش ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے دبایا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "جان! گھبراؤ نہیں۔ تمھاری تحریر اب این کے بجائے میرے پاس ہے۔ این اب تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" پھر وہ جان کا کھلا ہوا حیرت زدہ چہرہ دیکھ کے ہنسی۔ "مجھے تمھارا خط حاصل کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ میں گزشتہ ہفتے این کے فلیٹ میں گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ باہر گئی ہوئی ہے۔ اُس کے فلیٹ کی مالکہ مجھے پہچانتی ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں این کے فلیٹ میں بیٹھ کے اُس کا انتظار کروں گی۔ وہ مجھے اُس کے فلیٹ میں پہنچا کے واپس چلی گئی۔ میں نے تمھارا خط تلاش کیا اور اُسے لے کے لوٹ آئی۔"

جان کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ اُسے یکایک وہ سارا یاد آ گئی جو کبھی اُس کی محبوبہ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اُس نے سرگوشی میں کہا۔ "سارا! ڈارلنگ! مجھے معاف کر دو۔" سارا نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا ورنہ اُس کے رخسار بھی بھیگ جاتے۔

"وہ نامعقول خط کہاں ہے؟" چند منٹ بعد جان نے پوچھا۔

"تمھارے گھر ہو گا۔ چلو، مجھے اپنے گھر لے چلو۔"

"نہیں۔" سارا کے ہونٹ کپکپائے۔ "میں تمھیں اپنے گھر نہیں لے جانا چاہتی۔ خط وہاں نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے؟" جان نے بے تابی سے سوال کیا۔

"اسے میں نے اپنے بینک لاکر میں رکھوا دیا ہے۔"

"وہ مجھے دے دو سارا! میں اُسے جلا دوں گا۔"

"نہیں جان! میں وہ خط تمھیں نہیں دے سکتی۔ میرے پاس آخر تمھاری کوئی تو نشانی رہنی چاہیے۔" سارا بے نیازی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ "تم اس نشانی کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہو گے۔ بہرحال تمھارے لیے میں این سے یقیناً بہتر ثابت ہوں گی۔"

وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔



ہربرٹ ہیرس — انجم کلیم

مغرب سے درآمدہ، تازہ بہ تازہ، مختصر مختصر

نوجوان لڑکیوں کے والدین کے لیے ایک رہنما تحریر

اُس کے مالی حالات بہت اچھے تھے کیونکہ وہ ایک بہت بڑی فیکٹری کا مینیجنگ ڈائریکٹر تھا۔

ایک روز وہ فیکٹری سے نکلا تو اُس کا موڈ بہت خراب تھا۔ چوکیدار اسے دیکھ کے مستعد ہو گیا۔ وہ پھاٹک کے قریب پہنچا تو چوکیدار نے سر جھکایا۔ اُس نے اچانک چوکیدار سے عجیب لہجے میں سوال کیا: ”کیا تمھاری کوئی بیٹی ہے؟“

چوکیدار حیرت سے اپنے مینیجنگ ڈائریکٹر کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ برسوں سے فیکٹری میں ملازم ہوا تھا۔ مینیجنگ ڈائریکٹر نے اس سے اس طرح کبھی بات نہیں کی تھی۔ مینیجنگ ڈائریکٹر اُس سے صرف کام کی بات کرتا تھا۔ ... مینیجنگ ڈائریکٹر کا نام مائن تھا۔ اُس نے اپنا سوال دہرایا: ”تمھاری کوئی بیٹی ہے؟“

چوکیدار نے ادب سے انکار میں گردن ہلائی۔ مائن نے اُسے رشک کی نگاہ سے دیکھا۔ ”تم ایک خوش نصیب آدمی ہو۔“

”میں ایک چوکیدار ہوں جناب!“

”چوکیدار ہونا کوئی بدنصیبی نہیں ہے مگر ایک بیٹی کا باپ ہونا بہت بڑی بدنصیبی ہے۔“ مائن نے کہا۔ ”لیکن تمھیں یہ باتیں کیا معلوم ——— ہاں! اگر تم کسی بیٹی کے باپ ہوتے تو میری بات سمجھ سکتے تھے۔“

چوکیدار سر ہلا کے رہ گیا۔ مائن بڑھ کے اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ انتہائی بے چین اور متفکر نظر آ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دل ہی دل میں کسی بات پر کھول رہا ہو۔

اُس نے کار میں بیٹھ کے اُسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر کار بھی اُسے اپنی بیٹی کی طرح ضدی اور تکلیف دہ معلوم ہوتی۔ اُس کی بیٹی کا نام ایلس تھا۔ وہ بڑبڑایا: ”ایلس! اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمھیں سیدھے راستے پر لانے کے لیے کوئی انتہائی قدم اُٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔“

اُس کا ہاتھ اگنیشن میں چابی گھمانے کے لیے بار بار حرکت کر رہا تھا۔ آخر کچھ کوشش کے بعد کار ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہو گئی۔ یہ کوفت برداشت کرنے سے مائن کا موڈ اور خراب ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آج کا دن میرے لیے کوئی مبارک دن نہیں ہے۔ ہوا میں بے پناہ رطوبت تھی اور رطوبت اُسے قطعاً پسند نہیں تھی۔ یہ بھیگا بھیگا موسم اُسے ہمیشہ کوفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کار کا نقص اور رطوبت پھر ان دونوں باتوں سے بڑھ کے ایلس کی عاقبت نا اندیشی اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ ”بے وقوف لڑکی!“ اُس نے زیرِ لب کہا۔ ”اتنا بھی نہیں جانتی“

کہ اس ترقی یافتہ صنعتی دور میں ایک معمولی مصور کی کیا اوقات ہے۔"

ایلس کو ایک مصور سے محبت ہو گئی تھی۔ بڑھے ہوئے شیو اور اُلجھے ہوئے بالوں والے اس مصور سے محض کبھی کبھی ملنا بھی مائن کی برداشت سے باہر تھا۔ اس صورت میں وہ اُسے اپنے داماد کی حیثیت سے کس طرح قبول کر سکتا تھا۔ اُس نے سوچا ممکن ہے وہ مصور دوسروں کے لیے کوئی پسندیدہ شخص ہو اور اپنے فن کی وجہ سے تھوڑا بہت مقبول بھی ہو لیکن محض مقبولیت سے کہیں پیٹ بھرتا ہے؟ صرف پسندیدگی سے کہیں زندگی کے اخراجات چلتے ہیں؟ مائن حیران تھا کہ آخر ایلس نے اُس مصور میں کیا دیکھ لیا ہے۔ اگر اُسے مصوری کے فن سے دلچسپی ہے تو اس کے لیے کسی بہترین استاد کا بندوبست بھی تو کیا جا سکتا ہے اور اگر اُسے تصویروں سے عشق ہے تو دنیا کا وہ کون سا شاہکار ہے جو اُس کے لیے خریدا نہ جا سکے۔ آخر اُس کا باپ کوئی قلاش آدمی تو نہیں ہے۔

مائن جلتا اور کڑھتا ہوا ایک بڑی سڑک پر آ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کار کی رفتار تیز کر دے مگر اس نے رفتار تیز کرنے کی کوشش کی تو انجن بھر بھرا کے ایک دم خاموش ہو گیا اور کار رک گئی۔ مائن نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مارے۔ اُس کا دل چاہا کہ اپنے بال نوچ لے۔ آج کا دن اُس کی زندگی کا ناکام ترین دن تھا۔ شدید گرمی پڑ رہی تھی اور کار فیکٹری سے خاصی دُور پہنچ گئی تھی۔ اب وہ کسی راہگیر سے دھکا لگانے کی درخواست کرنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ اُس کا ذہن جھنجھنانے لگا۔

وہ کار سے اترا۔ پہلے اُس نے ارادہ کیا کہ کسی سے دھکا لگانے کی درخواست کرے لیکن پھر وہ بڑبڑاتا ہوا انجن پر جھکا کے بونٹ اٹھانے لگا۔ اُس نے انجن کا غور سے جائزہ لیا۔ اُس کا خیال تھا کہ کوئی تار وغیرہ نکل گیا ہو گا مگر کوئی تار نکلا ہوا نظر نہیں آیا۔ پھر کیا نقص ہے؟ اُس نے وہ نقص تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی۔ پھر اچانک اُس نے ایک نامانوس آواز سنی۔ "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں جناب؟"

مائن چونک کے سیدھا ہو گیا۔ اُس نے آواز کی سمت دیکھا۔ اجنبی کے لہجے سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا اور شائستہ آدمی ہے۔ مائن کے قریب ایک خوب صورت نوجوان کھڑا تھا۔ اُس کے جسم پر بہترین لباس تھا۔ بہترین لباس نے اس کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اُسے دیکھ کے مائن کی جھلاہٹ قدرے کم ہو گئی۔ وہ خود کو کچھ تر و تازہ محسوس کرنے لگا۔ "میں مدد کی پیشکش پر تمہارا ممنون ہوں نوجوان!" مائن نے مسکرا کے کہا۔ "کیا تم کار کے انجن کے متعلق کچھ جانتے ہو؟"

"جی ہاں جناب! آپ ذرا ایک طرف ہٹ جائیے۔ میں دیکھتا ہوں۔" نوجوان بہت اعتماد سے انجن پر جھک گیا۔

وہ دیر تک انجن کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران میں اُس کے ہاتھ مسلسل کام کرتے رہے۔ اُس کے انداز سے مہارت جھلک رہی تھی۔ مائن تعریفی نگاہ سے اُسے دیکھتا رہا۔ جلد ہی کار ٹھیک ہو گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کی اور مائن کی طرف دیکھا۔ مائن نے اثبات میں سر ہلا کے اُسے داد دی۔ اس کے شاداب چہرے سے مائن کو غیر معمولی ذہانت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ نوجوان کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ مائن نے اُس کا کندھا تھپتھپا کے کہا۔ "بہت خوب! تم ایک ماہر آدمی ہو۔ تمھیں کہاں جانا ہے؟ کیا میں تمھیں پہنچانے کی پیشکش کر سکتا ہوں؟"

"ضرور جناب! ضرور مجھے اسٹیشن کی طرف جانا ہے۔"

"آؤ گاڑی میں بیٹھو، میں تمھیں اسٹیشن اُتارتا ہوا آگے بڑھ جاؤں گا۔" مائن نے کہا۔ "آج گرمی نے بُرا حال کر رکھا ہے۔ کپڑے جسم سے چپک رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔" نوجوان نے جیب سے ایک خوشبودار رومال نکال کے چہرے سے پسینہ پونچھا۔

مائن نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "مجھے یہ مرطوب موسم بالکل پسند نہیں ہے۔" مائن نے کہا۔ "کیا تم اسے برداشت کر سکتے ہو؟"

"کر نہیں سکتا جناب!" نوجوان نے ادب سے جواب دیا۔ "میری فرم نے مجھے دو سال کے لیے ملایا بھیجا تھا۔ وہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ ملایا میں مجھے بڑی حد تک اس موسم کی عادت ہو گئی تھی۔"

مائن نے گردن موڑ کے نوجوان کی طرف دیکھا اور پسندیدگی سے سوچا، کہ اس کی فرم سے ایسے ہی نوجوان وابستہ ہونے چاہئیں۔ ایلس آخر ایسے باعمل اور کاروباری نوجوانوں کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتی؟ نکمے مصور اور ایسے نوجوانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اس نے نوجوان سے دریافت کیا۔ "تم اپنی فرم میں کس شعبے سے متعلق ہو؟"

"میں ایک سیلز ایجنٹ ہوں جناب!" نوجوان نے کہا۔ "دو ہفتے بعد میری ترقی ہو جائے گی۔ مجھے سیلز مینیجر بنایا جا رہا ہے۔ میری کارکردگی سے میرے افسر بہت مطمئن اور خوش ہیں۔"

مائن نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے نوجوان اور ایلس کے محبوب مصور کا موازنہ کیا۔ مصور اُسے اس نوجوان کے مقابلے میں بہت کم تر نظر آیا۔ اُس کے ذہن پر ایک بار پھر تلخی کا حملہ ہوا۔ وہ ایلس کو کوسنے لگا۔ شہر میں ایسے بے شمار خوب رو سیلز ایجنٹ گھومتے رہتے ہیں۔ آخر وہ ان میں سے کسی کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوئی؟ ایسے نوجوانوں کی تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ خود مختلف مصنوعات لے کے گھر گھر پہنچتے ہیں۔ نوجوان کی آواز سن کے وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ نوجوان کہہ رہا تھا۔ "جناب! آپ شاید کچھ سوچ رہے ہیں۔ کیا آپ کسی سلسلے میں فکرمند ہیں؟"

"ہاں نوجوان! میں بے حد فکرمند ہوں۔ ایک گھریلو الجھن ہے۔"

اُس نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد اپنا نام بتایا۔ پھر خود کلامی کے انداز میں کہا: "میری ایک بیٹی ہے اس کا نام ایلس ہے۔" اُس نے کنکھیوں سے نوجوان کی طرف دیکھا۔

"جی جناب!" نوجوان اشتیاق اور تجسس سے بولا۔

"وہ بڑی نادان لڑکی ہے۔" مائن نے کہا: "وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے لیکن اُس کی حرکتیں ابھی تک طفلانہ ہیں۔"

"آج کل کی لڑکیاں عموماً اپنی اصل عمر کے مقابلے میں ذہنی طور پر کم عمر رہتی ہیں۔" نوجوان نے رائے زنی کی۔

"نہیں وہ عام لڑکیوں سے کہیں زیادہ ذہین ہے۔ ہر معاملے میں سوجھ بوجھ سے کام لیتی ہے لیکن نہ جانے کیا مصیبت ہے، شریک حیات کے انتخاب میں اُس نے اپنی ذہانت استعمال نہیں کی۔ اُس نے شادی کے لیے ایک مصوّر کا انتخاب کیا ہے۔ مصوّر کا نام پال ہے۔ ممکن ہے، تم اس سے واقف ہو؟"

"جی نہیں جناب! میں اس نام کے کسی مصوّر سے واقف نہیں ہوں۔"

"ایلس کا خیال ہے کہ وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا مگر میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔" نوجوان کچھ نہیں بولا۔ مائن کہتا رہا: "میں بہت پریشان ہوں لیکن میں اس پریشانی کو طول نہیں کھینچنے دوں گا۔ آج میں ایلس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ پال مجھے قطعاً پسند نہیں ہے اور وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے حیرت ہے کہ جو شخص اپنی حالت سنوار سکے نہ سکتا ہو وہ اچھی تصویریں کس طرح بناتا ہوگا۔ ایسے مصوّر کا بھلا کیا مستقبل ہو سکتا ہے؟"

"فن کار لوگ عموماً اچھے شوہر ثابت نہیں ہوتے جناب!" نوجوان نے کہا: "تخیل پرستی اور حقائق کا سامنا کرنے میں بہت فرق ہے۔ فن کار لوگ حقیقی زندگی کی جدوجہد میں آگے نہیں بڑھتے۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے نوجوان! میں ایلس پر زور دوں گا کہ وہ اس لڑکے کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ اگر اس سلسلے میں مجھے سختی سے کام لینا پڑا تو میں ایلس کے مستقبل کی خاطر سختی بھی کروں گا۔ اُسے کوئی ایسا نوجوان چننا چاہیے جو کاروباری اور عملی آدمی ہو اور جس کا مستقبل روشن ہو۔"

چند منٹ خاموشی سے گزرے۔ پھر کار اسٹیشن کے قریب پہنچ گئی۔ نوجوان نے مائن سے کہا: "مجھے یہیں اتار دیجیے۔ میں آپکا شکر گزار ہوں۔"

"شکر گزاری کی ضرورت نہیں ہے۔" مائن نے کہا: "میں تم جیسے نوجوانوں کو راحت کا باعث سمجھتا ہوں۔ لو یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ مجھے امید ہے کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ میں تمہیں ایلس سے بھی ملواؤں گا۔ اس سے مل کر تم مسرت محسوس کرو گے۔ وہ ایک ذہین اور حسین لڑکی ہے۔ ایسی لڑکی کا باپ ہونا ایک بہت بڑی مصیبت ہوتا ہے۔" اُس نے شفقت کی نگاہ سے نوجوان کی طرف دیکھا: "میں نے اب تک تمہارا نام دریافت نہیں کیا؟"

"مجھے ہارڈی کہتے ہیں جناب!" نوجوان نے کہا: "ایک بار پھر شکریہ۔" وہ مائن کا کارڈ جیب میں رکھ کے کار سے اتر گیا۔

مائن نے کار آگے بڑھا دی۔ اب وہ گھر جا رہا تھا مگر اُس کی کار چل نہیں رہی تھی بلکہ رینگ رہی تھی۔ اُسے رہ رہ کے ایلس کا خیال آ رہا تھا۔ اُس نے جھنجلا کے فیصلہ کیا کہ وہ رات کے کھانے پر ایلس سے کھل کے بات کرے گا اور اس پریشانی کا آج ہی سدباب کرے گا۔

رات کے کھانے کے دوران میں وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھا اور بہت رُک رُک کے لقمے اٹھا رہا تھا۔ اُس کی پیشانی اور آنکھوں سے گہری سوچ کا پتہ چل رہا تھا۔ اُس کے جبڑے بار بار بھینچ جاتے تھے اور لقمے پر انگلیوں کی گرفت بڑھ جاتی تھی۔ وہ ایلس سے نظریں ملاتے ہوئے کترا رہا تھا۔ ایلس اُس کی اس حالت سے خوف زدہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کا باپ کس کرب میں مبتلا ہے۔ کھانے کے بعد کافی کا دور شروع ہوا۔ مائن نے چسکیاں لیتے ہوئے لب کشائی کی: "ایلس! میں شام سے تمہارے دوست پال کے متعلق سوچ رہا ہوں۔" ایلس آنکھیں جھکائے بیٹھی رہی۔ مائن نے کہا: "اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے اُس کے متعلق غلط رائے قائم کر کے تمہارے اور اُس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم آئندہ اسے یہاں نہ لانا۔ غالباً میرا یہ کہنا تم پر سراسر ظلم تھا۔" ایلس اپنے باپ کی زبان سے یہ غیر متوقع باتیں سُن کے دنگ رہ گئی۔ مائن کہتا رہا: "مجھے احساس ہے کہ میں فن کاروں کے متعلق فرسودہ خیال کا آدمی ہوں لیکن اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ وہ بھی دوسرے معززین کی طرح عزت اور احترام کے لائق ہوتے ہیں۔"

"لیکن ڈیڈی!" ایلس مسرت سے ہانپنے لگی۔ وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

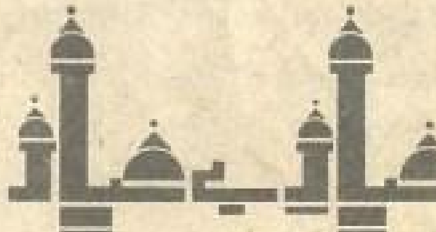
"اب میں تمہارے راستے کی دیوار نہیں بنوں گا۔" مائن محبت سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگا۔ ایلس کچھ ہچکچائی۔ پھر اُس نے بڑھ کے اپنے باپ کی گردن میں بازو حمائل کر دیئے اور اس کے گال کا بوسہ لے لیا۔

مائن نے پیار سے اُس کا رخسار تھپ تھپایا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر چہل قدمی کرنا چاہتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کا عادی نہیں تھا لیکن آج اُسے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ وہ ٹہلتا ہوا تھانے تک جائے گا۔ وہ تھانے میں یہ رپورٹ درج کرانا چاہتا تھا کہ آج ایک خوب رُو نوجوان نے اُس کی مدد کر کے اور لمبی باتوں میں لگا کے اپنی شخصیت سے متاثر کیا اور اُس کی جیب سے بٹوا اُڑا لیا جس میں چار ہزار ڈالر سے زیادہ رقم موجود تھی۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

کراماتِ نظامیہ	چمنستانِ نیازی کے گل ہائے رنگ رنگ	معراج السالکین	دیوانِ شاہ نیاز
محمد فائق نیازی	تحریر و ترتیب : شفیق بریلوی	قطب الدین نظامی پوری	مرتبہ : شفیق بریلوی

• ابوالمنصور ترمذی



انھیں بادشاہ کے جواب کا انتظار تھا۔

اٹھارویں صدی کے ایک موسمِ باراں کا ذکر ہے۔ دلی کا قلعۂ معلّیٰ انسانوں کے سمندر میں ایک جزیرہ معلوم ہو رہا تھا۔ قلعے کی فصیلیں حسرت سے آسمان تک رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ نیلا شامیانہ ابھی بارآور ہوا ہو۔ قلعے کے مخصوص ایوان میں مغل فرماں روا شاہ عالم ثانی زرنگار تخت پر فروکش تھا۔ اس کی آنکھیں کہیں دور سفر کر رہی تھیں۔ دربار میں سناٹا طاری تھا۔ اُمرا اور وزرا ہاتھ باندھے دو رویہ کھڑے تھے۔ ہر شخص بادشاہ کی جانب نگراں اور اس کے جواب کا منتظر تھا۔

بادشاہ سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے؟ قلعے کے باہر کھڑے ہوئے اژدہام کو کس طرح مطمئن کرے؟ آسمان ناراض ہو گیا تھا۔ شاہ عالم ثانی دلی کے سیاہ و سفید کا مختار تھا مگر دلی کے آسمان پر اس کی حکومت نہیں تھی۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ بے بسی کی لاچاری اس کی آنکھوں میں منجمد تھی۔ آخر کچھ سکوت کے بعد اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس نے سنجیدگی سے دربار پر بھرپور نظر ڈالی اور پہلو بدل کے زیرِ لب گویا ہوا۔ "مگر ہم عصا کیسے توڑیں؟ ہم نے تو صرف شمشیر زنی کا فن سیکھا ہے۔ اب ایک ہی راستہ نظر آتا ہے۔" اس نے تخت سے اتر کے امرا کو مخاطب کیا۔ "بی بی کی خدمت میں پہنچ کے ہماری بندگی پیش کی جائے۔ ہمیں اس اندھیرے میں اب اُمید کی ایک ہی کرن نظر آتی ہے۔"

دلی میں ایک بی بی رہتی تھی۔ درباری اُمرا چند معزز شہریوں کے ساتھ اس کے در پہ پہنچے۔ بی بی کے سامنے ان کا مدعا بیان کیا گیا کہ جمنا کے ساحل پر ایک جھونپڑا ہے جس میں ایک فقیر رہتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنا عصا لیے ہوئے باہر کھڑا رہتا ہے۔ آسمان پر جب بھی ابر چھاتا ہے اور جب بھی بارش کے آثار پیدا ہوتے ہیں، فقیر غیظ و غضب میں ایک نعرہ بلند کر کے عصا لہراتا ہے اور آسمان دوبارہ شفاف ہو جاتا ہے۔ شہر کے کئی بزرگ یکے بعد دیگرے فقیر کے پاس جا چکے ہیں۔ انھوں نے اس سے کہا کہ بابا! آپ عصا گرا دیجیے اور جھونپڑی میں چلے جائیے۔ مخلوق بارش نہ ہونے کے باعث پریشان ہے۔ فقیر کسی کی ایک نہیں سنتا۔ کہتا ہے۔ "ہم پانی نہیں برسنے دیں گے، ہماری جھونپڑی بہہ جائے گی۔ ہم پانی نہیں برسنے دیں گے۔"

درباریوں اور شہریوں نے بی بی کو بادشاہ کی بندگی پیش کی اور کہا۔ "بی بی! اب آپ ہی دستگیری کیجیے۔ پانی نہ برسا تو کھیتیاں روٹھ جائیں گی۔ کال پڑ جائے گا۔"

بی بی نے توجہ سے سب کی باتیں سنیں اور کہا۔ "لوگو! اس فقیر نے تم لوگوں کی بات تسلیم نہیں کی تو ایک ناتواں عورت کی بات اس پر کیا اثر کرے گی؟"

"آپ کے مرتبے سے کون واقف نہیں ہے۔" آنے والوں نے کہا۔ "بی بی! ہمیں نامراد نہ لوٹائیے۔"

اس بی بی کی ایک خادمہ تھی۔ اس نے اپنی خادمہ کو آواز دی اور کہا۔ "زہرن! تو ان فقیر کے پاس جانا اور ان سے عاجزی کے ساتھ کہنا کہ مخلوق پریشان ہو رہی ہے۔ آپ پانی کی بندش نہ کیجیے۔"

زہرن روانہ ہوئی مگر چند قدم چل کے لوٹ آئی۔ اس نے بی بی سے پوچھا۔ "اگر انھوں نے عاجزی کے باوجود میری عرض قبول نہ کی تو؟"

بی بی نے جواب دیا۔ "تو بال کھول کے ان کے قدموں پر سر رکھ کے التجا کرنا۔"

زہرن روانہ ہوئی مگر چند قدم چل کے پھر لوٹ آئی اور بولی۔ "بی بی! اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو؟"

بی بی نے جواب دیا۔ "تو ان سے کہنا کہ مان جائیے ورنہ کسی اور کی التجا نے پانی برسا دیا تو آپ کا کیا بھرم رہ جائے گا۔"

زہرن نے کہا۔ "اور اگر وہ اس پر بھی نہ مانے تو؟"

بی بی کی حالت اچانک متغیر ہوگئی اور اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

"تو پھر مجھے کس لیے بھیجا جا رہا ہے؟"

نورن ڈولی میں سوار ہو کے دریا کی طرف روانہ ہوئی۔ بادشاہ کی سواری اس کی ڈولی سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ محافظوں اور مصاحبوں کی معیت میں دور ہی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر شہر کے ہزاروں مضطرب افراد ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ساحل پر جب نورن کی ڈولی اتری تو سناٹا چھا گیا۔ ڈولی سے اُتر کے نورن سیدھی فقیر کی جھونپڑی کے پاس پہنچی اور اس نے بی بی کی ہدایت کے مطابق عاجزی سے اُسے مخاطب کیا: "بابا! پانی نہ روکو، لوگ پریشان ہیں۔ عصا زمین پر رکھ دو۔"

فقیر نورن کی زبانی یہ سُن کے برہم ہوگیا اور جلال کے عالم میں نورن کو جھڑک دیا۔ نورن نے دوبارہ التجا کی، فقیر اور مشتعل ہوگیا۔ نورن التجا کرتی رہی مگر فقیر کے ارادے میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ آخر نورن نے جھنجلا کے کہا: "اب اس کو کسی دوسرے نے پانی برسا دیا تو ...؟"

"ڈُبو دے ... اگر تیرے اندر طاقت ہے تو برسا دے، ہم ناک کٹوا دیں گے۔" فقیر نے غضب کے عالم میں کہا۔

نورن کچھ دیر کھڑی رہی کہ شاید فقیر اپنا ارادہ بدل دے پھر مجبوراً ڈولی میں سوار ہوگئی اور ڈولی دریا کے کنارے چلتے چلتے ایک جگہ رک گئی۔ اس نے اپنی چادر ڈولی کے شامیانے کے مانند تان دی اور ڈولی سے نکل کے اُس کے سائے میں بیٹھ گئی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ آسمان گرجنے لگا، بجلی چمکنے لگی اور ابر کا ایک سیاہ ٹکڑا نمودار ہوا۔ وہ ٹکڑا نورن کی چادر سے بڑا نہیں تھا۔ فقیر نے جب ابر کا ٹکڑا آسمان پر دیکھا تو بپھر گیا اور ایک لرزہ انگیز نعرہ بلند کر کے اپنا عصا لہرایا لیکن ابر اسی طرح چھایا رہا۔ فقیر کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہوگیا۔ وہ تھکتے اور ہانپتے ہوئے بار بار عصا لہرانے لگا مگر ابر معدوم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھتا اور پھیلتا رہا یہاں تک کہ سارے آسمان پر محیط ہوگیا اور دیکھتے دیکھتے آسمان سے پانی ٹپکنے لگا جیسے آسمان میں ہر طرف بڑے بڑے سوراخ ہوگئے ہوں۔ پانی ایسا برسا کہ جل تھل ہوگیا۔ جمنا میں طغیانی آگئی۔ اس صورتِ حال سے یہ اندیشہ ابھرا کہ کہیں جمنا شہر کی طرف نہ بڑھ جائے۔ بادشاہ کے امیروں اور مصاحبوں نے نورن کے نزدیک جا کے رحمت کی [illegible] اور اس سے پانی رکنے کی درخواست کی۔ نورن اُٹھ کے ڈولی میں بیٹھ گئی اور ڈولی پھر فقیر کے پاس سے چلی۔ جھونپڑی کے اردگرد چالیس پچاس قدم تک پانی کی ایک بوند بھی نہیں گری تھی مگر فقیر نے اپنا عصا پھینک دیا تھا۔ ڈولی قریب پہنچی تو آہستہ خرامی سے نورن کے پاس آیا۔ اس نے ایک خنجر نورن کے سامنے کر دیا اور منہ آگے کر کے بیٹھ گیا۔ نورن نے خنجر ایک طرف رکھ دیا اور فقیر کے قدم پکڑ کے بولی: "بابا! مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو، پانی تو کسی اور کے کہنے سے برسا ہے، میں تو ایک خادمہ ہوں، مگر آپ کو مخلوق کا خیال رکھنا چاہیے۔"

☆

نورن جس بی بی کی خادمہ تھی اُن کا نام بی بی لاڈو تھا۔ شہر والے انھیں بی بی غریب نواز کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ بی بی کا در غریبوں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ جنھیں وقت کی گردش نے ستایا ہوتا تھا وہ اپنی مشکلیں بی بی کے پاس لے جاتے تھے اور جب واپس آتے تھے تو انھیں راستے اتنے بوجھل نظر نہ آتے اور اندھیرے گھر اتنے گھپ نظر نہیں آتے تھے۔ بی بی انھیں کچھ نہیں دیتی تھیں، نہ مال نہ زر، ہاں وہ کوئی روشنی ضرور دیتی تھیں جو نظر نہیں آتی تھی۔ بی بی غریب نواز ایک ولی مولانا سعید الدین کی بیٹی اور دوسرے ولی شاہ رحمت اللہ کی بیوی تھیں۔ زہد و تقویٰ ورثے میں ملا تھا اور انھوں نے اس ورثے کی ایسی حفاظت کی تھی کہ چار دانگ عالم میں نام پیدا کیا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا کے بعد رشد و عرفان میں معروف تین خواتین گزری ہیں: رابعہ بصری، پیرپیراں کی والدہ فاطمہ ثانی اور بی بی غریب نواز۔

دلّی کا کوچہ کوچہ بی بی غریب نواز کی کرامتوں سے واقف تھا۔ اُن کے جذب و استغراق، اُن کی عبادت گزاری اور عشقِ الٰہی کا دور دور تک شہرہ تھا۔ کہتے ہیں ایک بار اُن پر استغراق کا عالم طاری تھا کہ محلے کے کسی شخص نے دانت صاف کرنے کے لیے نیم کی ٹہنی کاٹی۔ اُدھر ٹہنی پر چاقو لگا، اِدھر بی بی غریب نواز چلائیں: "لوگو! دوڑو، اسے منع کرو۔" لوگ فوراً لپکے، اس شخص کو ٹہنی کاٹنے سے روک دیا گیا۔ ٹہنی میں جتنا چاقو لگا تھا، اتنی ہی بی بی غریب نواز کی ہتھیلی کٹ گئی تھی۔ ہتھیلی سے خون جاری ہوگیا تھا اور زخم کا نشان پڑ گیا تھا۔ یہ نشان ایک مدت تک باقی رہا۔ کہتے ہیں کہ وہ عالمِ استغراق میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں سما جاتی تھیں۔ وہ جتنی بے خبر تھیں اتنی ہی باخبر۔

ایک دفعہ دلّی میں سخت قحط پڑا۔ لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔ بی بی غریب نواز کے پاس جواہر سے مرصع ایک طلائی زیور تھا۔ انھوں نے اسے فروخت کر کے چنے خریدے جن سے دو مکان چھتوں تک بھر گئے۔ بی بی نے لکڑی کا ایک پیالہ بنوایا۔ پیالے میں ایک شخص کی خوراک سما جاتی تھی۔ بی بی نے خادمہ کو اس پیالے سے چنے تقسیم کرنے کے لیے مقرر کر دیا۔ صبح سے شروع ہو کے نو بجے رات تک مستحقین میں چنے تقسیم کیے جاتے تھے۔ جب تک قحط رہا چنے برابر تقسیم ہوتے رہے اور یہ ذخیرہ ختم نہ ہوا۔

مشہور ہے کہ ایک بار بی بی غریب نواز آنکھیں بند کیے [illegible] کی خوشی کر رہی تھیں۔ اچانک انھوں نے ملازماؤں کی دہشت زدہ آوازیں سنیں: "بی بی سانپ۔ بی بی سانپ۔" انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور انگلی سے سانپ کی طرف اشارہ کیا۔ سانپ نے ان کی انگلی کی حرکت کے ساتھ ساتھ اپنا پھن اٹھایا اور فرش پر مار دیا۔ بی بی غریب نواز کی انگلی اٹھتی اور جھکتی رہی، سانپ اس کے ساتھ ساتھ فرش پر سر مارتا رہا۔ اس طرح انھوں نے سانپ کو اس قدر عاجز کر دیا کہ اس میں ہلنے تک کی سکت نہ رہی۔ پھر بی بی نے ایک خادمہ سے کہا: "اسے باہر چھوڑ آؤ۔" خادمہ نے سانپ اپنی گود میں اٹھایا اور دروازے کے باہر چھوڑ کے کہا: "خبردار! اب اِس طرف کا رخ نہ کرنا۔" سانپ آہستہ آہستہ ایک طرف رینگ گیا۔

بی بی کے بے شمار رشتے اور معتقدین کا تو کوئی شمار نہیں تھا۔ اُن کے مریدوں میں قتلن خاں نامی ایک شخص کو صوبے دار نے بلوایا اور اُس سے فوری طور پر کچھ روپیہ طلب کیا۔ قتلن خاں نے بوجوہ روپیہ دینے سے معذوری کا اظہار کیا۔ صوبے دار انکار سن کے سختی پر اتر آیا۔ نتیجۃً دونوں میں تلخ کلامی کی نوبت پہنچ گئی۔ صوبے دار نے طیش میں قتلن خاں کو دھمکی دی: "میں تمھارے مکانات جڑ سے اکھڑوا دوں گا۔"

قتلن خاں کا پارہ بھی چڑھ گیا۔ اُس نے طنطنے سے جواب دیا: "صوبے دار صاحب! ہوش میں رہیے۔ آپ میری جڑ کیا اکھاڑیں گے، میں ہی آپ کی جڑ اکھاڑ دوں گا۔" یہ کہہ کے وہ پاؤں پٹختا ہوا واپس آ گیا۔ جب اُس کا غصہ کچھ فرو ہوا تو اُسے خیال آیا کہ میں کیا کہہ آیا ہوں۔ اُسے فکر لاحق ہوئی کہ اب صوبے دار انتقامی کارروائی ضرور کرے گا۔ اسی پریشانی میں وہ بی بی کے پاس پہنچا اور اُن سے اپنی بپتا بیان کی۔ بی بی نے تمام ماجرا سن کے ایک ٹھیکری منگوائی۔ ٹھیکری پر انھوں نے کوئلے سے ایک نقشہ کھینچا اور یہ حدود قائم کیں۔ شاہ جہاں پور، کھٹار اور پرایاں۔ پھر انھوں نے وہ ٹھیکری قتلن خاں کے حوالے کر دی اور کہا کہ "تمھارے منہ سے جو نکلا تھا وہ ہو گیا۔ ہم نے اس نقشے کے مطابق تمھیں صوبے دار مقرر کیا۔" قتلن خاں وہ ٹھیکری سر پر باندھ کے شاہ جہاں پور پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اُسے لکھنؤ طلب کیا گیا ہے۔ وہ لکھنؤ گیا۔ وہاں ایک نئی خبر نے اُس کا استقبال کیا کہ مذکورہ صوبے دار برخاست کر دیا گیا ہے۔ نیز بی بی غریب نواز کی پیشین گوئی کے مطابق قتلن خاں کو کسی ظاہری سبب کے بغیر صوبے داری کا فرمان مل گیا۔ ــ وہ وہاں سے نقارے ڈنکے اور خلعت کے ساتھ واپس ہوا۔

ایک بار بی بی غریب نواز کو معلوم ہوا کہ کوئی اصلاحیت اور صاحبِ استعداد شخص شہر میں آیا ہوا ہے۔ بی بی کو اُس سے ملنے کا شوق ہوا۔ انھوں نے ایک روز اُسے اپنے گھر مدعو کیا۔ کہتے ہیں اُس روز دال اور چاول دھلوا کے انھوں نے اپنی نظر کی حرارت سے کھچڑی پکائی۔ کھچڑی کے صرف تین لقمے رکابی میں رکھ کے مہمان کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ مہمان نے رکابی کی طرف دیکھا اور ہنس کے کہنے لگا: "ان تین لقموں میں میرا کیا بھلا ہوگا؟"

اُس سے کہا گیا کہ "تناول تو کیجیے۔" اُس نے ایک لقمہ اٹھا کے کھا لیا مگر دوسرا لقمہ اٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ ایک ہی لقمے میں ایسا سیر اور مست ہوا کہ پھر اُس سے کچھ نہیں کھایا گیا۔ بی بی غریب نواز نے لوگوں سے کہا کہ "اسے تو ایک لقمے کا تحمل بھی نہیں ہوا۔ تم اسی استعداد کی تعریف کرتے تھے؟"

۱۲۲۴ھ میں بی بی غریب نواز اپنے شوہر کے ساتھ سرہند میں مقیم تھیں۔ کشف و کرامت اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی سال اُن کے ہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی۔ بچہ اعزا کو دکھانے کے لیے ماں کی آغوش سے باہر لایا گیا تو لوگ اُسے دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔ اُس کے چہرے پہ نور چھلکتا ہوا تھا۔ وہ بے حد تنک اور لطیف تھا۔ ہر شخص اُسے گود میں لینے کے لیے لپکنے لگا۔ بچے کا نام راز احمد رکھا گیا اور عرفیت نیاز احمد تجویز ہوئی۔

بی بی غریب نواز کے عقیدت مند یقیناً متجسس ہوں گے کہ اُن کی اولاد کیسی نکلے گی؟ اپنی ماں پر جائے گی یا دنیا کی عام روش پر چلے گی؟ اس سوال کے جواب کا انھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ نیاز احمد نے بہت جلد اُن کا تجسس دور کر دیا اور شیر خواری ہی میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ کس ماں کا بیٹا ہے۔ وہ اپنی تمام تر طفلانہ معصومیت کے باوجود اشیا و مظاہر کا نہایت انہماک سے مشاہدہ کرتا تھا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی طاری رہتی تھی اور ہر وقت ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ عام بچوں کی مائیں اپنے بچوں سے نیاز کا موازنہ کرتیں تو حیرت سے دانتوں میں انگلیاں دبا لیتیں۔ اُن کی حیرت حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ بی بی غریب نواز نہیں تھیں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ نیاز کون ہے؟ نیاز کا عرفان صرف اُس کی ماں کو تھا۔ صرف وہ جانتی تھیں کہ یہ وہ لڑکا ہے جس کی وہ منتظر تھیں اور جسے اُن کے مرشد نے پیدائش سے قبل قبول کر لیا تھا۔ اسی قبولیت کے پیشِ نظر بی بی نے نیاز پر مکمل توجہ کی اور اس کے باطنی جوہر صیقل کیے اور اُس کی عمر صرف ساڑھے چار ماہ کی تھی کہ اُسے عالمِ مثال میں خاتونِ جنت سیدہ فاطمہ زہرا کے حوالے کر دیا۔

شیر خواری کا زمانہ گزرا تو نیاز اپنے ہم عمر بچوں کے برعکس عبادتوں اور ابتدائی طریقوں میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ اپنی عبادت گزار ماں کو صبح و شام روز و شب سخت مجاہدوں اور مراقبوں میں دیکھتا تھا۔ اُس کی ماں اکثر بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتیں۔ جمادات کی طرح بے جان، بے حس و حرکت۔ کبھی اُن پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ کبھی اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ کبھی وہ زمین سے سر ٹکا کے گرد و پیش سے یکسر بے خبر ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر نیاز انھیں کبھی منتشر نہیں کرتا تھا۔ پھر جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اُس نے اپنی ماں کی تقلید شروع کر دی۔ وہ اُن کے قریب بیٹھ کے خود بھی گم ہو جاتا۔ لوگ ماں اور بیٹے کو دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، لوگوں کی حیرت عادت میں بدلتی رہی۔ نیاز ایک انتہائی سعادت مند اور متجسس لڑکا ثابت ہوا۔ یہ شوق اور جستجو دیکھ کے بہت چھوٹی عمر میں اُسے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ خاندان کا دستور تھا کہ اس موقع پر وقت کا شیخ یا خاندان کا بزرگ بچے کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر اجازت دیتا تھا۔ چنانچہ نیاز کے نانا مولانا اسعید الدین نے اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا اور نیاز نے مدرسے جانا شروع کر دیا۔ وہ ایک خادم کے ساتھ مدرسے جاتا تھا۔ اب اُس کی عمر سات برس کی تھی۔ ایک روز مدرسے جاتے وقت اُس نے راستے میں ایک طوائف کو دیکھا۔ اُس روز سے اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور غذا ترک ہو گئی۔ بی بی غریب نواز سخت متفکر ہوئیں کہ اچانک بچے کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ انھوں نے خادم سے نیاز کی اس تبدیلی کا سبب پوچھا۔ خادم خود حیران اور لاعلم تھا۔ اُس نے کہا: "بی بی! میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ یہ معلوم میاں کو کیا ہو گیا ہے۔ البتہ چند روز پیشتر ایک طوائف میاں کی نظر پڑ گئی تھی۔ یہ شاید اُسی روز سے ایسے ہیں۔" بی بی غریب نواز کا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے اسی وقت آدمی بھیج کے اس طوائف کو بلوایا۔ طوائف کے لیے عجیب

ات تھی وہ آتے ہی قدم بوس ہو گئی۔

بی بی غریب نواز نے تبسم کر کے اس سے کہا: "مبارک ہو، میرا بچہ تمھارا گرویدہ ہو گیا ہے۔ میں اسے بلاتی ہوں، وہ آئے تو فوراً اسے گود میں لے لینا۔" نیاز باہر تھا۔ بی بی غریب نواز نے اسے گھر میں بلایا۔ وہ آ گیا۔ اس نے جیسے ہی طوائف کو دیکھا اس پر غشی طاری ہو گئی۔ بی بی غریب نواز نے طوائف کو اشارہ کیا۔ طوائف نے نیاز کو اپنی گود میں لے لیا۔ پھر بی بی غریب نواز نے کچھ دیر توجہ کی تب کہیں نیاز کی غشی ختم ہوئی۔ اس کے بعد نیاز کے دل سے طوائف کی محبت قطعی محو ہو گئی۔ اسے عمر بھر اس کا خیال تک نہیں آیا۔ نیاز کو افاقہ ہو گیا تو بی بی نے طوائف کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "اب تم جا سکتی ہو۔" مگر بی بی کے اس کمال فیض نے طوائف کی دنیا ہی بدل کے رکھ دی تھی۔ وہ اسی وقت تائب ہوئی اور ایک عابدہ و زاہدہ کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگی۔

بی بی غریب نواز نے اپنی خادمہ نورن کی شادی کر دی تھی اور نورن ان کے گھر میں رہنے کے بجائے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ ایک روز اس نے اپنے ہاں نیاز کی دعوت کی۔ مکان کی جس کوٹھری میں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا اسے نورن نے اپنے تصرف کے ذریعے ظاہری مطعومات کے علاوہ باطنی نعمتوں سے بھی بھر دیا تھا۔ مقررہ وقت پر نیاز اس کی کوٹھری میں داخل ہوا تو اس پر محویت طاری ہو گئی۔ وہ دیر تک بے ہوش رہا۔ نورن اسے پنکھا جھلتی رہی۔ کوئی دو گھنٹے بعد اسے افاقہ ہوا۔ اس نے تحسینی نگاہ سے نورن کو دیکھا اور کہا: "کیوں نہ ہو آخر بی بی کی دیکھنے والی ہو۔"

چند روز بعد نیاز نے نورن کو اپنے گھر مدعو کیا۔ دعوت کے روز نورن جب نیاز کے مکان میں داخل ہوئی تو اسے بھی اسی حالت سے دوچار ہونا پڑا اور دیر تک بے ہوش رہی اور جب اسے ہوش آیا تو وہ بے اختیار نیاز کی بلائیں لینے لگی۔ یہ نو عمر نیاز کی پہلی کرامت تھی۔

کرامتوں اور فضیلتوں کے راستے پر نیاز کا تیز رفتار سفر جاری رہا۔ تعلیم کے حصول میں اس نے غیر معمولی ذہانت اور لگن کا ثبوت دیا۔ وہ بہت جلد اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کے آگے نکل گیا اور صرف پندرہ برس کی عمر میں اس نے ظاہری علوم کی تکمیل کر لی۔ استاد نے اسے فارغ التحصیل قرار دے کے اس کے سر پر فضیلت کی دستار باندھنے کا اعلان کیا مگر نیاز نے دستار بندھوانے سے انکار کر دیا۔ اس نے تین روز تک شہر بھر کے علما کی دعوت کی اور ایک عام جلسہ منعقد کیا۔ جلسے میں اس نے علما سے عرض کیا: "بزرگو! میری خواہش ہے کہ مجھ سے ہر علم اور ہر فن کے متعلق چیدہ چیدہ سوالات کیے جائیں۔ اگر میں ان کے کامل جوابات دے سکوں تو مجھے دستار بندی کا مستحق سمجھا جائے ورنہ نہیں۔"

شہر کے عالموں کے لیے یہ ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ انھوں نے اشتیاق اور دلچسپی کی نظر سے اس لڑکے کو دیکھا پھر وہ مسلسل تین روز تک نیاز سے مختلف علوم پر سوالات کرتے رہے۔ نیاز نے حیران کن حد تک ہر سوال کا مکمل جواب دیا۔ آخر سارے علما نے متفق ہو کے کہا: "بے شک نیاز کا دعوا بجا ہے۔ یہ ہر علم



امام مالک درس دیتے وقت ایک زانو سے بیٹھے رہتے تھے جب تک درس ختم نہ ہو جاتا وہ زانو نہیں بدلتے تھے۔ ایک بار درس کے وقت انھیں بچھو نے دس گیارہ بار ڈنک مارا مگر انھوں نے زانو نہیں بدلا اور کسی کو یہ بات محسوس نہیں ہونے دی۔ درس کے بعد ان کے چہرے کی رنگت میں تغیر پیدا ہو گیا اور پسینہ چھوٹنے لگا۔ لوگوں نے ان سے اس کا سبب پوچھا۔ انھوں نے بچھو کا تذکرہ کیا اور کہا کہ "یہ برداشت صرف علم کی تعظیم کے باعث تھی۔"

حیدر آباد کے بدر الدین نظامی کی بیاض سے

میں مہارت تام رکھتا ہے۔ اس عمر میں یہ فضیلت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ یہ ہر اعتبار سے دستار بندی کا مستحق ہے۔" تمام علما نے دستار پھیلا کے اپنے اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ مبارک باد کے غلغلے میں استاد نے نیاز کے سر پر دستار باندھی اس طرح نیاز طلبہ کی صف سے نکل کے علما کی صف میں شامل ہو گیا۔

نیاز کے آبا و اجداد بخارا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی سلطنت کا مرکزی مقام اندی جان تھا۔ سب سے پہلے نیاز کے آبائی بزرگ آیت اللہ علوی نے تاج و تخت کو ترک کیا اور فقیری کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ اندی جان سے ملتان آئے۔ کچھ مدت بعد ان کے پوتے عظمت اللہ علوی ملتان سے سرہند آ گئے۔ عظمت اللہ علوی نیاز کے دادا تھے۔ پھر نیاز کے والد شاہ رحمت اللہ [illegible]ھ میں سرہند سے دلی منتقل ہو گئے۔ دلی میں انھیں اپنے فضل و کمال کے باعث قابل رشک عروج حاصل ہوا اور بادشاہ کے دربار تک ان کی رسائی ہو گئی۔ بادشاہ نے ان کی علمی فضیلت کے پیش نظر ان کے لیے قضا کا منصب تجویز کیا۔ انھیں یہ منصب قبول کرنے سے انکار تھا مگر جب بہت اصرار کیا گیا تو انھوں نے عہدۂ قضا قبول کر لیا۔

دلی کے ایک مشہور بزرگ قطب وقت مولانا فخر الدین محمد نے نیاز کے نانا سے فیض حاصل کیا تھا۔ وہ ایک صاحب کمال ولی تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ شاہ عالم ثانی کو ان سے گہری عقیدت تھی۔ ولی عہد اکبر شاہ ثانی ان کے مریدوں میں شامل تھا۔ مولانا فخر ہر جمعرات کو اپنی مرشد زادی نیاز کی والدہ کے دروازے پر جاتے تھے۔ وہ وہاں پہنچ کے دہلیز چومتے اور اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ اس عمل سے ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور وہ اسی عالم میں نیاز کی والدہ کو سلام بھیجتے۔ ایک دفعہ نیاز کی والدہ نے ان سے کہا: "حضرت! آپ میرے بچے کو اپنے حلقے میں لے لیجیے اور اسے تعلیم فرمائیے۔"

مولانا فخر نے مرشد زادی کے حکم پر نیاز کو اپنی تربیت میں لے لیا لیکن اس سے بیعت نہیں لی۔ نیاز نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس سے بیعت لے لیں۔ مولانا نے جواب دیا: "بھلا میں اپنے مرشد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ کیسے رکھ دوں؟ مدرسے کے آغاز میں تمھارے نانا نے تمھارے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا، وہ میرے مرشد تھے۔"

اس دلیل سے نیاز کی سیری نہیں ہوئی۔ اس نے اصرار کیا: "حضرت! وہ میری صغر سنی کا واقعہ ہے، اسے سند قرار نہیں دینا چاہیے۔"

مولانا فخر نے شفقت سے کہا: "شیخ نے تمھیں قبول کر لیا۔ اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔"

تب شاہ نیاز نے بے قراری سے کہا: "لیکن بیعت کے بغیر فیض نہیں ہوتا۔ اگر آپ مجھ سے بیعت نہیں لیتے تو مجھے اجازت دیجیے میں رخصت ہوتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے فیض پہنچنا میرا مقسوم نہیں ہے۔" وہ دل برداشتہ ہو گیا۔

مولانا فخر نے اس کی یہ حالت دیکھی تو شفقت سے بولے: "میاں! تمھارا اصرار سر آنکھوں پر، ضد کرتے ہو تو آؤ، طالبِ بیعت اختیار کرو۔" انھوں نے نیاز کو اپنا دامن تھما کے اس سے بیعت لی۔ مرشد کے ادب کا پاس تھا اس لیے انھوں نے نیاز کے ہاتھ پر ہاتھ نہیں رکھا اور نیاز کو کبھی اپنا مرید اور خلیفہ نہیں کہا۔ وہ اُسے ہمیشہ میاں کہتے تھے اور اس سے ایک شاگرد کے طور پر کوئی خدمت لینا نہیں چاہتے تھے مگر نیاز استاد کا حق کسی دوسرے شاگرد کو ہرگز نہیں بھرنے دیتا تھا۔

پورے بارہ برس تک نیاز نے مولانا فخر سے استفادہ کیا۔ انھوں نے اپنے تمام ظاہری علوم اور باطنی روشنیاں منتقل کیں اور ۱۱۸۵ھ میں فارغ التحصیل قرار دے کے اپنی سند اور خلعت سے نوازا۔ اُن کا خرقہ بھوج کی چھال کے ریشوں سے بُنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انھیں اپنا صاحبِ سجادہ اور مسند نشیں نامزد کیا اور اپنے سر سے دستار اُتار کے اُن کے سر پر رکھ دی۔ یہ نیاز کی زندگی کا سب سے اہم موڑ تھا، جس سے اس کی حیثیت میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی۔ وہ شاگرد کے بجائے استاد ہو گیا اور اسے نیاز کے بجائے شاہ نیاز احمد کے نام سے پکارا جانے لگا۔

شاہ نیاز احمد تعلیم مکمل کر کے مولانا فخر کے مدرسے میں درس دینے لگے۔ اُن کی تدریس کا انداز نرالا اور دل نشین تھا۔ لوگ اپنے بچوں کو نہایت افتخار سے اُن کے سپرد کرنے لگے۔ ان کے درس کے حلقے میں اپنے وقت کے بعض باکمال لوگ بھی شامل تھے مثلاً غلام ہمدانی مصحفیؔ۔ مصحفی کا نام جس نے سنا ہے اُس نے اُس کے یہ شعر بھی سنے ہوں گے ؎

چل بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پر اے نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھیرے گا

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مصحفی نے شاہ نیاز سے علم الصرف کی مشہور کتاب "میزان" پڑھی تھی۔

تدریس کے علاوہ شاہ نیاز نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ وہ تصوف اور طریقت کے مسائل پر متعدد کتب اور رسائل کا افادہ کرتے اور شعر بھی کہتے تھے۔ وہ ایک نغز گو شاعر تھے۔ سوز و گداز، متصوفانہ آہنگ اور فکر کے عناصر سے اُن کا کلام مرصع ہے۔ وہ اپنے شعروں سے غافل سینوں میں عشق کا الاؤ بھڑکاتے تھے۔

اردو کے جن شاعروں کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے ان میں مرزا مظہر جانِ جاناں بھی ہیں۔ شاعر اور صوفی جانِ جاناں شاہ نیاز کے دور سے تعلق رکھتے تھے۔ کون ہے جو اُن کے ان اشعار سے سماعت آشنا نہیں ؎

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں ہم کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

الٰہی مت کسو کے پیش یہ رنجِ انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

اُسے آتش کہو، شرارہ کہو، کوکب کہو
مت اس ستارۂ سوختہ کو دل کہا کرو

ایک بار لوگوں نے اُن کے سامنے شاہ نیاز کا ذکر چھیڑا۔ کسی نے کہا: "اُن کی نگاہوں سے شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اکثر لوگ ان شعاعوں کی تاب نہیں لا سکتے۔" مرزا مظہر نے قدرے بے اعتنائی سے کہا: "ہو گا، برسات میں ایسے بے شمار پودے اُگتے ہیں جن کے پتے چمکتے ہیں، جو ہونہار نظر آتے ہیں مگر آخر میں صرف وہ ایک آدھ درخت باقی رہ جاتے ہیں، بیشتر پودے عارضی بہار دکھا کے پژمردہ ہو جاتے ہیں۔"

مرزا مظہر کی یہ بات شدہ شدہ مولانا فخر کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے شاگرد کے باطنی وصال کے شاہد تھے اور اس کا مستقبل اُن کے سامنے آئینہ تھا۔ وہ اپنے شاگرد کو مستقبل کے قطبِ عالم اور مدارِ اعظم کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں مرزا مظہر کا یہ تبصرہ بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے جوش میں کہا: "صاحبزادہ دیدۂ بینا سے نظارہ کرو، یہ وہ پودا نہیں ہے جو عارضی بہار دکھا کے پژمردہ ہو جائے۔" اسی روز سے انھوں نے حکم دیا کہ آئندہ سے میاں کے شجرے کی ابتدا میں یہ آیت شامل کی جائے "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ"۔

یہ آیت شاہ نیاز کے لیے شیخ کی طرف سے خاص عطیہ تھی۔ اسے صرف نیازی خاندان کے شجروں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شاہ نیاز کے خلفا کے شجروں میں بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔

انھی دنوں کا ذکر ہے، ایک شام شاہ نیاز پر ایک غیر معمولی حالت طاری ہوئی اور دیر تک طاری رہی۔ جب اعتدال کی حالت دوبارہ قائم ہوئی تو ایک فی البدیہہ غزل اُن کی زبان پر جاری ہو گئی۔ غزل کا مطلع یہ ہے:

امشب آنست کہ زد حلقہ جہاں بر درِ ما
تیرِ نورِ خدا کرد طلوع از برِ ما

یہ غزل شاہ نیاز نے اپنے استاد مولانا فخر کو سنائی۔ وہ بہت مسرور ہوئے۔ دوسرے روز دلی میں ایک عرس تھا۔ مولانا فخر شاہ نیاز کو وہاں لے گئے۔ اتفاق سے مرزا مظہر جانِ جاناں بھی عرس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ عرس کی محفل ختم ہوئی تو شاہ نیاز نے مولانا فخر سے پوچھا: "پیر و مرشد! اگر مناسب ہو اور اجازت ہو تو کل کی غزل مرزا صاحب قبلہ کو دکھائی جائے؟"

مولانا فخر نے جواب دیا: "بہت مناسب میاں، مگر انھیں اپنی زبان سے سنائیے گا۔"

شاہ نیاز وہاں سے اُٹھ کے مرزا مظہر کے پاس پہنچے اور سلام کر کے اُن کے قریب بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب بہت اخلاق سے پیش آئے۔ شاہ نیاز نے انکسار سے کہا: "قبلہ و کعبہ! کل کچھ اشعار ہو گئے ہیں۔ اگر حکم ہو تو اصلاح کی غرض سے پیش کروں؟" مرزا مظہر نے اشعار سننے کے لیے اشتیاق ظاہر کیا۔ شاہ نیاز نے غزل شروع کی اور مطلع کا پہلا مصرع پڑھا ؎

امشب آنست کہ زد حلقہ جہاں بر درِ ما

مرزا مظہر کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اُن کا سر جھک کے زمین کے قریب پہنچ گیا پھر انھوں نے سر اُٹھایا تو شاہ نیاز نے دوسرا مصرع پڑھا۔ ؎

تیز نورِ خدا کرد طلوع از برِ ما

مرزا مظہر کی دوبارہ وہی کیفیت ہوئی۔ وہ وجد کی حالت سے دوچار ہو گئے۔ شاہ نیاز نے غزل جاری رکھی۔ ہر ایک شعر نے مرزا مظہر پر وجد طاری کر دیا۔ ان پر بے خودی طاری ہو گئی۔ غزل کے اختتام پر انھوں نے کچھ دیر سکوت کر کے کہا: "میاں! مجھے معاف کر دیجیے گا۔ آپ کے متعلق میری زبان سے جو الفاظ نکلے تھے مجھے ان پر اپنے آپ سے ہمیشہ شکوہ رہے گا۔ آپ اپنی غزل کا پرچہ مجھے دے دیجیے۔ میں گھر جا کے غور سے اسے دیکھوں گا۔" شاہ نیاز نے غزل کا پرچہ انھیں دے دیا۔ دوسرے روز مرزا مظہر نے غزل کا پرچہ واپس بھیج دیا۔ شاہ نیاز نے اسے کھول کے دیکھا۔ کوئی شعر ایسا نہیں تھا جس پر مرزا مظہر جیسے بے بدل شاعر نے صاد نہ بنایا ہو۔

شاہ نیاز نے ظاہری علوم کی ترویج کے ساتھ باطنی علوم کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ اب طالبین کی ایک بڑی تعداد اُن کے گرد حلقہ بنائے بیٹھی رہتی تھی اور ان کے کمال کا شہرہ پوری دلی کے گلی کوچوں میں گونج رہا تھا۔ اُن کا یہ اثر دیکھ کر بعض تنگ دل بے وجہ ان سے حسد کرنے لگے۔ حاسدوں کی طرف سے مشہور کر دیا گیا کہ شاہ نیاز کسی سے بیعت نہیں ہیں۔ بے پیرے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ باکمال کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں شاہ نیاز تک پہنچیں تو انھیں سخت ملال ہوا۔ ان کے اُستاد مولانا فخر ان دنوں گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ جب وہ کئی روز بعد حجرے سے برآمد ہوئے تو خدام اور شاہ نیاز نے انھیں تعظیم دی۔ اس دن مولانا فخر بہت شاداں نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ انھوں نے شاہ نیاز کی طرف دیکھ کے والہانہ کہا: "میاں! مبارک ہو۔ آج شب پیرِ پیراں شیخ عبدالقادر جیلانی نے تمھیں اپنے ہاتھ پر بیعت کیا ہے۔ انھوں نے مجھے ایک صورت دکھائی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ میری خاص اولاد میں سے ہیں۔ میں انھیں بھیج رہا ہوں۔ ان کے ہاتھ پر نیاز سے ظاہری بیعت کی تکمیل کرا دینا۔"

شاہ نیاز نے جوشِ عقیدت اور شدتِ مسرت میں اُستاد کے قدم چوم لیے۔ اُس روز سے انھیں اور اُن کے محبوں اور حلقہ بگوشوں کو پیراں پیر کے فرستادہ بزرگ کا انتظار رہنے لگا۔ ہر شخص کی نگاہ دروازے پر لگی رہتی اور وہ بام جاتے لگے۔ مہمان کے استقبال کی خوب تیاریاں ہوئیں۔ شاہ نیاز کی ریاضت، عبادت اور مجاہدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا مگر آنے والا نہیں آیا۔ شاہ نیاز کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ — اسی طرح کوئی چھ مہینے گزر گئے۔ ایک صبح مولانا فخرالدین اپنے حجرے سے برآمد ہوئے۔ انھوں نے قریب قریب چیخ کے کہا: "تم سب کہاں گم ہو۔ پیراں پیر فرماتے ہیں کہ ہمارے بھیجے ہوئے فرزند کو دلی پہنچے ہوئے کئی روز گزر گئے اور تم ان سے غافل ہو۔ جاؤ اپنے مہمان کو کہیں تلاش کر کے انھیں عزت اور احترام سے لاؤ۔"

جو جس حالت میں تھا، اسی حالت میں پیراں پیر کے فرزند کی تلاش

اور شیر نے اپنے خادم کو ایک تحریر دے کے ہدایت کر دی تھی کہ "جب تم مجھے سخت تکلیف میں دیکھو تو یہ تحریر دے دیا کرو۔" تحریر یہ تھی۔ "دو رنگ جاؤ، تم خدا نہیں ہو، تم ایک جسم ہو۔ وہ وقت دور نہیں جب اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو کھا جائے گا اور پھر یہ مٹی اور کیڑوں کی نذر ہو جائے گا۔"

میں نکل گیا۔ شاہ نیاز کی بے قراری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بار بار دروازے پر جاتے اور صحن کے چکر لگاتے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک شخص نے آ کے بتایا: "جامع مسجد میں بغداد سے آئے ہوئے ایک بزرگ مقیم ہیں۔ میں ان کی زیارت کر کے آ رہا ہوں۔" مولانا فخر نے بے تابی سے بزرگ کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں سوالات کیے۔ جواب میں اُس شخص نے تفصیل سے بغدادی بزرگ کا حلیہ بیان کیا۔ یہ حلیہ ہو بہو وہی تھا جو مولانا فخر نے خواب میں دیکھا تھا۔ مولانا فخر پر وارفتگی چھا گئی اور شاہ نیاز کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ اُن کا سر جھک گیا اور رخسار تمتمانے لگے۔ مولانا فخر نے اسی وقت شیرینی منگوائی اور شیرینی کا خوان اپنے سر پر اُٹھا لیا۔ خلفا اور خدام نے کہا: "حضور! خوان ہمیں دے دیجیے، یہ ہمارا کام ہے" مگر مولانا فخر نے ان کی یہ بات نہ مانی۔ ان کے سر پر شیرینی کا خوان تھا اور دوسرے ہاتھ میں شاہ نیاز کا ہاتھ۔ اس شان سے وہ جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کس نے دیکھا، کس نے نہیں دیکھا، راہ گیروں پر کیا ردِ عمل ہوا، کس نے منہ دوسری طرف کر لیا اور کون درویشوں کے اس قافلے میں شامل ہو گیا، اس کی شاہ نیاز اور مولانا فخرالدین اور اُن کے ساتھیوں کو کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ جس طرح والہانہ انداز میں روانہ ہوئے تھے، اسی طرح جامع مسجد میں داخل ہو گئے۔ مسجد کے درمیانی در میں ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ مولانا فخر نے انھیں دیکھتے ہی بلند آواز میں کہا: "وہی بالکل وہی، نورانی بخشنے والے کی قسم مجھے یہی صورت دکھائی گئی تھی۔"

نو وارد بزرگ کا نام سید عبداللہ بغدادی تھا۔ انھوں نے شاہ نیاز پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ کہا: "میری نگاہیں تم ہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے جو صورت دکھائی گئی تھی وہ یہی ہے اور میں تمھارے ہی لیے ہند کی سرزمین پر بھیجا گیا ہوں۔"

مولانا فخر نے شیرینی کا خوان سید عبداللہ بغدادی کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے مسجد کی محراب میں دوگانہ ادا کیا اور شاہ نیاز سے بیعت لی۔ پھر انھوں نے انھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ انھوں نے مختلف اشغال کے علاوہ شاہ نیاز کو ذکرِ نفی و اثبات کے ۵۲ طریقے تعلیم کیے اور عربی میں تحریر شدہ ایک خلافت نامہ بھی دیا۔ یہ خلافت نامہ مطبع نامی میرٹھ کی کتاب کرامات نظامیہ میں چھ صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں چھپی تھی۔

سید عبداللہ بغدادی نے شاہ نیاز کو اتنا عزیز رکھا کہ ان سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور انھیں اپنی دستارِ فضیلت سے نوازا۔ یہ دستار نیازی خانقاہ بریلی میں

اب تک محفوظ ہے۔ سید عبداللہ بغدادی کی بیٹی چند ہی سال شاہ نیاز کی رفاقت میں رہیں پھر بے اولاد انتقال کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد شاہ نیاز نے دوسرا نکاح کر لیا۔ دوسری بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور شیر خوارگی ہی کے زمانے میں چل بسی پھر دو لڑکے پیدا ہوئے۔ بڑے لڑکے کا نام نظام الدین حسین اور چھوٹے کا نصیر الدین حسین رکھا گیا۔

◆

شاہ نیاز کا سفر جاری رہا۔ انھیں قادری سلسلے کے علاوہ چشتی نظامی صابری، سہروردی اور نقش بندی سلسلوں سے بھی فیض پہنچا۔ عرفان و آگہی اور عبادت و ریاضت کے طویل مرحلوں کے بعد مولانا فخر الدین نے انھیں خلافت کا خرقہ عطا کیا اور روہیل کھنڈ کے صدر مقام بریلی کو مسکن بنانے کی ہدایت کی۔ شاہ نیاز نے بریلی پہنچ کے خواجہ قطب نامی محلے میں سکونت اختیار کر لی۔ محلے کے مکینوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ کوئی شخص وارد ہوا ہے۔ وہ ان کے پاس اشتیاق سے پہنچنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ اشتیاق محبت و عقیدت میں بدل گیا۔ شاہ نیاز کے بیان میں سحر تھا۔ صداقت میں ہمیشہ سحر ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا نیا مسکن ایک عظیم الشان علمی و روحانی مرکز بن گیا اور درویشوں کے قافلے جوق در جوق ادھر کا رخ کرنے لگے۔ ان کے مریدین اور عقیدت مندوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ شہر بریلی کے گرد و نواح کے لوگ بھی ان کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور یہ حلقہ روہیل کھنڈ اور اودھ تک وسیع ہو گیا۔ جو بھی زمانے کا ستایا ہوا آتا، کہتے ہیں کہ یہاں آ کے اپنے دکھ بھول جاتا اور شاہ نیاز سے نیکیاں اور سعادتیں سمیٹ کے واپس جاتا۔ اس وقت سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ دور دراز کے سفر سے تھکے ہوئے لوگ آتے تھے اور کسی کا دل واپس جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ ان کا عالمانہ درس سننے اور ان کے پاس بیٹھے رہنے کی جستجو ہی میں رہتے تھے۔ فقیری و درویشی، رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ جب بہت وسیع ہو گیا تو شاہ نیاز کو دور دراز مقامات پہ اپنے خلفا مقرر کرنے پڑے۔

شاہ نیاز کے ایک مرید تھے مخدوم عبدالشہید۔ وہ جب باطنی علوم کی تحصیل کر چکے تو شاہ نیاز نے انھیں اپنا خلیفہ بنا کے یارقند جانے کا حکم دیا۔ مخدوم عبدالشہید کے مختصر قافلے میں ان کے علاوہ تین افراد شامل تھے۔ سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ اثنائے سفر میں یہ قافلہ ملتان پہنچا تو آسمان آگ برسا رہا تھا۔ آفتاب کی تپش سے بچنے کے لیے وہ گھوڑوں سے اترے اور ایک درخت کے سائے میں سستانے لگے۔ مخدوم عبدالشہید پہ پیاس کا غلبہ تھا۔ انھوں نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ درخت کے سامنے ایک ٹیکری تھی۔ ٹیکری پہ ایک خس پوش مکان بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک شخص آنکھیں بند کیے مستغرق بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا مٹکا اور مٹی کا کوزہ رکھا تھا۔ مخدوم عبدالشہید ٹیکری پہ پہنچے اور مستغرق شخص کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اس شخص نے آنکھیں کھول کے انھیں دیکھا۔ مخدوم عبدالشہید نے کہا: "بابا! میں بہت پیاسا ہوں، اجازت ہو تو پانی پی لوں؟" اس شخص نے خندہ پیشانی سے اجازت دے دی۔ مخدوم نے مٹی کے پیالے میں پانی پیا اور پیالہ دھو کے مٹکے پہ رکھ دیا۔

اس شخص کا نام خوشی شاہ تھا۔ خوشی شاہ کو مخدوم کا یہ ادب اور قرینہ بہت پسند آیا۔ اس نے باطن کی نگاہ سے مخدوم کے پرت کھولے اور ان میں فقر کا کامل مادہ پایا۔ خوشی شاہ نے انھیں اپنے قریب بلا کے کہا: "ہم نے تجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔"

مخدوم جھجک کے بولے: "بابا! اس عزت افزائی کے لیے متشکر ہوں لیکن مجبور ہوں۔ میں پہلے ہی کسی کا غلام ہو چکا ہوں اور اب اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔"

خوشی شاہ نے بے نیازی سے کہا: "کچھ بھی ہو، اب تو ہم نے تجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔"

مخدوم نے پھر جسارت کی: "بابا! میں آپ کا بیٹا بننے کا اختیار نہیں رکھتا۔ میں پہلے ہی کسی کا غلام ہو چکا ہوں۔" خوشی شاہ کے تیور بدل گئے۔ اس نے مخدوم عبدالشہید پہ ایک تیز نگاہ ڈالی۔ مخدوم کے بن مو سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ شدید اذیت میں مبتلا ہو گئے پھر بھی انھوں نے اپنے انکار میں ترمیم نہیں کی بلکہ کہا: "اس سے کیا ہوتا ہے، میں جس کا ہو چکا ہوں اسی کا رہوں گا۔ اس پہ ایسی ہزار جانیں قربان۔"

خوشی شاہ نے غصے میں ڈنڈا اٹھایا: "اچھا، تو جن کا ذکر کر رہا ہے میں ابھی ان کو تمام کیے دیتا ہوں۔" وہ زمین پہ ڈنڈے برسانے لگا۔

مخدوم عبدالشہید پہ غفلت طاری ہو گئی۔ غفلت کے عالم میں انھوں نے دیکھا کہ شاہ نیاز بے جان حالت میں ایک پلنگ پہ لیٹے ہوئے ہیں۔ ان کی بیوی ان کے سرہانے کھڑی رو رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کے مخدوم عبدالشہید کی تمام خوابیدہ حسیں بیدار ہو گئیں۔ وہ اسی اذیت کی حالت میں فوراً ٹیکری سے اتر کے گھوڑے پہ سوار ہوئے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو وہیں رکنے کی ہدایت کی اور گھوڑا بریلی کے راستے پہ ڈال دیا۔ وہ شب و روز یکساں رفتار سے سفر کرتے ہوئے بریلی پہنچے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ شاہ نیاز اپنے مکان میں استراحت کر رہے تھے۔ مخدوم نے اپنے آنے کی خبر بھجوائی۔ شاہ نیاز مکان سے برآمد ہوئے۔ انھوں نے مخدوم کو دیکھتے ہی تبسم کر کے کہا: "خانقاہ میں ٹھہرو۔" مخدوم خانقاہ میں چلے گئے۔ شاہ نیاز معمول کے مطابق ظہر کے وقت خانقاہ آئے۔ مخدوم اضطراب و بے چینی کے عالم میں ان کے منتظر تھے۔ انھوں نے بڑھ کے مرشد کے قدم پکڑ لیے۔ شاہ نیاز نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہا: "ہم دوپہر کے وقت پلنگ پہ اس نیند میں تھے جسے عرفا کی اصطلاح میں سونا کہتے ہیں۔ اچانک کچھ کھٹکا ہوا۔ پلنگ کے برابر ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ ہم نے آنکھیں کھولیں تو ہمیں تخت پہ اپنی والدۂ گرامی بی بی غریب نواز کی مثالی صورت نظر آئی۔ ان کے ہاتھ میں جوتا تھا۔ انھوں نے ہم سے کہا: تم آرام کرو۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ خوشی شاہ بدتمیز تھا، میں نے اسے مار کے بھگا دیا ہے۔" مخدوم عبدالشہید اب بھی اذیت میں مبتلا تھے۔ شاہ نیاز نے ان پہ توجہ کی۔ ان کے جسم کی سوزش اور تکلیف نصف کم ہو گئی۔

مخدوم نے کہا: "حضور! ابھی برداشت کے قابل افاقہ نہیں ہوا ہے۔" شاہ نیاز نے انھیں ایک عمل بتا کے کہا کہ "دوبارہ غوثی شاہ کے پاس جاؤ اور یہ عمل کرو، باقی سوزش وہیں ختم ہوگی۔"

مخدوم دوبارہ بریلی سے روانہ ہوئے اور ایک طویل سفر طے کر کے ملتان پہنچے جب انھوں نے ٹیکری کے سامنے پہنچ کے غوثی شاہ کو دیکھا تو اچانک ان کے جسم میں پہلے جیسی سوزش پھر عود کر آئی۔ مخدوم تڑپنے لگے۔ تڑپتے تڑپتے انھوں نے نہایت دقت سے زمین پر ایک صورت کھینچی اور غوثی شاہ سے کہا: "دیکھو یہ تمھاری صورت ہے۔" یہ کہہ کے انھوں نے اس کی صورت پر جوتے مارنے شروع کر دیے۔ غوثی شاہ کے استعجال کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنا ڈنڈا اٹھا کے متواتر زمین پر مارنا شروع کر دیا۔ وہ مسلسل زمین پر ڈنڈا مارتا اور مخدوم پر آتشیں نگاہ ڈالتا رہا مگر اس بار مخدوم کی سوزش بڑھنے کے بجائے کم ہوتی گئی یہاں تک کہ بالکل ختم ہو گئی۔ مخدوم غافل ہو گئے۔ انھیں بہت تھکن کے بعد آرام کا موقع ملا تھا۔ غفلت میں انھوں نے ایک وسیع میدان دیکھا۔ میدان میں ایک جانب متعدد تخت بچھے ہوئے تھے اور دوسری جانب کہیں چٹائی کا ٹکڑا تھا، کہیں مرگ چھالا۔ پھر جلد ہی وہاں جبہ و دستار والے متشرع بزرگ جوق در جوق آنے لگے اور اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے تختوں پر بیٹھنے لگے تا آں کہ ایک تخت کے سوا کوئی تخت خالی نہیں رہا اور پورا میدان بھر گیا۔ پھر آسمان سے ایک سفید روشنی نمودار ہوئی اور خالی تخت پر آ کے ٹھہر گئی۔ یہ تخت ایک ممتاز مقام پر تھا۔ اس پر مخدوم کو حضرت علی جلوہ افروز نظر آئے۔ ان کے تخت کے ایک گوشے پر شاہ نیاز کھڑے تھے اور حضرت علی کے قریب ہو کر کچھ کہہ رہے تھے۔ مخدوم عبدالرشید یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ دفعتہ ان کے پاس دو آدمی آئے۔ وہ انھیں ہاتھ پکڑ کے حضرت علی کے تخت کے نزدیک لے گئے اور انھوں نے ان کا سر تخت سے لگا دیا۔ پھر حضرت علی کی آواز گونجی: "غوثی شاہ کہاں ہے؟"

فی الفور غوثی شاہ کو حاضر کیا گیا۔ غوثی شاہ تخت کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ حضرت علی نے اسے تیز نگاہ سے دیکھا اور ترشی سے کہا: "کیوں غوثی شاہ! یہ کیا حرکت تھی؟" انھوں نے شاہ نیاز کی طرف انگشت شہادت اٹھائی: "کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ ہم نے اسے اپنا فرزند بنایا ہے؟" غوثی شاہ کانپ رہا تھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ حضرت علی نے اسے تنبیہ کی: "آیندہ ایسی جسارت نہ کرنا۔" انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کے مخدوم عبدالرشید کا ہاتھ تھاما اور اسے شاہ نیاز کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر مجمع سے مخاطب ہو کے شاہ نیاز کے بارے میں کہا: "اسے ہم نے اپنا فرزند بنایا ہے۔ بہتر ہے کہ آیندہ کسی سے کوئی حرکت سرزد نہ ہو۔" تمام مجمع دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ حضرت علی کا تخت بلند ہو کے آسمان کی طرف پرواز کر گیا۔ شاہ نیاز بھی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ اسی وقت مخدوم عبدالرشید ہوشیار ہو گئے۔ انھوں نے دوبارہ غوثی شاہ کی صورت پر جوتا مارا۔

غوثی شاہ چلا اٹھا: "میاں! میاں! اب تو فیصلہ ہو گیا۔ اب یہ کیا کر رہے ہو؟"

مخدوم نے کہا: "اس عمل کا حکم مجھے شیخ نے دیا تھا۔ ابھی ممانعت نہیں ہوئی ہے۔ مجبور ہوں۔"

غوثی شاہ خاموش ہو گیا۔ معاً وہاں شاہ نیاز کی مثالی صورت نمودار ہوئی۔ انھوں نے مخدوم کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا: "بس کرو، اپنی ولایت میں جاؤ۔"

مخدوم نے ہاتھ روک لیا اور غوثی شاہ کے قریب جا کے دست بوسی کی اور کہا: "بابا! میں فقرا کا خادم ہوں مگر کیا کروں پہلے ہی غلام ہو چکا ہوں۔"

وہ وہاں سے اپنے ساتھیوں کو لے کے روانہ ہوئے اور کابل پہنچے۔ یہاں انھیں ایک مجذوب ملا۔ اس نے انھیں شاباشی دی: "خوب بیٹے کا ہاتھ باپ کے ہاتھ میں دیا۔" پھر جب وہ بخارا پہنچے تو وہاں بھی انھیں ایک مجذوب ملا۔ اس نے بھی انھیں شاباشی دی اور کہا: "خوب بیٹے کا ہاتھ باپ کے ہاتھ میں دیا۔"

شاہ نیاز اپنے خلفا کی ہر طرح نگرانی اور رہنمائی کرتے تھے۔ انھوں نے خلفا کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ رات کے وقت شہر سے باہر جا کے ذکر کیا کریں۔ ایک بار خلفا نے باہم مشورت کی کہ اس قدر دور جانا کیا ضروری ہے، کیوں نہ قریبی باغ میں بیٹھ کے ذکر کیا جائے۔ چنانچہ وہ دو تین راتوں تک باغ میں جا کے ذکر کرتے رہے۔ ان کے ذکر کے اثر سے باغ کی عجیب حالت ہو گئی۔ پتے اور میوے خشک ہو ہو کے درختوں سے گرنے لگے۔ مالی باغ کی یہ حالت دیکھ کے سراسیمہ اور حیرت زدہ تھا۔ اس نے باغ کے مالک سے کہا کہ "یہ خزاں کا موسم نہیں ہے مگر پیڑ خالی ہوئے جا رہے ہیں۔ اس کی کوئی زمینی اور سماوی وجہ تو معلوم نہیں ہوتی البتہ دو تین روز سے میاں صاحب کی خانقاہ کے لوگ رات کو آ کے ذکر کرتے رہتے ہیں۔" باغ کا مالک شاہ نیاز کے پاس پہنچا۔ اس نے ان سے کہا کہ "آپ کے مریدوں نے میرا باغ اجاڑ دیا ہے۔" شاہ نیاز کو خیال ہوا کہ شاید ان کے کسی مرید نے کوئی میوہ توڑا ہوگا مگر باغ کے مالک کی تفصیل سن کے وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے خلفا کو بلا کے سرزنش کی اور کہا: "ہم تمھیں جنگل جانے کی ہدایت بے سبب نہیں کرتے۔ تم نے باغ کا حشر دیکھ لیا؟ اگر تم اپنا ذکر جنگل میں جا کے نہ کرو تو واللہ شہر کا شہر ویران ہو جائے۔ آیندہ اس کا خیال رکھنا۔"

انھی دنوں شاہ نیاز ایک بار اپنے طلبہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے گیندے کا ایک پودا تھا۔ انھوں نے طلبہ سے دریافت کیا: "تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنے خیال کی طاقت سے یہ پودا خشک کر دے؟"

شرف الدین نامی ایک طالب علم نے عرض کیا: "حضور! حکم ہو تو خادم کوشش کرے۔" شاہ نیاز نے اسے حکم دے دیا۔ شرف الدین نے اپنی توجہ دی۔ دیکھتے دیکھتے وہ پودا خشک ہو گیا۔ شاہ نیاز نے اس کی بہت تعریف کی۔ دو تین منٹ بعد انھوں نے اسی خشک پودے کے بارے میں اپنے طلبہ سے کہا: "تم میں کوئی ایسا ہے جو اسے دوبارہ سرسبز کر دے؟"

اسد اللہ بیگ نامی ایک طالب علم نے اٹھ کر کہا: "اجازت ہو تو میں ہمت کروں؟" شاہ نیاز نے اسے اجازت دے دی۔ اسد اللہ بیگ نے پودے پر صرف ایک نگاہ ڈالی۔ پودا چشم زدن میں دوبارہ سرسبز ہو گیا گویا کبھی خشک ہی نہ ہوا تھا۔

شاہ نیاز نے اپنے طلبہ کو کڑی ریاضت اور نفس کشی کا عادی بنا دیا تھا۔ ان

کھانا دن بھر میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے اور رات بھر صرف چائے پر گزارا کرتے تھے۔ معمولاً اپنے اشغال و اوراد و وظائف میں شام سے مصروف ہوتے تو صبح کرتے۔

ایک بار شاہ نیاز کے پاس ایک خستہ حال شخص پہنچا۔ اس نے ان سے کہا کہ میں الن شاہ نامی مجذوب کا معتقد اور خدمت گزار ہوں۔ وہ محلہ بہاری پور میں رہتے ہیں۔ میں ہر وقت ان کی خدمت کرتا ہوں مگر مجھے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں ہر چند ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر توجہ کریں لیکن وہ توجہ نہیں فرماتے۔ آج مجھے ان کی خدمت سے ذرا فرصت ملی ہے تو مجبور ہو کے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اب میں آپ سے بیعت کا درخواست گزار ہوں۔

شاہ نیاز نے اس کی درخواست قبول نہیں کی اور اس سے کہا۔ "تم الن شاہ ہی سے کہو۔"

الن شاہ کو شاہ نیاز کی شہرت و مقبولیت پہلے ہی ناگوار تھی۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ ان کا معتقد شاہ نیاز کا مرید ہونے گیا تھا تو وہ بہت چراغ پا ہوئے۔ انھوں نے اپنے معتقد سے باز پرس کی کہ وہ شاہ نیاز کے پاس کیوں گیا تھا اور اسے زد و کوب کیا۔ اس کا جسم لہولہان ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد الن شاہ نے شاہ نیاز کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کیا۔ اس وقت شاہ نیاز مسجد میں تھے۔ الن شاہ نے کوشش کی کہ اپنے تصرف سے مسجد لوٹ دیں۔ چنانچہ انھوں نے تصرف کیا۔ مسجد کے شمالی حصے میں جنبش ہوئی۔ شاہ نیاز نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ پھر اسے کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اس کے بعد شاہ نیاز نے وہیں سے الن شاہ کی طرف ایک لات ماری۔ الن شاہ کے پاؤں میں شدت سے درد اٹھا اور بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا۔ انھوں نے کراہ کے ایک چیخ ماری اور بلند آواز میں شاہ نیاز سے معافی مانگ کے قصور معاف کرایا۔ شاہ نیاز نے فراخ دلی سے انھیں معاف کر دیا۔

اسی طرح ایک بار شاہ نیاز خانقاہ میں بیٹھے تھے۔ وہ مراقبے میں جھکے ہوئے تھے۔ خلفا اور معتقدین ادھر ادھر موجود تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ کوئی صاحب شاہ نیاز سے ملنے آتے ہیں، پھر رک جاتے ہیں، دوبارہ دروازے تک آتے ہیں اور پھر رک جاتے ہیں۔ لوگ چاہتے تھے کہ ان سے اس کی وجہ پوچھیں مگر دفعتاً شاہ نیاز نے آنکھیں کھول کے دروازے کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا۔ "تشریف لائیے۔"

وہ صاحب جھجکتے جھجکتے آگے بڑھے۔ شاہ نیاز نے خانقاہ کے نصف صحن تک جا کے ان کے ہاتھ چومے اور انھیں اپنی مسند کے قریب لا کے بٹھایا۔ پھر صندوقچہ منگا کے اس میں جو کچھ بھی تھا پیسے، دونیاں، چونیاں اور روپے سب کچھ لا کے انھیں پیش کر دیا۔ وہ صاحب دعائیں دیتے دیتے رخصت ہو گئے تو ان کے جانے کے بعد غلام حسین نامی ایک شخص نے شاہ نیاز سے پوچھا۔ "یہ کون بزرگ تھے جن کی آپ نے ایسی تعظیم فرمائی اور خود صحن کے نصف تک کیوں پہنچایا؟"

شاہ نیاز نے مسکرا کے کہا۔ "تم انھیں نہیں پہچانتے؟ یہ میرے استاد مولانا فخرالدین کی ڈولی اٹھانے والے کہار تھے۔"

ایک روز دو آدمی خانقاہ آئے۔ انھوں نے شاہ نیاز کو وعظ کی ایک مجلس

> **بیشک** اور عقل مند وہ ہے جو اپنا نفس مار ڈالے اور اس کی فضول خواہشیں پوری نہ کرے۔ بے وقوف وہ ہے جو اپنا نفس زندہ رکھے اور اس کی ہر خواہش پوری کرنا ضروری سمجھے۔"

میں مدعو کیا۔ شاہ نیاز نے کچھ دیر توقف کے بعد ان کی دعوت قبول کر لی اور مجلس میں گئے۔ وہاں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور جلسہ گاہ کے صدر میں جگہ دی گئی۔ ابھی وعظ شروع نہیں ہوا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ جمع ہو رہے تھے۔ شاہ نیاز نے دیکھا کہ خاندانِ نبوت کے ایک سید بھی موجود بیٹھے ہیں۔ حال خستہ تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ پاجامہ بھی پورا نہیں تھا۔ گھٹنے کھلے ہوئے تھے۔ وہ سب کے آخر میں بیٹھے تھے۔ شاہ نیاز انھیں دیکھ کے بے چین ہو گئے اور اٹھ کے ان کے قریب پہنچے۔ وہاں پہنچ کے انھوں نے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور با ادب کھڑے ہو کے لوگوں سے کہا۔ "سب گواہ رہیں، اگر قیامت کے دن مجھ سے سوال ہوا کہ کیا تو وعظ کی مجلس میں گیا تھا تو میں یہی عرض کروں گا کہ وہاں گیا تھا اور میں نے وہاں بھی تیرے رسول کی اولاد کے قدموں پر سر رکھا تھا۔" یہ کہہ کے شاہ نیاز نے سید کو سلام کیا اور مجلس سے چلے گئے۔

بریلی میں چودھری بسنت رائے نامی ایک صاحب رہتے تھے۔ ان کے اعزا میں سے کوئی شخص استسقا کے مرض میں مبتلا تھا۔ بہتیرے وید اور طبیب یکے بعد دیگرے اس کا علاج کر چکے تھے لیکن اس کے مرض میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ آخر اس سلسلے میں شاہ نیاز سے رجوع کیا گیا۔ شاہ نیاز وہاں پہنچے۔ انھوں نے مریض کو دیکھا۔ اس کا پیٹ اور جسم پھولا ہوا تھا اور اس کی صورت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قریب مرگ ہے۔ شاہ نیاز نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے کہا۔ "مریض کی چارپائی کے برابر زمین پر لیٹ جاؤ۔" وہ شخص زمین پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس کا پیٹ اور جسم پھولنا شروع ہو گیا۔ دوسری طرف مریض کے پیٹ اور جسم میں تخفیف ہونے لگی۔ جو حالت مریض کی تھی وہ دوسرے شخص کی ہو گئی۔ مریض دیکھتے ہی دیکھتے تندرست ہو گیا۔ اسے بھوک لگنے لگی اور اس نے کھانا طلب کیا۔ معلوم ہوا کہ اس کے لیے جو پرہیزی کھانا پکتا ہے وہ ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔ شاہ نیاز نے حکم دیا۔ "گھر میں جو کچھ بھی تیار ہو، لے آؤ۔" مریض کے لیے آلو کی ترکاری اور روٹی آگئی۔ اس نے صحت مندوں کی طرح سیر ہو کے کھانا کھایا۔ شاہ نیاز نے دوسرے شخص کے بارے میں ہدایت دی کہ "اسے خانقاہ پہنچا دیا جائے۔" یہ ہدایت دے کے وہ لوٹ آئے۔ دوسرا شخص چارپائی پر ڈال کے خانقاہ لایا گیا۔ وہ ایک روز بعد وہ بھی صحت مند ہو گیا۔

ایک مرتبہ چودھری بسنت رائے کے یہاں بچے سب بیمار ہو گئے۔ پھر شاہ نیاز کو دعوت دی گئی۔ جب شاہ نیاز وہاں گئے تو ان کی نظر ایک دیوار پر پڑی جس میں ایک طاق تھا۔ طاق پر زری کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ شاہ نیاز نے چودھری بسنت رائے سے دریافت کیا۔ "پردے کے پیچھے کیا ہے؟"

چودھری نے ادب سے جواب دیا۔ "کرشن جی کی تصویر ہے۔ بچوں کی وجہ سے بے احتیاطی اور بے ادبی ہوتی ہے اس لیے اسے ڈھک دیا ہے۔ درشن کرنا ہوتا ہے

تو پردہ اُٹھا کے کر لیتے ہیں۔" شاہ نیاز نے حکم دیا "پردہ اُٹھا دو۔"

پردہ اُٹھا دیا گیا۔ شاہ نیاز تصویر کی طرف متوجہ ہو کے بولے "کرشن جی! جس گھر میں آپ ہوں وہاں کا یہ حال؟" یہ کہہ کے شاہ نیاز خانقاہ واپس آگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چودھری بسنت لال کے گھر سے بیماری رخصت ہو گئی۔ کسی نے شاہ نیاز سے اس واقعے کے متعلق استفسار کیا کہ "یہ کیا بات تھی؟" شاہ نیاز نے جواب دیا "میری کرشن جی سے بہت ملاقات ہے۔ کرشن جی بڑے کامل بزرگ تھے۔"

درون شہر اور بیرون شہر شاہ نیاز کی عظمت میں کسی کو کلام نہیں تھا۔ اُن کی خانقاہ نے غریب اور مظلوم تشنہ کام اور نامراد لوگوں کی پناہ گاہ کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ مشہور ہے کہ اُن کی خانقاہ میں ہمیشہ ہر طرح کے سوالیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ایک دنیا کے قلب و دماغ پر زمانے نے بڑا بوجھ ڈالا تھا۔ وہ سرگروہ جنھیں روشنی کی تلاش تھی اور روشنی نہیں ملتی تھی وہ مختلف سمتوں سے بریلی کی خاک چھانتے تھے۔ بریلی والے نیاز بے نیاز کے کوچے میں جمع ہو جاتے تھے۔ بریلی والا اُن کی آنکھوں میں علم کا سُرمہ بھر دیتا تھا اور اُن کے سینوں میں حق کی شراب انڈیل دیتا تھا اور اُن کی سمت ایک جانب کر دیتا تھا۔

اُسی زمانے میں بریلی کے کچھ لوگوں نے قوالی کا اہتمام کیا اور طے کیا کہ شہر کے صوفیوں کو محفل میں بلا کے اُن کا تماشا دیکھا جائے۔ شاہ نیاز کے سوا قریب قریب تمام صوفیوں کو رقعے بھیجے گئے۔ مدعو صوفیا کو کسی ذریعے سے یہ علم ہو گیا کہ انھیں مذاق بنانے اور مضحکہ اُڑانے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ صوفیا بہت بے چین ہوئے۔ وہ سب مل کے شاہ نیاز کے پاس پہنچے اور اُن سے درخواست کی "حضرت! یہ ہم سب کی عزت آبرو کا معاملہ ہے۔ قوالی میں آپ کو بھی چلنا ہوگا۔"

شاہ نیاز نے انکار کیا، عذر کیے لیکن صوفی مصر ہو گئے۔ آخر شاہ نیاز کو قوالی میں شرکت کا وعدہ کرنا پڑا۔ مقررہ روز وہ صوفیا اور فقرا کی معیت میں وہاں پہنچے۔ جلسہ گاہ میں فرش بچھا ہوا تھا۔ فرش پر صوفی اور قوال بیٹھے ہوئے تھے۔ فرش کے کناروں پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر صاحب دار اُس کے مصاحب اور دوسرے شہری بیٹھے تھے۔ شاہ نیاز ڈولی سے اُتر کے جلسہ گاہ میں داخل ہوئے اور فرش پر صوفیوں کے قریب بیٹھ گئے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ شاہ نیاز کو دیکھ کے آپس میں ہنس ہنس کے اشارے کرنے لگے کہ یہ سب مخول ہیں۔ خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ قوالی شروع ہو گئی۔ قوال جھوم جھوم کے غزلیں سنانے لگے۔ رفتہ رفتہ محفل شباب پر آگئی۔ سکے برسنے لگے مگر صوفیا وجد و حال سے دانستہ گریز کر رہے تھے۔ معاً ایک غزل میں یہ شعر آیا۔

بر نقش زمیں بود زماں بود علی بود — تا صورت پیوند جہاں بود علی بود

قوالوں نے اس شعر کی تکرار کی۔ شاہ نیاز پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ اُن کے گلے میں ایک رومال بندھا ہوا تھا۔ انھوں نے وہ رومال کھول کے اپنا سیدھا ہاتھ ہلایا۔ اُن کا ہاتھ جس سمت میں چلا تھا، اُس سمت میں جتنے لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ یکبارگی فرش پر گر کے لوٹنے لگے۔ اُن کے سر ٹوٹ پھوٹ گئے۔ صاحب محفل کا بھائی اُس وقت باہر تھا۔ اُسے اس واقعے کی اطلاع پہنچائی گئی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور شاہ نیاز کے قدموں پر سر رکھ کے گڑگڑانے لگا "قبلہ قصور ہو گیا۔ قبلہ خطا ہو گئی معاف کر دیجیے۔" شاہ نیاز نے پانی منگا کے دم کیا اور لوٹتے ہوئے لوگوں کے منہ پر چھڑکوایا اور تھوڑا تھوڑا انھیں پلوا دیا۔ وہ سب ہوش میں آگئے۔ اُن لوگوں کی خجالت اور ندامت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ نظریں نہیں اُٹھ رہی تھیں۔ قوالی تھک چکی تھی۔ شاہ نیاز نے واپس جانے کے لیے ڈولی طلب کی۔ صاحب محفل کے بھائی نے مؤدبانہ کہا "حضور! پالکی حاضر ہے۔" اُس کے اصرار پر شاہ نیاز پالکی میں سوار ہو گئے اُس نے خود پالکی کو کندھا دیا اور منع کرنے کے باوجود بازار چوک تک پالکی کو کندھا دیے ہوئے آیا۔ وہاں سے شاہ نیاز نے زبردستی اُسے واپس کیا۔ دوسرے روز وہ شخص حاضر ہوا۔ اُس نے شاہ نیاز کو موضع گوٹیا نذر میں پیش کیا۔ موضع گوٹیا اب تک نیازی خانقاہ سے متعلق ہے۔

شاہ نیاز کے دو خلفا تھے فخر عالم اور میر سمیع۔ فخر عالم اکثر خانقاہ کے برج میں جا کے اوراد و وظائف پڑھتے تھے۔ ایک روز میر سمیع پر کوئی واردات طاری ہونے والی تھی۔ وہ لوگوں سے چھپنے کے لیے جنوبی برج میں جا کے بیٹھ گئے۔ فخر عالم کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ لوٹے تو انھوں نے اپنی جگہ اپنے پیر بھائی کو بیٹھے ہوئے دیکھ کے کہا "میر صاحب! براہِ کرم میری جگہ چھوڑ دیجیے۔"

میر سمیع نے اشارے سے منع کیا کہ "اس وقت ہٹ جاؤ۔" فخر عالم نے دوبارہ اصرار کیا۔ میر سمیع ایسی حالت میں تھے کہ انھیں اُن کا اصرار ناگوار گزرا۔ انھوں نے دوبارہ فخر عالم کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا مگر فخر عالم بدستور اصرار کرتے رہے۔ میر سمیع کو طیش آگیا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کے کہا "اچھا مت ہٹو۔ ہم مسجد ہی اُلٹے دیتے ہیں۔"

یکایک مسجد میں زلزلہ آیا اور وہ برج شق ہو گیا۔ فخر عالم مضطرب ہو کے وہاں سے بھاگے۔ اُن کا جسم ندامت کے عرق سے تر بتر تھا۔ شاہ نیاز بروقت مسجد کے زلزلے سے آگاہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے لوگوں سے کہا "دیکھو یہ کیا معاملہ ہے؟" لوگوں نے فخر عالم کو اُن کے سامنے پیش کر دیا۔ شاہ نیاز نے انھیں سرزنش کی "تم نے میر کو کیوں پریشان کیا؟" یہ کہہ کے وہ خاموش ہو گئے۔ برج بدستور شق رہا۔

اس واقعے کے مشاہدے نے میر سمیع کے بارے میں فخر عالم کی رائے تبدیل کر دی۔ انھوں نے خیال کیا کہ میر سمیع کا اقبال شیخ سے بلند ہو گیا ہے۔ یہ بات اُن کے دل میں بیٹھ گئی۔ وہ میر سمیع کا بے حد احترام کرنے لگے۔ شاہ نیاز کا حقہ بھرنے کی خدمت فخر عالم کے سپرد تھی۔ وہ اکثر اُن کے پاؤں اور جسم بھی دباتے تھے۔ انھیں جو کچھ شغل تعلیم ہوا، اُس پر وہ دیگر طالبوں کی طرح توجہ نہ دیتے نہ محنت کرتے۔ پیر بھائی اکثر اُن سے کہتے "بھائی! اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ جو کچھ ارشاد ہوا ہے اُس کی تعمیل کرو۔"

فخر عالم جواب دیتے "مجھ سے ایک کام ہو سکتا ہے۔ یا شیخ شغل کر والیں یا حقہ بھروالیں۔ بیک وقت دو کام کیسے ممکن ہیں۔"

ایک روز شاہ نیاز نے بھی پوچھا "فخر عالم! کیا حال ہے۔ شغل میں جمعیت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟"

فخر عالم نے راست گوئی سے کام لیا "حضور! نہیں ہوتی۔ مجھ سے ایک کام ہو سکتا ہے۔ حضور کا حقہ بھرتا ہوں بس یہی شغل کافی ہے۔" شاہ نیاز کو اُن کا حقہ بھر

اور سمع بانا بہت پسند تھا۔ وہ اُن سے بہت خوش تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ فخرِ عالم بیعت کریں مگر فخرِ عالم راہِ راست پر نہ آتے تھے۔ شاہ نیاز کو کشف سے معلوم ہو گیا تھا کہ فخرِ عالم سیر سمع کو اُن سے بلند تر مرتبت سمجھنے لگے ہیں چنانچہ وہ ایک روز حویلی گئے اور سمع بالانے کے لیے فخرِ عالم کو بلا لیا۔ شاہ نیاز نے چادر اوڑھ لی اور انھیں سمع بانے کا حکم دیا۔ فخرِ عالم نے سمع بانا شروع کیا مگر وہ یہ دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے کہ اُن کے ہاتھوں میں صرف چادر آتی ہے شاہ نیاز کے جسم سے ہاتھ مس نہیں ہوتے۔ شاہ نیاز خفا ہو کے بولے "آج تم کس طرح دبا رہے ہو؟" فخرِ عالم نے پھر کوشش کی لیکن اس بار بھی اُن کے ہاتھ شاہ نیاز کے جسم سے مس نہیں ہو سکے۔ اس صورتِ حال سے اُن پر واضح ہو گیا کہ جو شخص فنائیت کے اس مقام پر فائز ہو اس کا کوئی مرید اس سے آگے کیسے بڑھ سکتا ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ رہے تھے کہ شاہ نیاز نے انھیں جھڑک دیا۔ "بیٹو۔ تم سے نہیں دبایا جاتا۔" فخرِ عالم تھر تھر کانپنے لگے۔ اُن کا پورا جسم پسینے پسینے ہو گیا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ آواز تک نہ نکل سکی۔

دوسری صبح انھوں نے نہایت لجاجت کے ساتھ شاہ نیاز سے معافی مانگ لی۔ شاہ نیاز نے از سرِ نو اُن پر توجہ کی اور جلد ہی اُن کی دنیا بدل کے رکھ دی پھر شاہ نیاز نے انھیں خلافت کا خرقہ دیا اور لکھنؤ جانے کی ہدایت کی۔ فخرِ عالم نے عذر پیش کیا "حضور! لکھنؤ آج کل پایۂ تخت ہے وہاں بڑے بڑے مشائخ کا مجمع ہے مجھ جاہل کو کون پوچھے گا؟"

شاہ نیاز نے مسکرا کے کہا "جو فقیر کو پوچھے گا وہ تمھیں بھی پوچھے گا البتہ چار نصیحتیں یاد رکھنا۔ جب تک تمھیں کھانا نہ آ جائے ہیں خط نہ لکھنا۔ کسی سے سوال نہ کرنا۔ کسی کے گھر نہ ٹھیرنا اور علیحدہ کرائے کا مکان لے کے قیام کرنا۔" شاہ نیاز نے انھیں زادِ راہ کے طور پر دس پیسے دیے۔

فخرِ عالم بریلی سے پیدل لکھنؤ روانہ ہوئے۔ رات کو جہاں وہ بسیرا کرتے وہاں ناشتے کے طور پر کچھ چنے چبا لیتے۔ اسی طرح سفر کرتے ہوئے وہ لکھنؤ پہنچ گئے۔ اُن کے اثاثے میں کچھ یا مات پیسے بچے تھے۔ انھوں نے شاہ نیاز کی ہدایت کے مطابق ایک مختصر مکان کرائے پر لے لیا پھر ایک چٹائی خریدی، مٹکا، کوزا، مٹی کا ایک چراغ اور تیل لے لیا۔ اس خریداری کے بعد اُن کے پاس کچھ نہیں بچا۔ انھوں نے مکان کے اندر جا کے زنجیر بند کر لی اور گوشہ نشین ہو گئے۔ تین شب و روز اسی عالم میں گزر گئے۔ اس دوران میں پانی بھی ختم ہو گیا اور جسم کی توانائی نے بھی جواب دے دیا۔ یہ پوری مدت فاقے میں گزری تھی لہٰذا اُن پر غشی طاری ہو گئی۔ اتنی سکت بھی نہ رہی کہ نماز کھڑے ہو کر ادا کرتے، تیمم کر لیتے۔

اسی اثنا میں نواب کے وزیر نے ایک خواب دیکھا۔ ایک بزرگ اس سے کہہ رہے ہیں "افسوس ہے تجھ پر، تیری غفلت یہاں تک پہنچ گئی ہے؟ ایک درویش تین روز سے شہر میں آئے ہوئے ہیں۔ وہ بھوکے ہیں، پیاسے ہیں اور بھوک کی شدت نے انھیں بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ کرائے کے مکان میں مقیم ہیں حالانکہ اصولاً وہ مہمان تھے۔ اللہ اللہ ایسی غفلت اور یہ دعویٰ کہ میں سلطنت کے قابل ہوں؟"

نواب فوراً خواب سے بیدار ہو گیا اس نے اپنے وزیر کو بلا کے خواب

مطابق درویش اور مکان کی شان درستی کی اور اُسے حکم دیا کہ طعام خانے سے اُن کے لیے ایک خوان لے جاؤ اور ہماری طرف سے دست بستہ عرض کرو کہ ہم سے بڑی نادانی ہوئی، ہمیں معاف کر دیا جائے۔ صبح ہم قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گے۔"

ساتھ ہی وزیر کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ درویش موصوف کو دونوں وقت کھانا مہیا کیا جائے اور مالک مکان سے مل کے مکان کا بیع نامہ اُن کے نام لکھوا دیا جائے۔ مکان کی قیمت شاہی خزانے سے ادا کی جائے اور زیب و زینت، آرائش و آسائش کا تمام سامان شاہی فراش خانے سے بھیجا جائے۔

وزیر انواع و اقسام کے کھانے لے کے اُس محلے میں پہنچا۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فلاں مکان ایک گوشہ نشین حضرت پردیسی نے کرائے پر لیا تھا۔ ہم نے انھیں مکان میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر وہ مکان سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ اس وقت سے مکان کے دروازے کھلے ہی نہیں۔ نہ معلوم وہ اندر ہیں یا چلے گئے۔ وزیر اور اُس کے ساتھی مکان کے دروازے پر پہنچے۔ صدائیں لگائی گئیں، دستکیں دی گئیں مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اندر سے کوئی جواب بھی نہیں آیا۔ مجبوراً کواڑ تڑوا دیے گئے۔ وزیر اپنے رفیقوں، محافظوں اور خادموں کے ساتھ مکان میں داخل ہوا۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ خادموں نے فوراً روشنی کا انتظام کر دیا۔ وزیر نے روشنی میں دیکھا کہ ایک شخص چارپائی پہ چادر اوڑھے بے حس و حرکت لیٹا ہے۔ اُسے گمان ہوا کہ کہیں اُن کا انتقال ہو گیا ہو۔ وہ قریب گیا۔ سانس چل رہی تھی۔ اُس نے کھانے کا خوان چارپائی کے قریب رکھ دیا اور ادب سے آواز دی: "حضرت، آنکھیں کھولیے، آپ کے گھر مہمان آئے ہیں۔"

دو بار تکرار کرنا پڑا۔ فخرِ عالم نے آنکھیں کھول دیں اور نقاہت سے پوچھا: "کون ہو؟"

وزیر نے اپنا تعارف کرا کے کہا: "نواب صاحب نے آپ کے حضور معذرت کی ہے۔ بدقسمتی سے آپ کی تشریف آوری اُن کے علم میں نہیں آسکی تھی۔ صبح وہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گے۔ آج سے جناب کے لیے دونوں وقت کا کھانا شاہی طعام خانے سے آیا کرے گا۔"

فخرِ عالم نے دریافت کیا: "اس وقت کھانے میں کیا لائے ہو؟"

وزیر نے مودبانہ جواب دیا: "ہر قسم کا کھانا حاضر ہے۔"

فخرِ عالم اُٹھتے ہوئے بولے: "لاؤ۔" وزیر نے گردن جھکا کے فرنی کا پیالہ بڑھا دیا۔ فخرِ عالم نے دو انگل فرنی زبان سے چھوائی اور کہا: "بس لے جاؤ۔"

وزیر نے کہا: "حضرت، خوان کی واپسی شاہی آداب کے خلاف ہے۔ کھانے کے علاوہ جن نقرئی ظروف میں کھانا آیا ہے، وہ بھی یہیں رہیں گے۔"

فخرِ عالم نے کہا: "میں فقیر ہوں۔ فقیر کے ہاں نقرئی ظروف کا کیا مصرف؟"

وزیر نے تجویز پیش کی: "حضرت، کھانا غریبوں میں تقسیم فرما دیجیے اور ظروف یہیں رکھ لیجیے۔"

فخرِ عالم بولے: "کھانا اور ظروف دونوں انھی میں تقسیم کرا دو۔"

وزیر نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر مکان کے مالک کو بلوا کے اُس سے مکان کا سودا کر لیا اور شاہی فراش خانے سے پردے، مسند تکیے، مسہری، غرض جملہ سامان منگوا کے جہاں لگوا دیا۔ نیز فخرِ عالم کی خدمت کے لیے کچھ آدمی متعین کر کے اُن سے اجازت چاہی۔ جب وہ واپس نواب کے پاس پہنچا تو اُس نے اشتیاق سے فخرِ عالم کے متعلق کچھ جاننا چاہا۔ وزیر نے کہا: "عالم پناہ، وہ درویشی میں کمال رکھتے ہیں۔ میں نے ایسا درویش نہ سنا تھا، نہ دیکھا تھا۔"

محلے میں وزیر کی آمد معمولی بات نہیں تھی۔ فخرِ عالم کی شہرت آناً فاناً شہر بھر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق وہاں پہنچنے لگے۔ نواب کی آمد سے پہلے بہت سے آدمی فخرِ عالم کے توسط سے نیازی سلسلے میں داخل ہو گئے۔ پھر صبح نواب کا جلوس پہنچا۔ نواب نے فخرِ عالم سے اپنی کوتاہی کی معافی چاہی اور نذر پیش کی۔

"فقیر کو کسی شے کی احتیاج نہیں ہے۔" فخرِ عالم نے بے نیازی سے کہا۔

نواب کے ساتھ وزیر بھی تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کے کہا: "حضور کو یقیناً احتیاج نہیں ہے لیکن یہ نذر قبول کر لیجیے۔ مستحقین کے کام آئے گی۔ حضور نے نذر قبول نہ فرمائی تو نواب صاحب کو شکوہ رہے گا۔" وزیر کے اصرار پر فخرِ عالم کو نذر قبول کرنی پڑی۔

اس کے بعد نوبت یہ ہوئی کہ خلائق کے رجوع ہونے کی حد نہ رہی۔ ہجوم چھٹنے کی دیر تھی کہ نواب صاحب بنفسِ نفیس معتقدانہ حاضر ہوتے تھے۔ اکثر درباری مصاحبین اور فوجی ملازم آ آ کے مرید ہونے لگے۔ اسی عالم میں فخرِ عالم نے لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ جب وہ عرضی لکھنے کے قابل ہو گئے تو انھوں نے شاہ نیاز کو لکھنؤ کا مفصل حال لکھا۔

ایک روز نواب کی ایک بیگم نے اُن سے درخواست کی کہ اگر اس کے ہاں نرینہ اولاد ہو جائے تو وہ نیازی خانقاہ کے لیے سوا لاکھ روپے نذر کرے گی۔ فخرِ عالم نے شاہ نیاز کو بیگم کی خواہش اور پیش کش تحریر کر دی اور اپنی طرف سے سفارش کرتے ہوئے لکھا: "بیگم ایک سچی عقیدت مند ہے۔ اس کے ہاں لڑکا ہو گیا تو وہ اپنے قول کے مطابق بریلی حاضر ہوگی اور نیازی حلقے میں داخل ہو جائے گی۔" شاہ نیاز نے جواب بھیجا کہ "تمھاری درخواست منظور ہے۔ اس کے ہاں لڑکا ہو جائے گا لیکن تمھارا یہ خیال درست نہیں ہے کہ وہ عقیدت مند ہے اور بیعت کے حلقے میں شامل ہو جائے گی۔" جواب کے ساتھ شاہ نیاز نے بیگم کو کھلانے کے لیے پان کا ایک بیڑا بھی بھیجا تھا۔ فخرِ عالم نے نواب کو بلوا کے پھر قول قرار لیے کہ ایسا نہ ہو تم مجھے میرے مرشد کے حضور جھوٹا کراؤ۔ بیگم نے پختہ وعدہ کر لیا۔ فخرِ عالم نے پان کا بیڑا اُسے دیا اور کہا: "جاؤ، حضرت قبلہ نے تمھیں لڑکا مرحمت فرمایا۔"

چند ماہ بعد بیگم کے ہاں امید کے آثار نمودار ہوئے۔ اُس نے فخرِ عالم کو شکرگزاری کا پیغام بھجوایا۔ فخرِ عالم نے شاہ نیاز کو عرضی لکھ دی۔ اُنھی دنوں بیگم کی خیر خواہوں نے اُسے مشورہ دیا کہ لکھنؤ میں ایک کامل مجذوب اور بھی موجود ہیں۔ بہتر ہو گا کہ اُن سے رجوع کیجیے۔ اس میں دو فائدے ہیں۔ اُن کی دعا سے بچہ صحیح و سالم پیدا ہو گا اور آپ سوا لاکھ کی نذر دینے سے بھی بچ جائیں گی۔ بیگم اُن کی باتوں میں آ گئی۔ اُس نے مذکورہ مجذوب سے عقیدت مندانہ رابطہ قائم کر کے اپنا مدعا بیان کر

دیا۔ مجذوب نے تائید کی کہ ہاں لڑکا ہی پیدا ہوگا۔ واپسی میں بیگم سے غلطی ہوگئی۔ اس نے فخرِ عالم کو یہ پیغام بھیج دیا کہ میری آرزو آپ کی دعا سے نہیں بلکہ ایک اور مجذوب کی دعا سے پوری ہوگی۔ فخرِ عالم اس پیغام سے بہت دل برداشتہ ہوئے۔ انھوں نے شاہ نیاز کو پوری کیفیت لکھ دی۔ شاہ نیاز کا جواب آیا کہ "خوب بیٹا! ہم نے نیاز دلوائیں اور نام مجذوب کا ہو۔ بیگم سے کہہ دو کہ جسے دلوانا آتا ہے وہ چھنوانا بھی جانتا ہے۔ جاؤ، ہم نے دلایا تھا، ہم نے واپس کرا دیا۔"

چند ہی روز میں نواب بیگم کی اُمید اس طرح معدوم ہوگئی جیسے ظہور ہی میں نہ آئی ہو۔ وہ بہت شرمسار ہوئی۔ معافی کی خواستگار ہوئی لیکن دوبارہ قبولیت حاصل نہ کر سکی۔ فخرِ عالم لکھنؤ میں ایک مدت تک شاہ نیاز کے خلیفہ کی حیثیت سے سرفراز و سربلند رہے۔

★

شاہ نیاز نے اپنے ایک خلیفہ مولوی عبداللطیف خاں کو بخارا کے قریب کسی شہر میں تعین کیا تھا۔ مولوی عبداللطیف کو موسیقی سے والہانہ شغف تھا۔ وہ اکثر راگ سنتے تھے۔ بخارا کے علما نے قاضی کے ذریعے بادشاہ سے شکایت کرائی کہ یہ شخص غیر متشرع ہے، راگ سنتا ہے۔ بادشاہ نے مولوی عبداللطیف کو طلب کیا۔ وہ دربار میں گئے۔ قاضی اور دیگر علما بھی وہاں موجود تھے۔ قاضی نے مولوی عبداللطیف سے سوال کیا: "آپ خلافِ شرع امور کے مرتکب ہیں، گانا سنتے ہیں۔ آپ پر شرعی حد کیوں نہ جاری کی جائے؟"

مولوی عبداللطیف نے ایک حدیث کے حوالے سے تحمل کے ساتھ جواب دیا: "الحمد للہ میں خلافِ شرع امور کا مرتکب نہیں ہوں، اس کا ثبوت موجود ہے۔"

قاضی نے کہا: "جناب! یہ حدیث وضع کی ہوئی ہے، مستند نہیں ہے۔"

مولوی عبداللطیف کو غصہ آگیا۔ انھوں نے تیزی سے کہا: "اچھا میرا اور آپ کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ اگر یہ حدیث موضوع ہے یعنی وضع کی ہوئی ہے تو میری زبان اہل پڑے اور میرا دم نکل جائے اور اگر یہ حدیث موضوع نہیں ہے، صحیح ہے تو تیری زبان اہل پڑے اور تیرا دم نکل جائے۔" مولوی عبداللطیف کا اتنا کہنا تھا کہ قاضی کی زبان اہل پڑی۔ وہ تھرتھرا کے اسی وقت مر گیا۔ علما پر سکتہ طاری ہوگیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مولوی عبداللطیف بادشاہ سے مخاطب ہوئے: "کیوں، تو بھی کچھ کہنا چاہتا ہے کہ میں کچھ کہوں؟"

بادشاہ نے تخت سے اُتر کے مولوی عبداللطیف کے پاؤں پکڑ لیے۔ "جناب! میں کیوں کہتا، جنھوں نے آپ کو زحمت دی انھوں نے خمیازہ بھگت لیا۔" پھر بادشاہ نے بصد احترام انھیں گھوڑے پر سوار کرایا اور گیارہ قدم پیدل مشایعت کر کے انتہائی احترام سے رخصت کیا۔

ایک بار خواجہ نظام الدین اولیا کی اولاد میں سے ایک صاحب نے شاہ نیاز سے کہا: "آپ مجھے اپنی اصل صورت دکھا دیجیے۔" شاہ نیاز نے انکار کرتے ہوئے کہا: "ہماری صورت یہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔" وہ اصرار کرنے لگے کہ "حضرت! میں بہت مدت سے یہ دیکھنے کا خواستگار ہوں، میری فرمائش ضرور پوری کیجیے۔" شاہ نیاز نے سکوت اختیار کر لیا۔ تیسرے روز اتفاق سے شاہ نیاز کے پاس اُن صاحب کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شاہ نیاز نے اُن سے کہا کہ "مکان کا دروازہ بند کر دیجیے۔" وہ صاحب دروازہ بند کرنے گئے مگر جب لوٹے تو انھوں نے شاہ نیاز جیسے تین اشخاص بیٹھے ہوئے دیکھے۔ وہ گھبرا کے کھڑے رہ گئے اور اُن پر شدید ہیبت طاری ہوگئی۔ معاً حجرے میں شاہ نیاز کی آواز گونجی: "آئیے صاحب!" آواز اُبھرتے ہی دو صورتیں غائب ہوگئیں، ایک باقی رہ گئی۔ شاہ نیاز نے اُن سے کہا: "آپ تو مثالی صورت دیکھنے کے متحمل بھی نہیں ہو سکے، اصل صورت دیکھنے کے متحمل کیسے ہوتے؟" وہ صاحب بے حد نادم اور معذرت خواہ ہوئے اور پھر کبھی اصل صورت دیکھنے پر اصرار نہیں کیا۔

اسی طرح ایک بار بخش اللہ نامی خلیفہ نے بھی کچھ لوگوں کی موجودگی میں شاہ نیاز سے یہی فرمائش کی۔ شاہ نیاز نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، اُن کا چہرہ دفعتاً آفتاب کے مانند روشن ہوگیا۔ کسی کو تاب نہ رہی کہ اب بھی دیکھ سکے۔ بخش اللہ کی تو حالت غیر ہوگئی۔ وہ وجد میں آ گئے، بے ہوش ہوگئے۔ جب انھیں افاقہ ہوا تو شاہ نیاز نے تبسم کر کے کہا: "بس بھائی! اس سے زیادہ نہیں۔"

بریلی کے محمد حسین خاں رسالدار اکثر کہتے تھے کہ "میری یہ دوسری زندگی ہے اور یہ شاہ نیاز کے فیضان سے ملی ہے۔ شیر خواری میں مجھے ایک ایسا مرض لاحق ہوا کہ میرے بچنے کی کوئی اُمید نہ رہی۔ جو علاج کیا جاتا اُس کا اُلٹا اثر ہوتا۔ میری حالت بگڑتی چلی گئی اور میں قریب المرگ ہوگیا۔ مجھے پیدائش کے وقت ایک سیدانی نے گود لے لیا تھا کیونکہ میرے والد کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ جب میرا مرض ہر طرح سے ناقابلِ علاج قرار دے دیا گیا تو سیدانی صاحبہ نے اس سلسلے میں حضرت شاہ نیاز سے رجوع کیا۔ انھوں نے ایک تعویذ دیا کہ یہ موم جامہ کر کے بچے کے گلے میں باندھ دو۔ جب بچے کو افاقہ ہو جائے تو تعویذ موم جامے سے نکال کے دھو لو اور دودھ میں ملا کے بچے کو پلا دینا۔ تعویذ میرے گلے میں باندھ دیا گیا۔ اس کے اثر سے مجھے صرف ایک گھنٹے میں شفا ہوگئی۔ اقربا میری شفایابی سے اتنے خوش تھے کہ کسی کو تعویذ دھو کے پلانے کا خیال نہیں آیا۔ میرے نانا نے سیدانی صاحبہ سے کہا: ذرا وہ تعویذ تو دکھائیے۔ سیدانی صاحبہ نے تعویذ انھیں دے دیا۔ انھوں نے اسے کھول کے دیکھا تو ششدر رہ گئے۔ اس میں صرف یہ لکھا تھا: 'آ تمام، آ تمام، آفتاب۔'"

شاہ نیاز پر بسا اوقات عجیب کیفیات طاری ہوتی تھیں۔ ایک بار سماع کی محفل میں انھیں حال آگیا اور انھوں نے قوالوں کے قریب جانے کا قصد کیا۔ ان کے خدام فیض علی بخش اور نبی بخش نے انھیں ہاتھوں پر لے لیا۔ اس وقت ان کے جسم کا وزن گلاب کے پھول کے برابر تھا۔ خدام نے پکارا: "لوگو! دیکھو حضرت کا جسم کیسا ہلکا پھلکا ہے۔" دیگر لوگوں نے بھی انھیں ہاتھوں پہ اٹھا کر خدام کی بات کی تصدیق کی۔ لطف یہ تھا کہ جو بھی انھیں ہاتھ لگاتا، اسی کیفیت میں پہنچ جاتا۔

اسی طرح ایک بار شاہ نیاز کسی کیفیت میں تھے۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اچانک تڑاتڑ ترشح شروع ہوا۔ شاہ نیاز نے نظر اٹھائی۔ ترشح فوراً بند ہوگیا۔ پھر جب تک ان پر کیفیت طاری رہی آسمان پہ پانی ڈکا ہوا معلوم ہوتا رہا۔ جب وہ کیفیت ختم ہوئی تو خوب پانی برسا۔

اسی طرح ایک بار شاہ نیاز نے وجد کی کیفیت میں پانی طلب کیا۔ پانی آگیا۔ انھوں نے اسے پی کے بجائے پھونکا، پانی فوراً دھواں بن کے غائب ہو گیا۔ اس دفعہ انھوں نے تواتر اور تسلسل سے ایک مٹکا پانی پیا۔ اور سارا پانی دھواں ہو کے اُڑ گیا۔

اور جب بریلی میں زبردست آگ لگی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی مکان آگ کی لپیٹ سے نہیں بچا۔ آگ جب خواجہ قطب تک پہنچ گئی تو فوراً شاہ نیاز کو اطلاع دی گئی۔ شاہ نیاز اپنے حجرے سے باہر نکلے۔ قریب ہی گھوڑوں کے ایک سوداگر امیر علی رسالدار رہتے تھے۔ اُن کے گھوڑے چھپر کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ سائیس انھیں نکالنے کے لیے تُلے ہوئے تھے۔ رسالدار نے شاہ نیاز کو دیکھا تو اُن کے چہرے پر اطمینان چھا گیا۔ انھوں نے سائیسوں سے کہا۔ "گھوڑے مت نکالو، اگر حضرت کو انھیں بچانا ہوگا تو بچا لیں گے ورنہ اُن کے سامنے ہی جلنے دو۔" یہ سُن کے شاہ نیاز کی حالت میں تغیّر پیدا ہوا۔ انھوں نے آگ کی طرف نظر اٹھائی۔ شعلے جھکے اور آگ دوسری جانب مڑ گئی۔ چھپر کا ایک کونا جل رہا تھا وہ بھی سرد ہو گیا۔ رسالدار نے شاہ نیاز سے پوچھا کہ "آپ نے آگ بجھانے کے لیے کیا پڑھا تھا؟"

شاہ نیاز نے جواب دیا۔ "پڑھنا کیا تھا، ہم نے سمندر سے ایک چھینٹا مار دیا تھا۔"

★

نیازی سلسلے سے ہر فرقے اور ہر مذہب کے لوگوں نے کسی تخصیص اور امتیاز کے بغیر فیض اٹھایا۔ اردو کے ممتاز ادیب اور صحافی شفیق بریلوی کا بیان ہے کہ "راجا محمود آباد امیر احمد خاں اور اُن کے والد شاہ نیاز بے نیاز سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ راجا امیر احمد خاں کا انتقال ابھی ۱۹۷۳ء میں ہوا ہے۔ جب دیوانِ شاہ نیاز شائع ہوا تو ہم نے اس کا ایک نسخہ راجا صاحب کو پیش کیا۔ انھوں نے دیوان الگ رکھ دیا اور حضرت کا کلام زبانی سنانے لگے۔ انھیں حضرت کا تمام اردو اور فارسی کلام حفظ تھا۔"

شفیق بریلوی نیازی خانقاہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھیں ہمیشہ شاہ نیاز کے خانوادے کا خصوصی التفات حاصل رہا۔ وہ کہتے ہیں: "حضرت شاہ نیاز بے نیاز کے مریدوں میں جنات بھی شامل تھے۔ ہم نے بارہا مشاہدہ کیا کہ چند سفید پوش حضرت کی محفل میں آئے اور کچھ دیر حاضری دے کے اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک بار ان سفید پوشوں سے ہم نے آم کی فرمائش کی۔ آم کا موسم نہیں تھا مگر انھوں نے چشم زدن میں ہمیں آم فراہم کر دیے۔"

شاہ نیاز کا کوئی وقت خلق کی خدمت، ریاضت، عبادات اور مجاہدوں سے خالی نہیں گزرتا تھا۔ وہ رات کو بارہ بجے وضو کر کے تہجد ادا کرتے۔ پھر اپنا مخصوص قلبی وظیفہ پڑھتے۔ وظیفے کے بعد دو ضرب کی تسبیح ادا کرتے پھر ایک پیرزادی امۃ اللہ نامی خاتون انھیں پان کا ایک ٹکڑا دیتیں۔ شاہ نیاز اُسے منہ میں رکھ کے آنکھیں بند کر لیتے اور اشغال میں مستغرق ہو جاتے۔ یہ سلسلہ ابتدائی اشغال سے شروع ہوتا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر ہر شغل کرتے رہتے آخر اپنے مقام میں گم ہو جاتے۔ صبح کی نماز کے وقت وہ سنتیں پڑھ کے کچھ توقف کے بعد فرض ادا کرتے پھر پلنگ پر دراز ہو جاتے۔ آفتاب خوب برآمد ہو جاتا تو بیدار ہو کے حقّہ پیتے۔ پھر وضو کر کے باہر آتے اور مختلف معاملات میں طالبوں کی رہنمائی اور اعانت کرتے۔ ضعیفی میں بھی وہ ضرب نفی و اثبات کا شغل ضرور کرتے تھے۔ یہ شغل انھوں نے کبھی ترک نہیں کیا کیونکہ اسے شیخ کے حکم سے شروع کیا تھا۔ دن ہو یا رات جب بھی وضو ساقط ہوتا فوراً دوبارہ باوضو ہو جاتے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ روزانہ دس بجے دن کو طالبوں کے ساتھ بہاری پور کی مسجد میں پہنچتے اور عشا تک اُن کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہتے۔

عمر کے آخری دور میں شاہ نیاز فالج میں مبتلا تھے۔ اُن کے ایک ہاتھ پر فالج کا اثر تھا۔ اس عارضے کے باعث اُن کے ایک خلیفہ نور حسین بہت ملول رہتے تھے۔ شاہ نیاز نے ایک روز اُن سے کہا کہ "دروازہ بند کر دو۔" نور حسین نے حکم کی تعمیل کی۔ شاہ نیاز نے حکم دیا: "اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔" نور حسین نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ شاہ نیاز نے اپنے مفلوج ہاتھ سے اُن کے ساتھ تن درست لوگوں کی طرح باقاعدہ پنجہ لڑایا پھر چارپائی سے کسی کی اعانت کے بغیر اُٹھ کے چہل قدمی کرنے لگے۔

آخری دور میں شاہ نیاز پر محویت اور استغراق کا شدید غلبہ تھا۔ رات یا دن کسی وقت ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس کے باوجود اُن کی طرف سے مریدوں اور خلفا کو یہ تاکید تھی کہ جس طرح بھی ہو اُن سے نماز ضرور پڑھوائی جائے۔ نماز کے وقت خدام انھیں ہوشیار کرتے۔ وہ بہ وقت اُس عالم سے اِس عالم میں آتے اور نماز کی نیت کرتے ہی پھر ڈوب جاتے۔ لوگ دوبارہ انھیں ہوشیار کرتے۔ اس طرح وہ نماز پڑھنے لگتے۔ مگر نماز پڑھتے پڑھتے پھر وہی کیفیت عود کر آتی۔ کھانے کے اوقات میں خدام اُن سے کہتے: "حضور! کھانا حاضر ہے۔" مگر کوئی شنوائی نہ ہوتی۔ شاہ نیاز روحانی غذا چھوڑ کے دُنیوی غذا کی طرف مائل نہ ہوتے۔ آخر اُن کے سامنے مختلف غزلوں کے ہجریہ، وصلیہ اور عشقیہ اشعار پڑھے جاتے۔ اشعار سن کے اُن کی حالت میں تغیّر پیدا ہوتا اور وہ چونک کے کہتے: "خراب کر دیا۔ خراب کر دیا۔" کبھی کبھی یہ الفاظ بھی اُن کی زبان سے ادا ہوتے۔ "می آیم، می آیم۔"

جانے سے پہلے شاہ نیاز حیرت انگیز طور پر ہوشیار ہو گئے تھے۔ انھوں نے لوگوں سے کہا۔ "اس وقت سختی اور تکلیف بہت ہے۔"

اُن سے پوچھا گیا۔ "حضور! اس کا سبب؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "میں نے باری تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ میرے مریدوں کی جان کنی کی تکلیف مجھ پر نازل کر دی جائے اور انھیں اس سے بری کر دیا جائے۔ یہ دعا مقبول ہو گئی۔ اب اسے بھگت رہا ہوں۔"

وہ مریدوں کی خاطر شدید تکلیف برداشت کر رہے تھے۔ [illegible] بی بی فاطمہ اور حضرت علی اپنے لختِ جگر کی اس حالت سے بے چین [illegible] آخر انھوں نے اپنے فرزند کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ ۶ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ کا واقعہ [illegible] بریلی میں شاہ نیاز کا مزار آج بھی خواص و عوام کا مرجع ہے۔ دنیا سے کوچ کے وقت اُن کی عمر پچانوے سال تھی۔ انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے اس دنیا سے پردہ کیا تھا مگر دلِ بینا آج بھی اُن کے جلووں سے محروم نہیں ہے۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
اقبال

★

اُس روز ہوا ایکسپریس خاصی لیٹ تھی۔ [illegible]

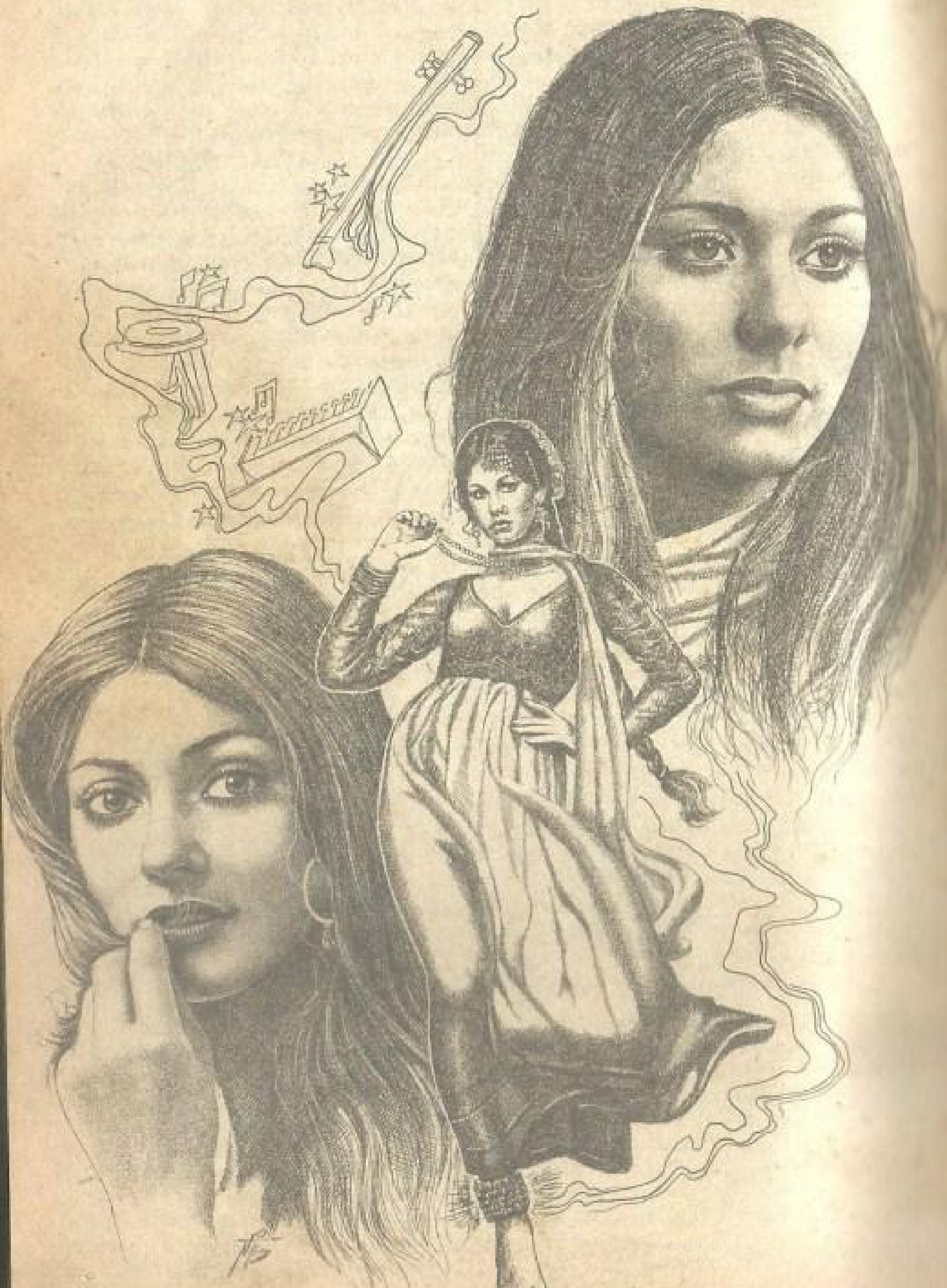
[illegible]

[illegible]



ایک آدم کٹ
عبرتناک سرگزشت
آپ بیتی * جگ بیتی

امنگوں حوصلوں آنسوؤں
اور آہوں کی داستان



[illegible]

ماہر زمان خان

سب کے کپڑے خون سے لال ہو گئے۔

ہر شخص باری باری مجھ سے بے تابانہ بغل گیر ہوتا، زور سے بھینچتا، پھر دوسرا اسے کھینچ کے اس کی جگہ خود لے لیتا۔ سبھوں نے اپنے چاقو آستینوں میں گرا لیے تھے۔ موجیدار کے تمام ساتھیوں کے چاقو جھجل کے ہاتھوں میں پڑے تھے۔ جھجل نے مجھے کانتے کے حوالے کر کے موجیدار کی لاش پر سے چادر ڈال دی۔ چاند میاں کی لاش ننگی پڑی رہی۔ "لالے!" اچانک

جھجل کی بھاری آواز عمارت میں گونجی: "چل او زلالی کے بچے! او قصے! او شرفو! تم سب گھونشی کا ہاتھ بٹاؤ۔ اے گھونگھٹے کیا دیکھتا ہے، ہو وہ کوئی تمھارا غیر نہیں۔ اب سب اپنے ہیں۔ موجی کی لاش پوری عزت سے ٹھکانے لگانا ہے۔ ناک مت کٹوا دینا جھجل کی۔"

جھجل کی آواز پر عمارت میں افراتفری سی مچ گئی۔ موجیدار کی لاش اٹھا کے سائبان کے تخت پر ڈال دی گئی اور چاند میاں کی زمین پر۔ سل کھول کے

بالٹیاں فرش پر بہائی جانے لگیں۔ تجمل نے جمعدار کے ہر آدمی کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور اُسے گلے لگایا۔ اُس نے ایک ایک دو دو جملوں میں سب کچھ کہہ دیا۔ جنھوں نے چاقو تجمل کے قدموں میں ڈال دیے تھے اُن کے چاقو واپس کر دیے گئے۔ "سب ٹھیک ہے؟" تجمل نے بلند آواز میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے اُستاد!" لالے نے جوش میں کہا۔

"چپ بیٹھ بے۔" تجمل نے اُسے جھڑک دیا۔ "ہاں گھوشی! کام ٹھیک طرح کر دے گا یا مجھے یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟"

"نہیں اُستاد! تم جاؤ۔ لالے کے زخم لگا ہے جا کے اس کی مرہم پٹی کراؤ۔ ہم سب نمٹا لیں گے۔" گھوشی کے لہجے میں اداسی شامل تھی۔

"میں بھی چاہتا ہوں گھوشی! بعد میں تجھے شکایت نہ ہو کہ تجمل نے موچی کے ساتھ وہ نہیں کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا۔ تُو جیسا چاہے کر، پر دیکھ دل میں میل ہو تو بات کر لے۔"

"اُستاد! اتنا ذلیل مت کرو۔" گھوشی نے تلخی سے کہا۔ "ہمیں بھی تم جیسے اُستادوں کے پاؤں چاٹتے ایک ٹائم ہو گیا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ موچی ایک بڑی عزت دار اور بات والا آدمی تھا اُستاد! ہم نے چاقو تمھارے قدموں میں ڈال دیے ہیں اور زبان دے دی ہے۔"

تجمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھوشی کی بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا کالنتے کے پاس آیا۔ اُسے اشارہ کیا اور میری گردن میں ہاتھ ڈال کے دروازے میں آگیا۔ باہر کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ کالنتے، تجمل اور میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ باقی لوگ دوسری ٹیکسی میں بیٹھے۔ تجمل کے آدمیوں کی بڑی تعداد جمعدار کے اڈے ہی پر رہ گئی تھی۔ اُن میں بعد میں پہنچنے والے آدمی بھی شامل تھے۔ شاید جس کو خبر ملی کہ تجمل جمعدار کی طرف گیا ہے وہ اسی طرف آ گیا۔

گاڑی گلیوں سے گزرتی رہی۔ تجمل گم سم سا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے بازو کو حرکت دی تو وہ چونکا۔ اُس نے مجھے خود سے قریب کر کے کہا۔ "کیا حال ہے فقیرا؟"

"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" وہ تیز و تند لہجے میں بولا۔ "ہم نے تو چوڑیاں پہن رکھی تھیں لالے! ہم تو مر گئے تھے نا! تُو نے ہمارا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن الفاظ میرے ہونٹوں پہ لرز کے رہ گئے۔ اُس نے خاموشی اختیار کر لی اور ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیا۔

اُسی لمحے کالنتے اگلی نشست پر کسی خیال سے بہک گیا۔ "اُستاد! سالے نوٹے کام خراب نہ کر دیں۔" اُس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کوئی گتے کا بچہ کم اصل نہ نکل جائے۔"

"ابے تو ڈرتا ہے۔ وہاں جو تیری بہن کے یار چھوٹے ہیں وہ کس لیے ہیں؟" تجمل چمک کر بولا۔ "میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ رات بدلی تو نقشہ بدل جائے گا۔" تجمل کے تیور دیکھ کے کالنتے کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں پڑ سکی۔

تنگ و پیچ گلیوں کے چکر کاٹتی ہوئی تجمل کے اڈے پہنچ گئی۔ مکان میں اچھی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ تجمل کے داخلے پر بھن بھناہٹ سی ہوئی۔ تجمل اُن سب کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے ہی میں چلا آیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے کئی اور لوگ بھی اندر آ گئے۔ اُن میں ایک تنومند البتہ پستہ قد ادھیڑ عمر سیاہ رو شخص بھی تھا جس کے چہرے پہ بے شمار نشان تھے۔ "کیا بات ہے۔" اُس نے تجمل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ "آج اُدھر کیسے جانا ہو گیا؟"

تجمل نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے چہرے پہ ایک کڑوی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "کچھ نہیں موتی! لالا جوان ہو کے جیل سے باہر نکلا ہے۔ تجمل اور اس کے آدمیوں کے ساتھ رہ کے یہ رنگ تو آنا ہی چاہیے۔ اس نے چاقو کے کمال ہاتھ دکھائے ہیں سالے نے۔ بجلی تُو نے کہیں نہ دیکھی ہو گی موتی! مجھے تیرا بڑا خیال آیا۔"

"پر ہوا کیا تجمل؟" موتی نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ہونا کیا! لالے نے اُس تیس مار خاں کو ختم کر دیا۔"

"جمعدار کو؟" موتی ہڑبڑا کے بولا۔ "نہیں نہیں۔"

"اب محبت بعد میں کرنا۔" تجمل نے مجھے بستر پہ لٹاتے ہوئے کہا۔ نصیب میاں میرے پائنتی خرم بہار کھڑا تھا۔ تجمل نے اُسے میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ میرا کرتا پھاڑ کے اس نے شانے کا زخم دیکھا۔ "سالے کا چاقو چلانا بھی نہیں آتا تھا اور بنا پھرتا تھا کراں کا بچہ۔ دیکھ موتی! کیسا اوچھا وار کیا ہے۔ دیکھتا ہے کالنتے! ایسے موچی اُستاد جمعدار کلکتہ شہر کے ٹھیکیدار کا ہاتھ۔" تجمل نے زمین پہ تھوک دیا۔

چاقو سے میرے شانے کی کچھ کھال اُدھڑ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جراح آ گیا۔ نصیب میاں نے گرم دودھ کا ایک گلاس مجھے اپنے ہاتھ سے پلایا۔ میرا لباس تبدیل کر دیا گیا۔ مجھے اپنے اردگرد یہ جمگھٹ دیکھ کے اُلجھن ہو رہی تھی۔ ہر شخص کی نگاہ مجھ پر مرکوز تھی۔ جب جراح معمول مرہم پٹی سے فارغ ہو گیا تو موتی میرے پاس آیا اور میری آنکھوں میں اپنی چھوٹی مگر چمک دار آنکھیں ڈال کے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے نظریں نہیں ہٹائیں۔ "شاباش۔" وہ دونوں ہاتھوں سے میری پسلیوں پہ گھونسے مارنے اور قہقہے لگانے لگا۔ "مجھے آنے میں دیر ہو گئی، بچو! سالی گاڑی نکل گئی ورنہ میں رات ہی تیرا دیدار کر لیتا۔" موتی نے میرے ہاتھ چوم لیے۔

"موتی! اُٹھ، لے کے ساتھ چل۔" تجمل نے اُسے کھینچتے ہوئے کہا اور کالنتے کو ہدایت کی کہ وہ میرا خیال رکھے۔

"وہیں جانا ہے ہونا استاد؟" کالنتے کی زبان سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ تجمل نے اس کے منہ پہ ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ کالنتے کا توازن بگڑ گیا۔ وہ پلنگ پر گرتے گرتے بچا۔ پھر اُس نے نظریں نہیں اُٹھائیں۔ تجمل کسی تاخیر کے بغیر موتی کو ساتھ لے کے کمرے سے نکل گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے کالنتے سے تجمل کی پریشانی کی وجہ پوچھنی چاہی حالانکہ وجہ مجھے معلوم تھی۔ کالنتے نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بات گھما کے مجھی

ہنسنے لگا: "بھلا تُو موجدار کے آگے پڑا کیا کیوں چلا گیا؟ کیا تُو یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی لڑکی اُس کے حوالے کر دے گا؟"

"نہیں وہ کوئی اور بات تھی۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اور کیا بات تھی؟" وہ آنکھ مار کے بولا: "لڑکی ہی کی بات تھی۔ تُو نے پہلے ... کر کچھ چھپا رکھا تھا اب ہم سے بات مت بنا۔ اُستاد تیرے غائب ہو جانے سے پریشان تھا۔ تجھے چاقو اور پانچ روپے دیتے پر نصیب میاں کو نہ جانے کیوں اُستاد ... نے کے چھوڑ دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اُس کی لاش پڑی ہوتی۔"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں نصیب میاں کو دیکھا۔ نصیب میاں نے ... "... میاں! آج تم نے ہمیں استاد کے سامنے بڑا خوار کیا۔" نصیب میاں کی آنکھیں ... تھیں: "خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو ہم تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ ... پہلے اشارہ ہی کر دیا ہوتا۔ ایک سے ایک شہزور یہاں موجود ہے۔"

"نصیب میاں!" میں نے تاسف سے کہا: "وہ میرا ہی معاملہ تھا۔"

"... میاں! یہ میرا تمہارا کیا؟ قسم اُس بے وفائی کی، استاد کے روبرو یکسو در بات ... کہا۔ بہرحال رات گئی بات گئی۔ چھوڑو میاں شہزادے! یہ بتاؤ آخر یہ کون ... آگ بھڑک اٹھی تھی؟ بخدا استاد تو ناچتے ہی رہ گئے۔ ہماری رگوں میں بھی گرم خون ... تھا مگر وہ آدمی ہی کا خون تھا۔ یہ تو شیروں اور چیتوں کی خصوصیات ہیں ... جائیں۔ مجھے کہا ہوتا تو میں اس چاند سے مکھڑے پر ایک گلال ہی لگا ... چاند میاں! کیا معاملہ تھا؟ یہ بیٹھے بٹھائے شاعری کی کیا سوجھ گئی تھی؟ ... کی آمد تھی۔"

"کچھ نہیں بڑا نصیب میاں! اپنا مقدر ہی کھوٹا ہے۔" میری آواز بھرّانے ... میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ نصیب میاں بے قرار ہو گیا اور میری بلائیں لینے لگا۔

"لاڈلے میاں! اے سبحان اللہ! تم سا جیسا مقدر تو بہتا ہے بھی ناز کریں۔ چل ... تو کسی نواب زادے کی طرح۔ واپس آئے تو پیر بانی کے لیے ایک ملیں موجود ... کسی کی طرف ایک بھرپور نظر دیکھ لیا تو خاک کر دیا۔ رنگ گلفام ... لب گلابی گفتار میں دم خم۔ چال میں جذبہ سینہ مردوں کا دل چیر دیں گا۔ ... ادھر اُدھر نظر کی تو ایک ہی وار میں ادھر ماہ جبیں کو اسیر کیا، اُدھر ایک ... کو اپنے زندانِ الفت میں گرفتار کیا۔ ہتھیار ہاتھ میں لیا تو بجلی دوڑا دی۔ قدم ... توڑنے لگے۔ لاڈلے میاں! یہ موجدار کا معاملہ کلکتے میں کسی زنانے سے ... اور پھر تم مقدر کو کیوں؟ ....."

کالتے نے گرج کے نصیب میاں کی زبان روک دی: "بد نصیب میاں! انھیں ... کے یہ پوچھنا چاہیے تھا، کہو تو لاؤ جسے بات کر لوں؟"

"... کالتے!" نصیب میاں سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا: "کرتا ہی تو آیا کیا ... برادری کی ... سنو کالتے صاحب! یہ گھن گرج کسی اور کو دکھانا۔ کسی خیال میں ... بخدا جو تمہیں اب بھی نہیں آتا وہ ہم نے بچپن میں سیکھ لیا تھا۔ شمشیر ... تیر، تفنگ، شہزوری، منہ زوری سب ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن ایک

تیرِ نگاہ نے مار ڈالا کر سینے میں دل بھی لیے پھرتے تھے جو بدقسمتی سے تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ کالتے میاں! سوچ سمجھ کے بات کیا کرو کہ کس سے مخاطب ہو اور کون سامنے موجود ہے۔"

"چپ رہو!" کالتے نے ڈپٹ کر کہا: "کچھ خیال بھی نہیں، کہ لالہ اتنا کا ہوا ہے۔ خون بھی کافی نکلا ہے۔ اسے آنکھیں بند کر کے ایک ذرا ستا لینا چاہیے۔ بس تمھیں تو قینچی چل رہی ہے۔"

"پہلے سے ہمیں کیوں نہیں روکا۔ آدمی تم بھی ہماری صحبت میں رہ کے ترنگے کے ہوتے جاتے ہو کالتے یار!" وہ کس قدر خفگی سے بولا: "اب ہماری زبان پر قفل لگ جائے گا۔ ہم نے اپنے ہونٹ سی لیے مگر ایک بات ضرور پوچھیں گے ورنہ ہمیں بے کل رہے گی۔ اُدھر تو سب کام حسبِ منشا ہوا ہے؟"

"اب استاد خود گیا ہے تو سب ٹھیک ہی ہو جائے گا۔" کالتے نے نصیب میاں کو آنکھ ماری۔ اس کی یہ حرکت میں نے دیکھ لی پھر نصیب میاں نے اپنی تیزی و طراری برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے چہرے پر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی لکیریں نہ چھپا سکا۔ باہر آدھ آدمیوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کالتے بار بار اٹھ کے اُن سے ملنے جاتا اور تھوڑی دیر ٹھہر کے واپس آ جاتا۔ میں نے اُن دونوں سے ایک بار کہا بھی کہ وہ مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں اور میرے لیے اتنی زحمت نہ کریں مگر وہ نہیں ٹلے بلکہ کچھ اور جم کے بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں اور وہ جس تشویش میں مبتلا تھے میں اُسے بخوبی سمجھ رہا تھا۔

جب نجیل نے گھرتی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد اُسے فرش صاف کرنے اور موجدار اور چاند میاں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا تو میرے ذہن میں ایسے کسی خدشے نے سر نہیں اُبھارا تھا جس سے اب میں دوچار تھا۔ یہ لوگ نہ جانے درمیان میں کیوں آ گئے۔ مجھ پر جو کچھ بھی گزرتی وہ گزر جاتی۔ نجیل نے موقع پر پہنچ کے اپنے لیے پریشانیاں مول لے لی تھیں۔ یقیناً کالتے، نصیب میاں، موتی، نجیل اور اُس کے دوسرے آدمیوں کو تشویش ہوگی کہ موجدار اور چاند میاں کی لاشیں کہاں چھپائی جائیں اور لاشیں چھپانے کا مرحلہ بخیر و خوبی نمٹ بھی گیا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ کوئی مخبری نہیں کرے گا۔ موجدار کا گروہ خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا اور لازم نہیں تھا کہ اس کا برادری سے چلن پورا نجیل کے حکم کی تعمیل کرے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی لمحے بے جرم ہو کے ساری روداد پولیس کے گوش گزار کر سکتا تھا۔ چاہے وہ آدمی نجیل اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں کتنا ہی معتوب و مطعون قرار پاتا۔ یہ بعد کی بات تھی۔ اس وقت تک تو وہ آدمی پولیس کی توجہ موجدار اور چاند میاں کی گمشدگی پر مبذول کرا چکا ہوگا۔ اگرچہ نجیل کے بیچ میں اعتماد کی مضبوطی موجود تھی مگر وہ موتی کو کے اچانک کہیں ساز ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں صرف سوچنے اور گھٹنے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ چاند میاں کی موت کا ذمے دار موجدار تھا۔ میں اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا مقصد تو کچھ اور تھا۔ موجدار نے خواہ مخواہ ضد کر کے اُس جھمیلے میں چاقو پیوست کرا دیا اور پھر مجھے موجدار سے بھی کوئی بیر نہیں تھا۔ اُس نے خود ہی چاقو نکال لیا تھا۔

دو آدمی جب ایک دوسرے پر چاقو تول لیں تو اُن میں سے کسی ایک کا یہ انجام تو ہونا ہی ہے۔ وہ نہ مرتا تو میں مر جاتا۔ موجدار نے خود مجھے دعوت دی تھی اور بھی اس واقعے کے گواہ تھے۔ پہلا زخم کھانے کے بعد موجدار اپنی گدی پر بیٹھ جاتا تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی۔ چاند میاں مجھے قریب سے اُس کے واقعے پر لے گیا تھا۔ اس کے پاس جانے سے پہلے میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجدار کا خیال نہیں تھا۔ میں نے اس کا علاوہ ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ میری غلطی صرف اتنی تھی کہ میں نے موجدار کے حکم پر چاند میاں کو آزاد نہیں کیا اور واپس نہیں آیا لیکن اگر مجھ سے یہ غلطی سرزد ہو جاتی تو میں کبھی آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور میرا سر کرا کے سامنے کبھی نہیں اُٹھ سکتا تھا۔ پھر مجھے کرا کی اُمید ترک کر دینی پڑتی اور صرف اپنے آپ سے تعلق رکھنا پڑتا۔

ساری باتیں صاف تھیں کسی کی بھی کشائی کی گنجائش نہیں تھی۔ موجدار کے آدمیوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ منظر دیکھا تھا اور مشتعل ہونے کے بجائے فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ یہ عدالت خود اُن کے استاد نے لگائی تھی۔ تجمل کو اس وقت وہی اطمینان حاصل تھا جو ایک شخص کو اس صورتِ حال میں ہونا چاہیے مگر بعد میں کون سی سوچ اس پر غالب آگئی کہ اس کا اطمینان منتشر ہو گیا۔ تجمل کو یہ آنکھ مچولیاں دیکھتے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ موجدار کے گروہ میں ہر قسم کے آدمی موجود تھے۔ کالے گورے چھوٹے بڑے جب سے مختلف تھے سب کا ظرف بھی مختلف ہو گا۔ دو آدمی مرے تھے اور ایک نے انھیں مارا تھا۔ تجمل کے ذہن میں گرہ لگ گئی ہو گی۔ جب تک موجدار اور چاند میاں کا نام و نشان نہ مٹ جاتا، اس وقت تک ہر قسم کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا۔ موجدار کے جو دوسرے جاں نثار موقع پر موجود نہیں تھے ضروری نہیں تھا کہ وہ بھی فیصلہ قبول کرتے جو وہاں موجود لوگوں نے کیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی آدمی اپنے استاد موجدار کی موت سے وفاداری نبھانے کے اظہار میں یہ صاف اور سیدھا سادا واقعہ پیچیدہ اور مشکل بنا سکتا تھا۔ میں جس قدر سوچ رہا تھا تجمل کی پریشانیوں کا احساس ہوتا جا رہا تھا اور میں کوئی واضح بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ایسے معاملوں میں حالات عموماً کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ میں بس بدترین نتیجے ہی اخذ کر سکتا تھا۔ کالے نے اور نصیب میاں نے اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی۔ میں اُن کا تذبذب اور اُن کے چہروں پر بتدریج بڑھتا ہوا اضطراب آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ کاش میں ذرا دیر کو کہیں اور نکل جاتا اور کاش کسی لمحے وقت تجمل کے پاس آ جاتا۔ مجھ ایک شخص کے اُلجھے ہوئے معاملے سے کتنے لوگ متاثر ہو رہے تھے جب کہ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ کرا کا فسانہ عام کرتا پھروں۔ میں نے اسے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ اب بھی کوئی اُس کا نام نہیں جانتا تھا۔ نصیب میاں اور کالے نے بڑی محبتیں نچھاور کی تھیں۔ چند ثانیوں کے لیے میں بھی اُن کی اس کیفیت سے متاثر ہوا لیکن پھر میرا ذہن کرا کے خیال سے قوی ہو گیا اور میں نے سوچا کہ اگر تجمل پر کوئی آنچ آئی یا کسی گم طرف نے موجدار کی موت اس طرح تسلیم نہ کی جس طرح خود اُس نے کی تھی تو میں موجود ہی رہوں گا۔ میں کہاں بھاگا جا رہا ہوں میں تجمل کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔

کہیں شام ڈھلے تجمل واپس آیا سب اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ موتی، شمولی، لالا فدا، گھوشی اور موجدار کے کئی دوسرے آدمی بھی اس کے ساتھ تھے۔ تجمل کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے۔ اُس نے آتے ہی مجھے گلے لگایا، میرا حال پوچھا اور نصیب میاں کو حکم دیا کہ وہ سب کے کھانے کا انتظام کریں اور سونا گاچھی آدمی بھیج کے کنجریوں کو بلائے۔ تجمل کے اس اعلان پر سب چہکنے لگے۔ "استاد! آج تو وہیں چل کے بیٹھتے ہیں۔ تجھیں اس علاقے میں گئے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔ آج تو کچھ دھوم دھڑکا ہو جانا چاہیے۔" شمولی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں گھوشی، تیری کیا منشا ہے؟" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب ان لوگوں کا بھی کچھ خیال کر، فکر چھوڑ۔"

"نہیں استاد!" گھوشی نے نیاز مندانہ کہا۔ "مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میں ان لوگوں کی خوشی میں پوری طرح شریک ہوں۔ اب تیرے ہی ساتھی ہیں۔"

"واہ بیٹے مستانے!" موتی نے گھوشی کی کمر پر زور کا دھپ مارتے ہوئے کہا اور پھر تجمل سے بولا۔ "کیوں تجمل، کیا تیرا دیوالا نکل گیا ہے؟ نہ رنگ نہ ڈھنگ۔ گھونٹ اگر ادے بس اب برداشت نہیں ہوتا۔ آج میں کیا خاک مزہ آئے گا۔"

"گھونٹے میں کیا مزہ رہ گیا ہے موتی! اگردی سے ایک نمبر کی ولایتی منگائی ہے مگر آج میں کسی کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟" موتی ناراضی سے بولا۔ "آج ہی تو دن آیا ہے سالی کچھ عجیب برا ایل ہو رہی تھی۔ میں نے تو سنسل ہی آنکھ کے تین چار گوبیا پار اتار دیا تھا۔ تمام ترپ لگی ہوئی تھی معلوم ہوتا تھا جیسے سب مر گئے ہوں۔ یار گھونٹ ہی نہیں گئی۔"

"کل تو بڑا تفنن ہوا تھا استاد موتی!" نصیب میاں نے ہاتھ نچا کے کہا۔

"او نواب صاحب! کیا ایسا سوکھا ہی ترخاؤ گے؟ مہمان آئے ہیں تمھارے گھر۔ کیا تم بھی اُنھی جیسے ہو گئے نصیب میاں! اگلا دو چہائی" موتی ترنگ میں بولا۔

"آج بیٹھنے دے موتی! بات مان کر۔" تجمل نے اُسے تھپک کے کہا۔

موتی بڑبڑ کر تو ہوا لیکن تجمل کی بات مان گیا۔ وہ سب ایک بڑے کمرے میں لگے اور بات بات پر قہقہے لگانے لگے۔ تجمل نے مجھے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔ دوپہر کو اُن لوگوں نے شاید کھانا نہیں کھایا تھا۔ نصیب میاں اور کالے نے نہ جانے کیا کرشمہ دکھایا کہ دو گھنٹے کے اندر کھانا فراہم ہو گیا۔ رات تک اُس کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ تجمل کے سامنے رکھے ہوئے طشت میں مٹھائی کے تھیلوں اور پھولوں کے ہاروں کا انبار لگ گیا تھا۔ جو آتا سب سے پہلے تجمل کے ہاتھ چومتا، مٹھائی پیش کرتا۔ اس کے گلے میں ہار ڈال کے میرے پاس آتا اور میرے گلے میں ہار ڈالتا، میری پیشانی چومتا۔ تجمل نے بہت سے ہار دوسرے لوگوں کے گلوں میں ڈال دیے تھے۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ کھانا کھانے کے بعد کوئی رات کے دس بجے موتی نے تجمل کو اٹھایا۔ تجمل کچھ آمادہ معلوم نہیں ہوتا تھا مگر موتی کے اصرار پر گھر سے باہر نکل آیا۔ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ گلی قدموں کی گھنٹیوں سے گونج رہی تھی۔ تجمل نے چند آدمیوں کو رقعے پہنچانے کی ہدایت کی اور قدم قدم سوار ہو گیا۔ اس

کے دائیں طرف میں، بائیں طرف موتی بیٹھا تھا، سامنے کی سیٹ پر گھورشی اور کلاتے
تھے۔ ہماری ٹم ٹم کے پیچھے کئی ٹم ٹمیں چل رہی تھیں۔ وہ جس طرف سے گزرتیں بازار
میں شور مچ جاتا۔ موتی تجمل کی کمر سے اپنا ہاتھ گزار کے بار بار میری کمر میں گدگدیاں
کرتا تھا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بار بار مسکرانا پڑتا تھا۔

ایک چوراہے پر جا کے یہ قافلہ ٹھہر گیا۔ سب لوگ سواریوں سے اُتر کے
ایک جگہ اکٹھے ہوئے پھر منتشر ہو گئے۔ ان کی باتوں سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ
وہ گانا سننے کی جگہ آئے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے اس جگہ کے متعلق سنا ہی نہ
تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ہارمونیم، طبلوں اور گھنگروؤں کی آوازوں نے ہمارا خیر مقدم
کیا۔ ہم پانچ آدمی۔ کلاتے، گھورشی، موتی اور تجمل ایک ساتھ چل رہے تھے۔ دوسرے
لوگ ہم سے کچھ فاصلے پر مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ گلی عام گلیوں سے
بالکل مختلف تھی۔ یہاں گھومنے والے لوگ بھی عام آدمیوں سے علیحدہ معلوم ہو رہے تھے۔
میری رگوں میں کچھ سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ جدھر نظر پڑتی وہاں روشنیوں میں چمکتی
دمکتی لڑکیاں دکھائی دیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی جبینوں اور رخساروں
سے شعلے نکل رہے ہوں۔ گلی میں تجمل داخل ہوا تو لوگ دس دس قدم پیچھے ہٹ
گئے یا آگے بڑھ گئے۔ شور تھم گیا جیسے کسی نے لگام کھینچ لی ہو۔ ہر طرف دبی دبی
سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لوگ اشتیاق بھری نگاہوں سے تجمل کو دیکھتے۔ کوئی ایک دوسرے کو اشارہ
کرتے اور ہٹ جاتے۔ تجمل کا سینہ کچھ آگے نکل آیا تھا اور چلتے ہوئے اس کی دونوں
ٹانگوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ یہی حال کلاتے، موتی اور گھورشی کا بھی
تھا۔ گلی میں تنبولی، گل فروش اور چائے والوں کی صدائیں گونج رہی تھیں مگر
اب ہر ایک نے اپنا کاروبار چند لمحوں کے لیے معطل کر دیا تھا۔ کوئی دکان سے اٹھ کر
بھاگتا ہوا آتا اور تجمل کے گلے لگ جاتا۔ کوئی دور سے سلام کر کے رہ جاتا۔ پان والوں
نے بیڑے بنا بنا کے طشتری میں تجمل کو پیش کیے۔ ایک بیڑا میں نے بھی کھایا
منہ میں عطر گھل گیا۔ ہر چائے والے نے اصرار کیا کہ تجمل اس کی دکان پر ایک پیالی
چائے پیے۔ کچھ لوگ بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے وہ اٹھ کے تجمل کے گرد جمع ہو گئے۔

گل فروشوں نے ہم سب کے ہاتھوں میں ہار باندھ دیے اور ایک ایک ہار ہمارے
گلے میں ڈال دیا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا۔ ہر شخص کی خواہش
تھی کہ تجمل اس کی دکان پر ایک لمحے کے لیے ہی مگر ٹھہرے ضرور۔ تجمل ایک خفیف
تبسم سے ان کے سلام کا جواب دیتا اور ان کی صداؤں پر سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ
جاتا۔ جب ہم گلی کے نکڑ سے گزرتے ہوئے دوسری گلی میں داخل ہوئے تو بے داغ
سفید کرتے اور مخملی ٹوپی والے ایک دبلے پتلے بوڑھے آدمی نے ہمارا راستہ روک لیا۔
کورنش سلام کیے اور کہنے لگا: "ایسے نہیں جانے دیں گے۔ راستہ ہم نے بند کر دیا ہے۔
ہماری لاش سے گزر کے آگے جائیے گا۔"

تجمل نے اسے سینے سے لگا لیا اور پہلی بار کھل کے ہنسا۔ "چھٹن صاحب!
یہاں سلام کیے بغیر کون آگے جانے کی ہمت کر سکتا ہے۔ ہم تو تمہی کو دیکھنے کے لیے
ادھر آ نکلے تھے۔ تمہارے ہاتھ کا پان کھائے ہوئے دن ہو گئے۔"

چھٹن خوشی سے دوہرا جھک گیا: "ابھی پیش کرتا ہوں۔ بہر حال بڑی مدت میں قدم
رنجہ تو فرمایا۔ گلی ویران ویران ہو گئی تھی اتنے دنوں۔ عاشقوں کو کیوں ترسایا اور
وہ بڑے نواب صاحب کہاں ہیں؟ نواب نصیب میاں؟"

"نصیب میاں کو آج ہم نے سزا دے دی۔"

"کیسی سزا؟" وہ پریشان ہو گیا: "للہ غلام کو یقین نہیں آتا۔"

"چھٹن صاحب ہمیں آگے بھی جانا ہے۔" تجمل نے کسمسا کے کہا۔

"یہ لیجیے وہ آیا ہی چاہتا ہے۔" چھٹن نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا
سنہرا خاص دان دونوں ہاتھوں سے پکڑے ادب سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔
چھٹن نے خاص دان اس کے ہاتھ سے لے کے ڈھکنا کھولا۔ لڑکے نے طشتری آگے
کر دی۔ چھٹن کو شاید پہلے ہی ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی اس لیے خاص قسم کے بیڑے
تیار تھے۔ چھٹن نے سب کو اپنے ہاتھ سے بیڑے کھلائے۔ موتی نے اس کی انگلی
کاٹ لی۔ چھٹن کھل کھلانے لگا: "واللہ کیا مذاق پایا ہے۔" اس نے خوش دلی سے
کہا۔ پان کھانے کے بعد اس نے عطر کی شیشی کھولی اور ہمارے لباسوں پر خوشبو
مل پھر ایک ایک پھلیل شیشی میں ڈبو کے ہمارے کانوں میں اٹکا دی اور کہنے
لگا: "اب اگر اتنے دنوں میں آئیے گا تو ہمیں ناراض سمجھیے گا۔ وعدہ کیجیے کہ
جلد آئیں گے؟"

"آئیں گے، جلدی آئیں گے چھٹن صاحب!" تجمل نے آگے بڑھنا چاہا
چھٹن نے دوڑ کر جھک کے اس کا کرتا کھینچ لیا۔

"نا، بس ایک لمحے اور۔ بھلا لاڈلے میاں پہلی بار ادھر آئیں اور صرف
گلوری سے منہ میٹھا کر کے آگے بڑھ جائیں؟" اس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے حیرت تھی
کہ اسے میرا نام کس طرح معلوم ہوا اور نام معلوم تھا تو اس نے مجھے پہچان کیسے لیا
میں تو پہلی بار یہاں آیا تھا اور تجمل کے پاس آئے ہوئے مجھے ابھی ایک ہی دن ہوا
تھا۔ چھٹن نے عطر کی ایک شیشی مجھے پیش کی۔ تجمل نے مجھے اس کا شکریہ ادا کرنے
کی مہلت بھی نہیں دی۔ مجھے کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ راستے میں نہ جانے کتنے
لوگوں نے تجمل سے اصرار کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ چلے۔ ان میں عورتیں بھی شامل
تھیں۔ تجمل نے سب کے اصرار مسترد کر دیے۔ میری نظریں کسی ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی
تھیں۔ چبوتروں پر، چقوں پر، بالکونیوں پر لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ انھوں
نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے جیسے آج گلی میں کوئی بہت بڑی شادی
ہو رہی ہو۔ کچھ آگے جا کے موتی نے تجمل کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور
منہ بگاڑ کے بولا: "کیا یہاں صرف بیڑے کھانے اور ہار پہننے آیا ہے؟ ارے چل
کے کہیں بیٹھ۔ وقت گزرا جا رہا ہے۔"

"ذرا دیر ٹھہر۔" تجمل نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔

"کیا بات ہے تجمل! تیرا جی آج کچھ خراب معلوم ہوتا ہے؟" موتی حیرت
سے بولا: "تو تو آج کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ ایسا کر موتی تو چل کے کہیں بیٹھ۔ میں تھوڑی دیر میں ادھر

آتا ہوں۔“ تجمل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”کس من کا بدلہ لے رہا ہے یار؟“ موتی نے ہونٹ سکوڑ لیے۔

”کیا بکواس کرتا ہے موتی! اِکہہ جو دیا، میں ابھی آیا۔ چل باتیں مت بنا، آگے بڑھ۔“ تجمل نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”لعنت ہے موتی پر جو تیرے بغیر جائے۔“ موتی گرج کے بولا۔ ”تجھے معلوم ہے تجمل! میں یہاں کے راستوں سے خوب واقف ہوں۔ یہی بھی پرانی جان پہچان ہے۔ تیری سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

”میں جانتا ہوں تو پیدا بھی یہیں ہوا تھا۔“ تجمل نے اُس کے بال پکڑ لیے۔

”ذرا ذرا سی بات پر جل جاتا ہے۔ تیری سمجھ میں نہیں آتا تو آسنسول میں اتنا چلا آتا ہے یا گھاس کھودتا ہے۔ لگتا ہے ابھی تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ نہ جانے بات سمجھتا نہیں کہ کب کیسے جاتا ہے۔“

”ہاں ہاں میرے تو دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ تُو اپنی بات کر مجھے لگتا ہے تیرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔ تُو تو بوڑھا ہو گیا ہے۔“ اپنا دل بہلاتے ہم سے صاف صاف بات کیا کر، ہیر پھیر نہ کر۔“

”آقا استاد! سنا ہے کرین حیدرآباد سے بڑا مال دولت لے کے واپس آئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پری بھی لائی ہے، ہر جگہ اُس کی دھوم ہے۔“ کلتے نے خوشامد کی۔ ”دیکھو گے تو تڑپ جاؤ گے۔ جب سے آئی ہے سیٹھوں اور ساہوکاروں نے ادھر ہی ڈیرا ڈال دیا ہے۔“

تجمل بادلِ ناخواستہ ایک تپلی سی گلی میں مڑنے کے لیے تیار ہوا۔ میرا دل اچانک ایک خیال سے دھڑکنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے جھرجھری آ گئی اور میرے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ تجمل اپنے خیال میں گم ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میرے ٹھہرنے کی وجہ سے اُس کے ہاتھ کو رکاوٹ پیش آئی۔ اُس نے پلٹ کے میری جانب دیکھا۔ میں گُم سُم کھڑا تھا۔ ”لاٹے!“ اُس نے مجھے کھینچ لیا۔ ”رک کیوں گیا؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے سٹ پٹا کے کہا۔

”کیا کچھ تکلیف ہو رہی ہے؟ زخم کیسا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے۔“ میں نے چستی دکھانے کی کوشش کی۔

”اس علاقے میں سر جھکا کے نہیں چلتے، ذرا گردن تو ٹھیک طرح جسم پر رکھ، لوگ کیا کہیں گے، تجمل کا لاڈلا خوش نہیں ہے۔“

”میں بہت خوش ہوں۔“ میں نے مسکرا کے کہا۔

”اور آگے تیرے دل کی کلیاں کھل جائیں گی۔“ کلتے نے رسیلی آواز میں کہا۔

”استاد لاٹے کے سامنے تو ہم سب کی ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔“

”جا بے۔“ موتی نے مجھے تجمل کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ”میں تو ابھی تجھ سے پوری طرح ملا بھی نہیں۔“ وہ مجھے سڑک ہی پر چمکارتے ہوئے بولا۔ ”تیرے بارے میں سنتا رہا تھا۔ تجمل نے عمر میں ایک ہی سچ بولا ہے اور وہ تیرے بارے میں ہے۔ میں تجھے اپنے ساتھ آسنسول لے جاؤں گا۔“ وہ اشتیاق سے کہتا رہا۔ ”اور پھر تجمل کو ٹھینگا دکھاؤں گا۔ کچھ داؤ میرے پاس ایسے ہیں کہ تجمل کو بھی نہیں معلوم۔ یہاں سے شہر تو وہ بھلا ہے، بے عقلوں کے پٹّے لوگ رہتے ہیں۔“

تجمل نے کچھ نہیں کہا۔ کلتے اور گھونشی موتی کی باتوں پر بُری طرح ہنستے رہے۔ ہم ایک دروازے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دروازہ بند تھا، جھریوں سے روشنی دَر رہی تھی۔ درزوں سے موسیقی ٹپک رہی تھی۔ ایک دل کش آواز روشنی کے ساتھ پھوٹ رہی تھی۔ گھونشی نے آگے بڑھ کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ برآمد ہوا۔ گھونشی نے کہا۔ ”دروازہ کھول۔“

ہم سب اندھیرے میں کھڑے تھے۔ عورت نے گھونشی سے پچکار کر کہا۔ ”اندر کچھ معزز مہمان بیٹھے ہیں، ذرا کچھ دیر بعد زحمت کرنا۔“

گھونشی نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ عورت احتجاج کرتی رہی۔ ”آؤ استاد!“ اندر سے گھونشی کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا تو روشنی ہمارے چہروں پر پڑی۔ عورت چند لمحوں کے لیے ٹھٹکی، پھر والہانہ ہو کے چبوترے پر آ گئی اور اُس نے تجمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اب تم اس طرح آیا کرو گے؟ نہ خیر نہ خبر۔ جب سے آئی ہوں، خبر بھی نہیں لی کہ کرین کو کیا ہوا۔ پردیس میں لُٹ گئی یا برباد ہو گئی۔ کہلا بھیجا، آ کے شکل دکھا جاؤ۔ حرام کے بچوں نے پرانا مکان واپس نہیں کیا۔ اس ٹوٹے ہوئے مکان میں رہ رہی ہوں۔ کسی نے رسید تک نہیں دی۔“

”یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی۔ ساتھ میں مہمان ہیں۔“ تجمل نے ناراضی سے کہا۔ ”حیدرآباد میں رہ کے کرین تم نے کھٹائی بہت کھائی ہو گی، اخلاق بھی کھٹا ہو گیا۔“

”وہی، بالکل وہی۔ تم نہیں بدلے گے۔“ کرین نے شگفتگی سے کہا۔

”اور تم بھی نہیں بدلیں۔ وہی کھنک، وہی تڑپ ہے۔“

”جاؤ بھی، اجڑا ہوا دیار ہوں۔“ وہ تجمل کا ہاتھ تھامے ہوئے اندر لے گئی۔ کمرے میں چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ تجمل کا چہرہ جیسے ہی نمودار ہوا، رقص تھم گیا۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں بے چینی سی پیدا ہوئی۔ انھوں نے ناگوار نظروں سے پہلے ہمیں پھر کرین کو دیکھا جیسے انھیں ہماری آمد نہایت شاق گزری ہو۔ تجمل نے ان کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ ایک کونے میں لگے ہوئے گاؤ تکیے پر جھک کے بیٹھ گیا۔ ”میں تعارف کراؤں۔“ کرین نے تجمل کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کلکتے کے مشہور سیٹھ کشمی داس ہیں اور یہ اُن کے دوست ہیں، آئے ہوئے مہمان۔ سیٹھ صاحب حسن اور آواز پرکھنے کی جو نگاہ رکھتے ہیں یقین کرو وہ میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی اور شخص میں نہیں دیکھی۔“ کرین نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ سیٹھ کشمی داس گھٹنوں سے اوپر تک سفید شیروانی پہنے ہوئے تھا، نیچے دھوتی تھی۔ رنگ گھلتا ہوا، پیشانی تنگ، قد موزوں، عمر چالیس سے اوپر، جسم فربہ۔ شیروانی میں سونے کے بٹن اور انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ کرین نے کسی کے اتنے ہی تعارف پر بس نہیں کیا، کہنے لگی۔ ”وضع دار آدمی ہیں، غریبوں کے دوست، فن جاننے والے، دان پُن میں کلکتے کے

چندری سیٹھو سیٹھ لکشمی داس جی سے اکھوا لائے ہیں۔" سیٹھ کے لبوں پر اپنی تعریف سے کسی قسم کا تاثر نہیں ابھرا البتہ پیشانی پر کچھ شکنیں ابھریں اور آنکھیں چڑھ گئیں۔ "اور یہ ہیں تجمل استاد تجمل۔ ان کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔" کرین نے سیٹھ کو مخاطب کیا۔

سیٹھ نے جواب دینے کے بجائے سر کی ایک خفیف جنبش سے اقرار کیا اور کہنے لگا۔ "کرین بانو! معاف کرنا۔ ہمیں بھیڑ میں گانا سننے میں مزہ نہیں آتا۔ جب ہم آئیں تو دروازے پر تالا لگا دیا کریں۔"

"کلکتے میں نئے نئے آئے ہو سیٹھو!" کرین کے جواب دینے سے پہلے تجمل کی کرخت آواز ابھری۔ "کرین تم نے پورا تعارف نہیں کرایا۔" تجمل کی آواز پر سیٹھ نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں اور سر اٹھا کے اسے گھورنے لگا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمان مضطرب ہونے لگے۔

"ہاں استاد! سیٹھ کا بڑا کاروبار احمد آباد میں ہے۔ حال ہی میں انھوں نے یہاں جوٹ کا نیا کارخانہ لگایا ہے۔ یہ یہاں رہتے تو ضرور تمھیں جانتے۔ یہ صرف نہ جاننے کا اجنبی پن ہے۔ تم بھی انھیں نہیں جانتے، یہ بھی تمھیں نہیں جانتے۔ بہرحال جان پہچان کا اس سے اچھا موقع اور کب آتا۔ سیٹھ صاحب! یہ تجمل ہیں۔ شہر میں کون ہے جو استاد تجمل سے واقف نہ ہو۔ ہر جگہ ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ یہ ان کے ساتھی ہیں۔ ایک تو یہ کالے خاں ہیں اور اسے بھی میں چہرے سے پہچانتی ہوں حالانکہ میں کئی سال بعد کلکتے واپس آئی ہوں۔" اس نے گھونٹی کی طرف اشارہ کیا اور "یہ جو پیچھے کونے میں دبکے میری سرکار بیٹھے ہیں، یہ سمجھتے ہیں میں انھیں بھول گئی۔ یہ موتی ہیں۔"

موتی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "بائی کرین بانو! خوب پہچانا۔ میں تو سمجھا تھا سب کی طرح تم نے مجھے بھی بھلا دیا ہوگا۔"

"موتی میاں! یہ تو نظر نظر کی بات ہے۔" وہ مسکرا کے میری طرف متوجہ ہوگئی۔ "ماشاء اللہ چشم بد دور، چشم بد میں دور۔ البتہ انھیں میں نے نہیں پہچانا۔"

"یہ لاڈلا ہے۔" کالے نے جوش میں بولا۔ "استاد کا لاڈلا!"

کرین آنکھیں پٹ پٹانے لگی جیسے میری صورت دیکھ کے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "آپ نے سنا سیٹھو۔ یہ سب نام ور لوگ ہیں۔ جو انھیں نہیں جانتا اُسے ضرور جاننا چاہیے۔ یہ کام کے لوگ ہیں۔ اب میں آپ دونوں کو ملانے کی رسم بھر پائی۔ میں نے اپنی طرف سے سارا حجاب دور کر دیا ہے۔ سیٹھ صاحب! استاد! ہاتھ ملانے لگ گئے۔ ہم سے گھل جاؤ۔ یہ وقت سے پرستی ایک دن۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ کرین کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ کرین بیٹھے بیٹھے کروٹیں بدلنے لگی۔ کبھی وہ سیٹھ کی طرف دیکھتی کبھی تجمل کی طرف۔ "گانا شروع کرو کرین!" تجمل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "وہ کہاں ہے جسے تم نے ہماری نظروں سے چھپا رکھا ہے؟"

"وہ گاتے گاتے تھک گئی تھی۔ میں نے اُسے آرام کے لیے اندر بھیج دیا تھا پھر جیسے ہی سیٹھ صاحب آئے میں نے اُسے بیدار کر دیا۔ لباس تبدیل کر کے ابھی آتی ہوگی۔ تم اس عرصے میں پری بانو کا گانا سنو۔ پری کی آواز میں جنگل کا جادو

بھرا ہے۔" ایک دبلی پتلی تیکھے نقش و نگار کی سنجیدہ لڑکی درمیان میں پیچھے کی طرف سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اپنے نام پر اس نے اپنی بوجھل پلکیں اوپر اٹھائیں۔ وہ پہلے ہی تجمل کو سلام کر چکی تھی۔ اب دوبارہ سلام کیا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ عمر خاصی کم معلوم ہوتی تھی۔

"کچھ شروع کرو کرین!" موتی نے بپھر کے کہا۔

"اجازت ہے؟" کرین نے سیٹھ سے پوچھا۔

"ہم چلتے ہیں کرین بانو! پھر آئیں گے۔ ہماری طرف سے شرپارہ کو یہ دے دیجیے گا۔ اس نے کل ہم سے فرمائش کی تھی۔" سیٹھ نے ایک پیکٹ کرین کی طرف بے نیازی سے کھسکا دیا۔ کرین نے پیکٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"آپ نہیں جائیں گے جناب! شپارے کو خود دیجیے گا۔ یہ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ وہ آئے گی تو خود آپ کے سامنے رکھ دے گی۔ شام سے وقت پوچھ رہی تھی۔ میں بھی تو کہوں آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب پتہ چلا کیا بھید تھا۔ تشریف رکھیے سیٹھ صاحب!"

"ارے شپارے!" اس نے اچک کر آواز لگائی۔ "ارے کہاں گم ہوگئیں۔ سنتی ہو سیٹھ صاحب واپس جا رہے ہیں۔ پھر مجھ سے کچھ مت کہنا۔"

اندر سے ایک باریک آواز آئی۔ "آئی۔ بس ابھی آئی۔"

"اب آ بھی جا۔" کرین سر پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔

"نہیں کرین بانو! انھیں آج آرام کرنے دو۔ ہم کل آئیں گے۔ جب بھی وقت ملا، ضرور آئیں گے۔ اپنے مہمانوں کا خیال کرو۔"

"سیٹھ صاحب! یہ کوئی غیر نہیں ہیں کہ ان کا خیال کیا جائے۔ آپ بھی تشریف رکھیے۔ یہ بھی بیٹھے ہیں۔ دونوں مجھے عزیز ہیں۔ آج ہی سہی، دیکھیے تو سہی کیسے سخن شناس ہیں۔ شپارے ان کے سامنے گائے گی تو قیامت برپا کر دے گی۔ فن اور حسن تو نگاہوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ میرے نصیب جاگے کہ آج ایسے ایسے سننے والے موجود ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔" وہ روٹھنے کے انداز میں بولی۔

"کرین بانو! آج ہمیں معاف کر دیجیے۔" سیٹھ نے اٹھنے کی کوشش کی۔

کرین نے اضطراب سے تجمل کو دیکھا۔ "بیٹھیے سیٹھو! کرین کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ بیٹھ جائیے۔" تجمل کی آواز میں مختلف عناصر صاف پہچانے جا سکتے تھے۔

"بیٹھو سیٹھ بیٹھو!" موتی اُلجھتے ہوئے بولا۔ "ہم روز کے آنے والے نہیں ہیں۔ ہماری وجہ سے اُٹھنا چاہتے ہو تو مت جاؤ۔ کرین نے تمھیں یہ نہیں بتایا کہ ہم پر کہیں آنے جانے میں روک ٹوک نہیں ہوتی۔ ہم کسی بھی وقت کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ قسم سے پیارے تم پہلے آئے ہو اس لیے اتنی بات بھی کہی جا رہی ہے۔ بعد میں آتے تو شکل دوسری ہوتی۔ تجمل بدل گیا ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس سے یہی کہہ رہا تھا۔ یہ کلکتہ ہے سیٹھ! آسنسول ہوتا تو بات اتنی لمبی نہ ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" سیٹھ نے تنک کے پوچھا۔

"مطلب صاف ہے سیٹھ!" موتی نے تلخی سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

"ہم نہیں بیٹھتے" سیٹھ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
"تو جاؤ" موتی نے پھنکار کر کہا۔
"کرین بانو! آئندہ دو کمرے بنایا کرو۔ ایک ہمارے لیے، ایک اپنے خاص مہمانوں کے لیے" کہتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت واپس جانے لگا۔ کرین نے دوڑ کے اس کو روک لیا۔ اسی لمحے اندر سے ایک زرتش برق لڑکی بھاگتی ہوئی آئی۔ اس نے سیٹھ کی انگلی پکڑلی اور کچھ کہا نہیں بس ایک نظر دیکھا۔ سیٹھ کی آنکھوں سے تبسم ہوئی، وہ مسکراتا ہوا دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ پھر لڑکی نے ہماری جانب نظر کی اور ہم نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا۔ وہ شہپارہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے متعلق کلاسنے جو کچھ کہا تھا وہ اس سے کہیں سوا تھی۔ شوخ چنچل، گھنی پلکیں، لمبی سیاہ چوٹی۔ سیٹھ نے اُسے سامنے بٹھا کے کرین کا دیا ہوا پیکٹ واپس لے لیا اور اُس کے حوالے کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں دیے چمکنے لگے اور چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ اس نے جلدی جلدی پیکٹ کھولا۔ مخملی ڈبے سے ایک چمکتا ہوا ہار نکلا۔ لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں اور روشن ہوگئیں۔
"سیٹھ صاحب! اپنے ہاتھ سے پہنائیے" کرین نے درخواست کی۔
شہپارہ نے اپنا چہرہ اوپر کر کے آنکھیں مُوند لیں۔ اس کے گلابی رنگ کے ہونٹ کانپ رہے تھے، رخساروں پر شفق چھائی ہوئی تھی۔ سیٹھ نے اس کی صراحی دار گردن میں ہار ڈال دیا۔ شہپارہ نے آنکھیں کھول دیں۔ سیٹھ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ لہراتی ہوئی اٹھی اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک جھٹکے سے اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی درمیان میں بیٹھ گئی۔ پہلی لڑکی کرین کے پاس آگئی تھی اور کرین دوبارہ ہمارے قریب بیٹھ گئی تھی۔
شہپارہ نے پیروں میں گھنگرو باندھے، سازندوں نے ساز سنبھالے۔ اس نے شوخی اور ناز سے سازندوں سے کچھ کہا اور بیٹھے بیٹھے انگلیاں نچانے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے پہلے سیٹھ کی طرف پھر تجمل کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور تان اٹھائی۔
"یوں گردن جھکائے بیٹھے ہیں   لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں"
اُس نے ابھی پورے بھی نہیں کیا اُٹھ کے ناچنے لگی اور ایسا ناچی کہ میں اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ کل رات زرّو بھی اسی طرح ناچی تھی مگر یہ تو زرّو سے بڑھ گئی تھی۔ اس کے تھرکتے بدن میں جیسے سنگیت بھرا ہوا تھا جیسے آگ بھری ہوئی تھی۔ جب وہ حرکت کرتی تھی تو چنگاریاں بکھرتی تھیں۔ سب ہم محو ہوگئے۔ موتی اپنی جگہ چھوڑ کے اور ٹہلنے لگا۔ ناچ ختم ہوا تو شہپارہ نے اپنی جگہ بیٹھ کے گایا۔ پھر سیٹھ نے اُسے نوٹ دکھا کے اپنے پاس بلایا۔ وہ اُٹھتی تھی تو سیٹھ ایک اور نوٹ جیب سے نکال کے اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ سیٹھ کی جیب میں جیسے خزانہ بھرا تھا۔ ایک نوٹ اُسے دیتا تھا دوسرا جھٹ جیب سے نکال لیتا تھا۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھی بیٹھی تھی۔ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ سیٹھ کے ساتھی بھی نوٹ لٹا رہے تھے۔ یہ ماحول، یہ گرد، یہ حسین لڑکی، یہ آواز، یہ رقص۔ کل مجھے زرّو کو دیکھ کر بھی تعجب ہوا تھا، اتنی حسین لڑکیاں کس پاتال سے نکل کر سامنے ناچ لیتی ہیں۔ میری نظریں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ میری سمجھ میں یہاں کے آداب آ رہے تھے۔ جب بہت دیر ہوگئی اور شہپارہ سیٹھ کے سامنے سے اٹھ اٹھ کے بیٹھتی رہی تو کرین نے تجمل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"استاد! وہ لڑکیا معلوم ہوتا ہے باپ نے کما کے دیا ہے۔ تھوڑی دیر اور برداشت کرلو پھر میں تمہیں شہپارہ سے کاندھے کی چیزیں سناؤں گی۔" وہ اتنی آہستہ آواز میں بولی کہ ہمارے سوا کوئی نہ سن سکا۔
"ٹھیک ہے کرین! اسے جیبیں خالی کر لینے دو۔"
"اولادی رات برباد کرنے پر" موتی طیش میں بولا۔ "تجمل! میں چاہتا تو نکال دیتا ہوں، دیکھتا ہوں روپے میں زیادہ زور ہے یا چاقو میں۔"
کرین نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ "میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے موتی! یہاں یہ تمہارے آنے کی برکت ہے کہ بارش ہو رہی ہے۔ بس میری خاطر اسی طرح خاموش بیٹھے رہو۔ گھر تمہارا ہے، میں تمہاری ہوں، لڑکی تمہاری ہے۔"
شہپارہ کے ماتھے پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ تھک گئی تھی۔ یہ خوب تماشا تھا۔ مجھے اس لڑکی پر ترس آنے لگا۔ اس نے اتنی نازک گڑیا سی لڑکی کو کھلونا سمجھ رکھا تھا اور تجمل خاموش تھا۔ موتی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کرین خوشامد کر رہی تھی۔ کلاسنے اور گھوش کے چہرے سرخ ہوگئے تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہاں کوئی بہت بڑا فساد ہو سکتا ہے۔ تجمل کا پرسکون چہرہ دیکھ کے بھی لگ رہے تھے۔ سیٹھ روپے لٹا رہا تھا۔ تاہم موتی کی آنکھوں سے اب شعلے اگلنے لگے تھے۔ اُسے روکنا مشکل ہوگیا تھا۔ سیٹھ نے لحاظ ہی نہیں کیا کہ یہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے اور کوئی اور کون بیٹھا ہے۔ وہ کلکتے میں شاید بالکل نیا نیا آیا تھا یا اس کے پاس بہت دولت تھی یا وہ بہت اثر و رسوخ رکھتا تھا کبھی اس نے ہماری جانب توجہ ہی نہیں کی۔ وہ کوئی بڑا ہی آدمی ہوگا۔ موٹا تازہ تھا۔ ایک ہی غزل میں دیر ہوگئی۔ سیٹھ نے اپنے دونوں ہاتھ گاؤ تکیے پر ٹیک دیے تھے اور گاؤ تکیہ اس کے زانوؤں پر رکھا تھا۔ وہ کنکھی باندھے مخمور نظروں سے شہپارہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر شاید اس کے پاس نوٹ ختم ہوگئے۔ اس نے اپنی گھڑی اتار دی، اپنا قلم نثار کر دیا، اپنے ہاتھوں کی انگوٹھیاں نچھاور کر دیں اور جب کچھ نہ رہا تو شیروانی کے اندر لٹکی ہوئی سونے کی زنجیر بھی اتار دی۔ اس نے زنجیر اتاری تو مجھے اپنی مالا کا خیال آیا۔ مالا میری بنیان کے نیچے تھی۔ جو جدار سے لڑائی کے وقت مجھے اگر کسی بات کا خیال تھا تو مالا کا تھا کہ کہیں اس کی ڈوری پر جو جدار کا چاقو نہ چل جائے۔ یہاں اس کے بکھرنے والے موتی تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ بیر لباس تبدیل کرتے وقت تجمل اور اس کے آدمیوں نے یہ مالا دیکھ لی تھی مگر اس وقت ان کی نگاہیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکیں۔ سیٹھ گنگشی داس نے آج جتنا روپیہ خرچ کیا تھا، زیورات، انگوٹھی، قلم، گھڑی کے علاوہ چین، شیروانی کے طلائی بٹن، ان سب کی قیمت اس مالا سے کم تھی، مجھے کچھ جی میں آیا کہ میں شہپارہ کو یہ مالا پیش کر دوں اور سیٹھ سے کہوں تمہارے پاس اس سے زیادہ قیمتی کوئی شے ہو تو پیش کرو۔ یہ سوچ کے اپنے

گے ہاتھ دیکھ پایا کہ کہیں کرین، شہزادہ یا ہمارے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کی نظر میری مالا پر نہ پڑ جائے۔ سیٹھ خالی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں لیکن شہزادہ اس کے سامنے بیٹھی گاتی رہی۔ موتی کا قہقہہ اُبل پڑا۔ سیٹھ نے نخوت و نفرت سے منہ پھیر لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب بھی شہزادہ اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی جیسے اسے بھی ضد ہو گئی ہو۔ سیٹھ نے اپنے شانے اچکائے اور شیروانی کی اندرونی جیب سے تمنچہ نکالا۔ شہزادہ اسے دیکھ کے پیچھے ہٹی۔ سیٹھ نے اپنا تمنچہ چلانے کے لیے تیار کر لیا۔ بس پلک جھپکنے کی دیر تھی۔ کرین ہکا بکا رہ گئی۔ سازندوں کے ساز گر پڑے۔ طبلہ لڑھکنے لگا۔ کانتے نے جھٹ اپنی جیب سے چاقو نکالا اور کھٹ کھول لیا۔ موتی اور گھوشی نے بھی یہی کیا۔ تجمل نے ان کی یہ دہشت دیکھی تو دونوں ہاتھ پھیلا کے انھیں صبر و ضبط کی تلقین کی۔ اس اثنا میں سیٹھ تمنچہ شہزادہ کے حوالے کر چکا تھا۔ ساتھ ہی اس نے اپنا گریبان چاک کر دیا اور سینہ آگے کر کے شہزادہ کو اشارہ کیا کہ وہ اس پر گولی چلائے۔ اس کے ساتھی اُسے روکے ہوئے تھے۔ شہزادہ کے ہاتھ میں کانپتا ہوا تمنچہ دیکھ کے کرین کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑی۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی کہ تجمل نے اسے روک لیا۔ پہلے تو شہزادہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ گانا وانا بھول گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔ شہزادہ نے کرین کی طرف دیکھا۔ کرین چیخ کر شاید یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ تمنچہ ایک طرف پھینک دے۔

"تمنچہ سیٹھ کو واپس کر دینا چاہیے۔" تجمل نے کرین سے کہا۔

"وہ اس وقت ہوش میں نہیں ہے استاد! میں نے اتنا ضدی آدمی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ تمنچہ اُسے واپس نہیں کرنا چاہیے۔" کرین سرگوشی میں بولی۔

"تمنچہ اُسے واپس کرا دو۔" تجمل نے سختی سے کہا۔

"استاد! اب تک تم نے کسی ظرف کا ثبوت دیا ہے۔ خدا کے لیے اس پر ظلم نہ ہونے دو، یہ جگر کو سوا مت کرو۔" کرین لجاجت سے بولی۔

"اور ہمیں بھی تماشا نہ بناؤ کرین بائی!"

"کرین یہ جرأت کیسے کر سکتی ہے تجمل! کرین یہاں کس کے آسرے پر رونق لگا کے بیٹھی ہے، تجمل کے۔ تم کہتے ہو تو میں اس سے کہہ دیتی ہوں۔" کرین نے شہزادہ کو اشارہ کیا۔ شہزادہ نے تمنچہ سیٹھ کو واپس کر دیا۔

سیٹھ نے فرطِ جذبات میں اس کی انگلیاں چوم لیں۔ شہزادہ اپنا ہاتھ چھڑا کے بھاگ نکلی تو سیٹھ بھی بے تابی سے اٹھ گیا۔ "اب کہیں نہ جاؤ۔" اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تم صرف ہمارے لیے گاؤ گی۔ صرف ہمارے لیے ناچو گی۔ تم نے ہمارا دل برباد کر دیا۔ ہم تمھیں اپنی رانی بنائیں گے اور تمھارے قدموں میں دنیا بھر کی خوشیاں بکھیر دیں گے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تمھارا ہے۔ کرین بائی!" وہ بلند آواز سے بولا۔ "ہم شہزادہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اب وہ کسی اور کے سامنے نہیں ناچے گی۔ تم جو کہو گی وہ ہم پیش کر دیں گے۔ بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"سیٹھ! آپ کی باتیں سن کے میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ میری محنت کا صلہ مل گیا مگر سیٹھ! شہزادہ ہی میری پونجی، میری کل جائداد ہے۔"

"ہم تمھیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔"

"میں جانتی ہوں اللہ نے آپ کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ آپ کے بہت سے کارخانے ہیں۔ میرا کارخانہ تو ایک ہی ہے۔"

"ہم شہزادہ کے لیے تمھاری ہر خواہش پوری کریں گے۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔ یہ باتیں ایسی تو نہیں ہیں کہ ابھی اور اسی وقت طے ہو جائیں۔ میں نے تو ایسا کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا۔ آپ مجھے کچھ وقت دیجیے۔"

"نہیں، ہم تمھارا جواب اسی وقت سننا چاہتے ہیں۔"

"اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے غریب خانے پر مہمان موجود ہیں۔ ابھی تک انھوں نے شہزادہ کو ٹھیک سے سنا بھی نہیں ہے۔"

"ہم اسی لیے جلد از جلد جواب چاہتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو شہزادہ سے پوچھ لو۔ وہ انکار نہیں کرے گی۔ ہم نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب شہزادہ صرف ہمارے دل کی دھڑکن بنی رہے گی۔ ہم اس کا کسی اور کے سامنے ناچنا گانا پسند نہیں کریں گے۔"

"سیٹھ صاحب! سیٹھ صاحب! یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔" کرین نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "آپ کو بھی میرا تجربہ کارانہ مشورہ ہے کہ ذرا رات کو بستر پر ٹھنڈے دل سے سوچیے گا۔" کرین دبے دبے لفظوں میں سیٹھ کو سمجھاتی رہی مگر اس کی ضد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم میں سے کسی شخص نے ابھی تک اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ کرین کی زبان تو تھک گئی مگر سیٹھ کی ضد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا تمنچہ تھا۔ کرین کو خوف ہو گا کہ بات بگڑ رہی ہے۔ اسی لیے وہ نرمی، خوش اخلاقی، معذرت اور خوشامد کے لہجے میں سیٹھ کلکتے والے سے مخاطب تھی۔ سیٹھ نے کلکتے میں قائم کیا ہوا اپنا کارخانہ کرین کے نام کر دینے کی پیشکش کی۔ ایک ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ، پچیس ہزار روپے نقد۔ جسے بڑھا کے اس نے ایک لاکھ روپے کر دیا۔ کرین مبہوت ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی پر سیٹھ اپنی پیش کشوں میں اضافے پر اضافہ کیے جا رہا تھا۔

"ہم شہزادہ کو اس تنگ و تاریک جگہ سے نکال کے تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کی صحیح جگہ وہی ہے۔" وہ جوش میں بولا۔ "ہم اسے ہر صورت میں یہاں سے لے جائیں گے۔"

کرین چپ بیٹھی تھی۔ سیٹھ نے شہزادہ سے کہا۔ "چلو ہمارے ساتھ چلو شہزادہ! ہم تمھاری قدر کریں گے۔"

"مگر... مگر اس وقت؟" شہزادہ جھجک کے بولی۔

"ہاں اسی وقت، ابھی۔ ہم کرین کے نام کاغذ لکھے دیتے ہیں۔ جب تک ہم اپنے وعدے پورے نہیں کریں گے اس وقت تک تمھارے قریب نہیں آئیں گے۔"

"یہ فقرہ مناسب نہیں سیٹھ صاحب!" شہزادہ نے حوصلے سے کہا۔

"ہم نے انکار سننا نہیں سیکھا ہے شہزادہ!"

"کنیز انکار نہیں کر رہی ہے۔ کنیز کی درخواست ہے کہ استاد اور اس کی

"اس کو کچھ تو مہلت دی جائے۔ ہمیں آخر اتنا اختیار تو حاصل ہے۔"

"گانا شروع کرو۔" اچانک مجّل نے گرج دار آواز میں حکم دیا۔ "لڑکی! گانا شروع کرو۔"

"شہ پارہ نہیں گائے گی۔" سیٹھ نے درشتی سے کہا۔

"کیوں نہیں گائے گی؟" مجّل نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تحمل سے پوچھا۔

"تم سن نہیں رہے ہو؟ ہم شہ پارہ کا سودا کر رہے ہیں۔"

"اور اس کی ماں تیار نہیں ہے۔ جاؤ سیٹھ جاؤ۔ کرمین کے جانے کا انتظار کرو۔ لگن ہے کرمین یہ لڑکی تمھارے سپرد کر دے پھر جو جی چاہے کرنا۔ تمھارے پاس پیسے ختم ہو چکے ہیں اور اس جگہ اسی آدمی کی قدر ہوتی ہے جس کی جیب بھری ہوتی ہے۔ تمھاری جیب میں کچھ نہیں ہے۔ جیب میں جب کچھ ڈال سکو تو آ کر تیزی سے بات کرنا۔ گانا شروع کراؤ کرمین! دیر کس بات کی ہے۔"

"شہ پارہ اب نہیں گائے گی۔ ہم یہیں بیٹھے بیٹھے شہ پارہ کو سونے میں تول سکتے ہیں۔ ہماری بات موم نہیں ہے، ہماری بات سونا ہے۔"

"تم سے کہہ دیا گیا ہے کہ کرمین کو سوچنے کا وقت دو۔"

"تم درمیان میں مت بولو۔ یہ ہمارا اور کرمین کا معاملہ ہے۔"

"تم ہمیں جانتے نہیں ہو اسی لیے ہم اب تک خاموش ہیں۔ تم نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ علاقہ ہمارا ہے اور یہاں ہمارا حکم چلتا ہے۔"

"یہ علاقہ اٹھی کا ہے سیٹھ!" کرمین گھبرا کے بولی۔

"اور ہماری بات فولاد ہے۔" مجّل بولا۔ "اور ہمارا وقت فالتو نہیں ہے۔ یہ سودے بازی بعد میں کرنا۔ ہمیں گانا سننا ہے۔"

"تم شوق سے گانا سنو مگر وہ گانا شہ پارہ کا نہیں ہوگا۔"

"وہ گانا شہ پارہ ہی کا گانا ہوگا۔" مجّل نے اطمینان سے کہا۔

"ہم گانا نہیں ہونے دیں گے۔" وہ غصّے میں بولا۔ "ہم شہ پارہ کا خون کر دیں گے۔ بہتر ہے تم اپنی زبان بند رکھو۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟ ... موتی! دیکھتا ہے یہ سیٹھ کا بچہ کیا بک رہا ہے۔" مجّل نے تمسخر سے کہا۔ "ہمیں زبان بند کرنے کا حکم دے رہا ہے۔"

"استاد! اس کی زبان چاقو سے کاٹ لوں؟" گھونشی نے چاقو لہراتے ہوئے کہا۔ "بہت ہو گیا استاد! تم نے تو حد کر دی۔"

"مجّل! کیا ذلیل کرنے لایا تھا؟ یہ کنجر اتنی دیر سے ٹرٹر کر رہا ہے اور تو بیٹھا سن رہا ہے؟" موتی انگڑائی لے کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے اتنی باتیں کبھی نہیں سنیں۔" سیٹھ جھنجھلا کے بولا۔ "میرے ہاتھ میں تمنچہ ہے۔ احمد آباد میں کئی غنڈے اس کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

موتی نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔ "مجّل! ذرا احمد آباد بھی جانا پڑے گا۔ یہ شہر بھلا کلکتے سے کتنی دور ہے؟" وہ آہستہ آہستہ سیٹھ کی طرف بڑھنے لگا۔

ابراہیم لودھی اور بابر

کے درمیان پانی پت میں زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ ابراہیم کی فوجیں بری طرح کٹ رہی تھیں۔ وہ یہ منظر حسرت و یاس سے دیکھ رہا تھا۔ کسی نے اس سے کہا: "جہاں پناہ! ہماری فوجوں کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں بہتر ہے کہ آپ جنگ کے میدان سے ہٹ جائیں۔ اگر آپ بچ گئے تو ہم ایک اور فوج بھرتی کر کے ایک نہ ایک دن مغلوں کو مار بھگائیں گے۔"

ابراہیم نے جواب دیا: "ایک بادشاہ کے لیے میدان سے بھاگ نکلنا سخت بے عزتی کی بات ہے۔ ہمارے خیر خواہ اور دوست کثرت سے کٹ رہے ہیں۔ لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ ہم ان کے بغیر زندہ رہ کے کیا کریں گے؟ ان کے ساتھ ہم بھی موت کو لبیک کہیں گے۔ میدان سے کسی صورت ہم نہیں بھاگیں گے۔" ابراہیم لڑتے لڑتے موت کی گود میں جا سویا۔ بابر کو اطلاع دی گئی۔ بابر پر اس کی موت کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ "بہادر سلطان کو پورے اعزاز سے دفن کیا جائے۔"

"ہزار ڈیڑھ ہزار میں پڑے گا۔" مجّل نے سرسری جواب دیا۔

"آگے مت بڑھو۔ میں کہتا ہوں آگے مت بڑھو۔" سیٹھ نے تمنچہ تان کر کہا۔

"کرمین! کرمین! بازو! تم اسے روکو۔ اس جانور کو روکو۔ اگر ایک خون ہو گیا تو پھر یہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا۔ ہم اب جائیں گے اور شہ پارہ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

کرمین کانپ رہی تھی۔ موتی قہقہے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ شہ پارہ چیختی ہوئی موتی کے پاس آئی اور اس کا بازو جھنجھوڑ کے بولی: "رک جاؤ، رک جاؤ۔ میں سیٹھ سے بات کرتی ہوں۔ میں تمہیں گا کر سناؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں سیٹھ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ یہاں خون مت بہاؤ۔"

موتی رک کے شہ پارہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ "تم اتنی پیاری لڑکی ہو۔ میں تمہیں اس پاگل کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔"

"شہ پارہ! سامنے سے ہٹ جاؤ۔" سیٹھ نے مرتعش آواز میں کہا۔ "شاید اس کی موت آ گئی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" شہ پارہ ہذیانی انداز میں بولی۔ "میں تم سے منت کرتی ہوں۔ تمنچہ اندر رکھ لو۔ تمنچہ اندر رکھ لو۔" وہ ایک لمحے میں جست لگا کے سیٹھ کے پاس پہنچ گئی۔

موتی اس کے مقابل کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ تمنچے پر سیٹھ کی گرفت سخت معلوم ہوتی تھی۔ مجّل کھڑا ہو گیا۔ شونی کانتے چند قدم آگے بڑھ گئے۔ ان کے چاقو روشنی میں چمک رہے تھے۔ کرمین سیٹھ کے قدموں پر سر رکھ کے زاری کر رہی تھی۔ سیٹھ کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ادھر مجّل کانتے اور شونی کھلے چاقو ہاتھوں میں لیے تیار اور نظروں سے سیٹھ کو گھور رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے کانتے سے کہا کہ اگر اس کے پاس کوئی فالتو چاقو موجود ہو تو وہ میرے حوالے کر دے۔ مجّل نے سن لیا اور اپنا چاقو مجھے دے دیا۔ سیٹھ تمنچہ تانے بار بار موتی کو سامنے سے ہٹنے کا حکم دے

سا تھا اور موتی کسی بت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چاقو کھولے اس کے روبرو کھڑا تھا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا، میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ موتی کا جسم بائیں طرف پھرتی سے جھکا اور اس کا چاقو والا ہاتھ بجلی جیسی تیزی سے سیٹھ کے ہاتھ پر جھپٹا۔ سیٹھ نے ایک چیخ ماری۔ تمنچے سے گولی کی آواز آئی اور تمنچہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ سیٹھ کے ہاتھ سے خون بہنے لگا تھا اور وہ درد کی شدت سے اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے بری طرح پکڑے ہوئے تھا۔ موتی نے جس تیزی اور برق رفتاری سے یہ کام کیا تھا وہ چاقو زنی کا کمال تھا۔ اس نے ٹھیک اسی ہاتھ پر چابک دستی سے چاقو کا وار کیا تھا جس میں تمنچہ موجود تھا۔ پہلے موتی نے بائیں طرف جسم جھکا کے سیٹھ کو ورغلایا اور پھر دائیں ہاتھ سے اس کے ہاتھ پر حملہ کر دیا۔

چاقو اس انداز سے لگایا گیا تھا کہ تمنچے کی گولی ضائع چلی جائے ورنہ دوسری صورت میں وہ کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ اپنا جسم ہٹانا اور تمنچے کا نشانہ قائم رکھتے ہوئے حملہ کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ موتی کو اپنی چاقو زنی پر مکمل اعتماد ہے۔ جھمل نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ گھوشی نے تمنچے پر قبضہ کر لیا تھا۔ خون روکنے کے لیے کرین نے اپنا دوپٹا سیٹھ کے ہاتھ پر باندھ دیا۔ وہ بلبلانے لگا تھا۔ اس کی تین انگلیوں کے درمیانی پوروں پر چاقو کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی تھی۔ ذرا سا اور گہرا پڑ جاتا تو تینوں پورے زمین پر گر جاتے مگر موتی کا مقصد یہ نہیں ہوگا۔ جو مقصد تھا وہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔ سیٹھ گشتی اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے درد کو برداشت کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی کراہیں نکل ہی گئیں۔ اس کے ساتھیوں، دوستوں اور کرین نے اسے فرش پر بٹھا کے گھریلو دواؤں سے اس کی پٹی کر دی۔ جھمل نے دوبارہ شہ پارہ کو حکم دیا کہ وہ گانا شروع کرے۔ شہ پارہ نے گھنگرو اتار دیے تھے۔ جھمل کے حکم پر اس نے کسی توقف کے بغیر عمل کیا۔ جیسے ہی گھنگرو چھنکے اور طبلے پر تھاپ پڑی، سیٹھ وحشت زدہ انداز میں اٹھ گیا۔ "نہیں شہ پارے، تم نہیں گاؤ گی۔ انکار کر دو شہ پارے!" وہ چیخنے لگا۔

شہ پارہ نے مصرع اٹھا دیا ؎ روندتی پھرتی ہے پھولوں کو سواری آپ کی۔

سیٹھ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سمیت دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ "سنو سیٹھ!" کالنتے کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ کالنتے نہ جانے اس سے کیا کہنا چاہتا تھا مگر پھر رک کے کہنے لگا۔ "جاؤ سیٹھ! آیندہ احتیاط رکھنا۔"

"یہ احمد آباد نہیں ہے سیٹھ!" موتی نے ہنس کے کہا۔ "وہاں تمنچے لیے پھرتے بھلے لگتے ہوں گے۔ اب جاتے کہاں ہو، بیٹھ جاؤ، ہماری طرف کا گانا سنو۔ تم چلے جاؤ گے تو مزہ نہیں آئے گا۔ تمھیں سامنے دیکھ کے شہ پارے کی آواز میں کچھ اور ہی سوز پیدا ہوگا۔"

سیٹھ نے شعلہ بار نظروں کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آخری بار شہ پارہ پر ایک نظر ڈالی اور گردن جھٹکتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔ کرین کی پکار پر موتی، کالنتے اور گھوشی کے تینوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا ہوگا۔ کرین نے لپک کے دروازہ بند کر دیا اور سیدھی جھمل کے پہلو میں آ بیٹھی۔ "آج تو خیر ہو گئی استاد!" وہ خفقانی لہجے میں بولی۔ "اگر تمنچہ چل جاتا تو؟"

"تو کیا ہوتا، تمھاری چاندنی خراب ہو جاتی۔" موتی نے کہا۔

"میرا تو دل ابھی تک ہول رہا ہے۔"

"تم گھاٹے میں نہیں رہیں کرین بانو!" کالنتے نے آنکھ مار کے کہا۔

"آگ لگے ایسی دولت کو، سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔" کرین بولی۔ "وہ تو آج منتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ دیکھو میرا دل۔" اس نے جھمل کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "کیسا دھڑک رہا ہے۔"

"ہم بھی تمھارے پرانے آشناؤں میں سے ہیں۔" موتی نے شکایت کی۔

"یہ تو پیسے کی دھڑکن ہے کرین بانو!" گھوشی نے کالنتے کو کہنی ماری۔ "سودا برا نہیں تھا، بات اب بھی بن سکتی ہے۔"

"لے جاؤ بھی۔" وہ گھوشی کو ٹہوکا مار کے بولی۔ "اس جنونی کو کون اپنی بیٹی دے گا۔" پھر اسے اچانک کچھ خیال آیا یا شاید وہ موضوع بدلنا چاہتی تھی۔ اس نے شہ پارہ کو اشارہ کر کے ہمارے پاس بلا لیا۔ "میں تو بھول ہی گئی۔" وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔ "آداب، نہ تسلیم، سلام نہ دعا۔ اس نامنجارے نے موقع ہی نہیں دیا۔ جھمل تو شاید پہلی بار شہ پارے کو دیکھ رہے ہیں۔"

سیٹھ کے جاتے ہی ہم لوگوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کے شہ پارہ نے نغمہ سرائی بند کر دی تھی۔ کرین کی طلبی پہ وہ فوراً ہمارے پاس آئی۔ سب کو گردن خم کر کے ایک ہاتھ سے تسلیم کی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگی۔ میرا جی چاہا کہ وہ ایک بار اور تسلیم کرے۔ پہلی لڑکی طشتے میں چائے بنا کے لے آئی تھی، خشک میوے اور مونگ پھلیاں وغیرہ۔ شہ پارہ کو اتنے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو بہت معصوم ہے۔ یقیناً اسے بھی کسی نسرین نے کرین کے حوالے کیا ہوگا۔ میرا دل اس سے پوچھنے کے لیے مچلا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ رقص کی یہ تعلیم یہ کہاں کی تھی یا اس نے اسی جگہ سیکھی ہوگی۔ سیٹھ کے واقعے سے اس کی شوخی رخصت ہو گئی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی۔ یہ بہت اجنبی مسکراہٹ تھی۔ موتی اس کے حسن کی بڑھ کے تعریف کر رہا تھا، وہ شرما شرما جاتی تھی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ جب موتی نے اصرار کیا کہ اب رات جا رہی ہے، کچھ ناچ گانا ہو ہی جائے تو وہ ایک گہری سانس لے کے اٹھی۔ میں نے چاہا اسے گانے سے منع کر دوں اور کہوں کہ وہ صرف باتیں کرتی رہے لیکن موتی، گھوشی اور کالنتے کا اشتیاق دیکھ کے خاموش رہا۔ شہ پارہ نے پھر گانا شروع کر دیا ؎

روندتی پھرتی ہے پھولوں کو سواری آپ کی
کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی

وہ اتنی دل سوز، دل نشیں اور دل کش آواز میں گا رہی تھی کہ سب پر محویت طاری ہو گئی۔ موتی کی جیب میں جو کچھ بھی تھا وہ اس نے لٹا دیا۔ شہ پارہ اس کے سامنے ٹک کے گانے لگی۔ میری جیب میں پیسے ہی نہیں تھے لیکن کالنتے اور گھوشی نے کمال والی حرکت کی۔ میرے کان، گال اور ہونٹوں سے نوٹ لگا دیے۔ شہ پارہ انھیں میرے چہرے سے مسکرا مسکرا کے نوچتی رہی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے اور اس کی نگاہ میرے جسم میں پیوست ہوتی

جاری ہے۔ "دیکھا استاد! میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ لاڈلے کے سامنے سالا اپنے گرگوں کو لے آئے گا۔" کانتے نے تجمل سے کہا۔ "اب ہماری کیا ضرورت ہے چلو اٹھو استاد!"

"حرام کے جنے تیری زبان میں کیڑا لگ گیا ہے۔" تجمل نے غصے سے کہا۔ "کسی دن اسے کاٹ کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

کانتے بھن بھنانے لگا۔ موتی نے اس کے سر پر دھپ مار کے اسے خاموش کیا۔ شہ پارہ کو گاتے گاتے ہنسی آ گئی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت بکھر سے گئے۔

ابھی اسے گانا گاتے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر بڑے زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ شہ پارہ کی آواز میں لرزہ آ گیا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

گھوشی نے سیٹھ کا تمنچہ تجمل کے حوالے کر دیا تھا مگر میں تھوڑی دیر بعد دروازے کی طرف نہ جاتی تو شاید دروازہ ٹوٹ جاتا۔ وہ اُدھر گئی اور اِدھر ہم مستعد ہو گئے جو اٹھنا چاہتے تھے تجمل نے انہیں بیٹھے رہنے دیا۔ البتہ ہمارے چاقو ہماری دسترس سے دور نہیں تھے۔ سازندوں کے ہاتھ بہکنے لگے اور شہ پارہ اپنی آواز کی روانی قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی۔ گھوشی نے ڈرتے ڈرتے کنڈی کھولی۔ دروازے کا پٹ گھوشی کے منہ پر لگا۔ چونکہ باہر سے اس پر زور پڑ رہا تھا اور وہ فرش پر جا رہی۔ تب سب سے پہلے ایک انسپکٹر دندناتا ہوا اندر گھسا۔ اس کے پیچھے دو پولیس والے تھے۔ ان کے پیچھے سیٹھ لکشمی داس اور اس کے دوست تھے۔ انسپکٹر دو چار ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ سٹ پٹا کے ٹھہر گیا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی درشتی تیزی سے نرمی میں تبدیل ہو گئی۔ "ارے..." وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "استاد تجمل موجود ہیں۔ کہیے استاد! کیا حال ہے؟ کیا معاملہ ہے؟"

تجمل کھڑا ہو گیا۔ "مکرجی! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں استاد! یہ کیا؟..." اس نے سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔ "میں سمجھا تھا کوئی اور ہوگا۔"

"سیٹھ نے تمہیں میرا نام نہیں بتایا ہوگا مگر چلو اچھا ہوا تم آ گئے۔ موتی نے سیٹھ کے چاقو مار دیا ہے۔" تجمل نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں جی انسپکٹر صاحب اور تجمل کے پاس سیٹھ کا تمنچہ ہے۔" موتی بول پڑا۔

"زیادہ کیوں بولتا ہے بے۔" تجمل نے موتی کو جھڑک دیا۔

"میں پوری بات بتا رہا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مکرجی جانتے ہیں۔ مکرجی! ہم حاضر ہیں۔ ہتھکڑی لگا دیجیے۔ موتی نے سیٹھ کے ہاتھ پہ چاقو مارا تھا۔ یہ اقدام قتل عمد کا کیس بن سکتا ہے۔ دفعہ لگ سکتی ہے۔ سیٹھ کا خون بھی بہہ گیا ہے۔"

انسپکٹر مکرجی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کبھی تجمل کی جانب دیکھتا کبھی سیٹھ کی جانب۔ "ان غنڈوں نے ہماری بے عزتی کی ہے انسپکٹر!" سیٹھ لکشمی داس نے طیش میں کہا اور موتی کی طرف دیکھا۔ "اسے سزا دلواؤ۔"

"ٹھہریے، ٹھہریے سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ استاد تجمل کو نہیں جانتے؟ یہ سب ان کے ساتھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک کوئی خود ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے یہ آگے نہیں بڑھتے۔"

سیٹھ کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "انسپکٹر! ہم کیا جھوٹ بول رہے ہیں؟ تم یہ ہمارا ہاتھ نہیں دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں سیٹھ صاحب! دیکھ رہا ہوں۔ ایسے موقعوں پر اس قسم کی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ جانے دیجیے۔" انسپکٹر نے اس کا تکدر دور کرنے کی کوشش کی۔

"انسپکٹر!" اس نے چیخ کے انگریزی میں کہا۔ "تم ہمارے مقابلے میں ان کتوں کو عزت دے رہے ہو؟ ہم کیا تمہیں اسی لیے یہاں لائے تھے۔ اگر تم کوئی کارروائی نہیں کرو گے تو ہم تمہارے افسروں کے پاس جائیں گے۔ جتنے روپے ہم نے تمہیں دیے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہم ان پر خرچ کر سکتے ہیں۔ ان بدمعاشوں نے ہمیں شہ پارے کے سامنے شرمندہ کیا ہے۔ یہ تماشائی ہیں جنگلی ہیں انسپکٹر!"

میرا ہاتھ اپنے چاقو پر مچلنے لگا۔ میں نے تجمل کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک پرسکون مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "یادہ سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے نرمی سے انگریزی ہی میں کہا۔ "آپ نیچ لوگوں کے منہ کہاں آ رہے ہیں۔ یہ بڑے شیطان اور سور کے بچے ہیں۔ یہاں ایک سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش بیٹھا ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے سیٹھ صاحب! انہیں جتنا چھیڑیں گے یہ اتنا ہی منہ آئیں گے۔ بہتر ہے کہ معاملہ رفع دفع کر لیجیے۔ یہ جیل تھانے اور کچہری وغیرہ سے نہیں ڈرتے۔ اور پھر آپ کا تمنچہ بھی ان کے پاس ہے۔ یہ رنڈی کا کوٹھا ہے سیٹھ صاحب! یہاں ان کے خلاف آپ کو کوئی گواہ بھی نہیں ملے گا۔ آپ کیوں ان جھگڑوں میں پھنس گئے؟ آپ ان....."

"زبان سنبھال کے انسپکٹر!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اردو میں کہا۔ "اتنی گالیاں مت دو۔ ہم بھی کچھ عزت رکھتے ہیں۔"

انسپکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ سٹ پٹا گیا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا مگر منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ تجمل نے تعجب آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہیں مکرجی؟ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں؟"

میں نے تجمل کو نہیں بتایا کہ انسپکٹر نے ہمیں کن القاب سے نوازا ہے۔ "اپنا لاڈلا بھی گٹ پٹ جانتا ہے انسپکٹر صاحب!" موتی نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔ "تم سے اور تمہارے سیٹھ سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہوگا۔ ہاں لاڈلے بول! ذرا گٹ پٹ دکھلا دے۔"

"یہ لاڈلا ہے؟ وہی لاڈلا جس نے جیل میں تعلیم حاصل کی تھی؟" انسپکٹر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے افسوس ہے استاد!"

"ہاں یہ وہی لاڈلا ہے مکرجی! اچھا ہوا تم نے بھی اسے دیکھ لیا۔"

"مجھے افسوس ہے میرا مطلب سیٹھ کو کسی صورت مطمئن کرنا تھا استاد تجمل! بات الجھانے کی کوشش مت کرو۔ میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں مکرجی!" تجمل نے زیرِ لب کہا۔ "اطمینان

...کا تھا۔ ہماری تمہاری دوستی تو اپنی جگہ ہے۔"

"استاد تجمل!" انسپکٹر ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں......"

"جانے دو انسپکٹر! گالیاں ہم پر اثر نہیں کرتیں۔ کچھ کاروائی کرنا ہے تو ...وہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم یہاں محفل کرنے نہیں آئے۔"

"تم گانا سنو تجمل! کاروائی ہو چکی۔" اس نے سیٹھ کے کندھے پر ہاتھ ...رکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ سیٹھ چلو۔"

"کیا کاروائی ہو چکی؟" سیٹھ مچل کے بولا۔

"چلو سیٹھ! باہر چلو۔" انسپکٹر نے اسے آسان کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں سیٹھ! بیٹھو شہپارے نے آج گانے میں تڑپا کر رکھ دیا۔ تم بڑے ...ہی بولی تول خوب کیا۔ اب بھی قیمت کم ہی رہی۔" موتی نے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا انسپکٹر! تم کیا کر رہے ہو؟"

"آیئے میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔" وہ سیٹھ کو گھسیٹتے ہوئے بولا۔ سیٹھ نے اس بار زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ اس کے دوستوں نے بھی اس کی پیٹھ تھپکی چالاکر ...سیٹھ کی حمایت میں اس بار پہلے سے زیادہ سرگرم اور پرجوش نظر آ رہے تھے۔ ...جاتے جاتے انسپکٹر نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ کرین ...ہاتھ ٹکا کے بیٹھ گئی تھی۔ تجمل کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ "لاوڈے! لاوڈے! ...لگ جا۔" وہ بے تابی سے بولا۔ "دیکھا موتی! ایسے کر شر کی گرج کسی میری ...کبھی دیکھی؟"

"استاد لاوڈے کو گٹ پٹ کرتے دیکھنے کی حسرت رہ گئی۔ سالے انسپکٹر کو ...دیکھا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ کیا گالیاں دے رہا تھا لاوڈے؟" ...نے میری پسلیوں میں ہاتھ ڈال کے پوچھا۔

وہ سب میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ موتی نے نعرہ مار کے کہا۔ "میں ...کہتا ہوں اب ایک آخری ٹھمکہ سنوا دے شہپارے کہ وہ آج سارا ریکارڈ توڑ دے۔"

"اب مجھ سے نہیں گایا جائے گا۔" شہپارہ نے آہستگی سے کہا۔

"تو مت گا۔ ڈبس ہمارے سامنے بیٹھی رہو۔ تمہارا تو سامنے رہنا بھی گانا ہے ...طلب ہے یار موتی ہے۔" موتی نے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ وہ جوتی پھر کسی افسر کو لے آئے گا۔ اس کے پاس بہت پیسے ہیں۔" کرین نے خوف زدگی سے کہا۔

"حرام کے ہیں۔" تجمل نفرت سے بولا۔ "اچھا ہے کچھ پولیس افسر کا بھلا ہو جائے۔ سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ پر اب وہ ادھر نہیں آئے گا۔"

"تمہیں معلوم ہے؟" کرین نے حواس باختگی سے کہا۔ "تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں!" تجمل نے بے پرواہی سے کہا۔ "اب وہ نہیں آئے گا۔ اب رات کو تم دروازہ کھلا رکھ کے سویا کرو!"

"رات کو میں چوکیداری کرنے کو تیار ہوں۔ کیوں کرین؟" موتی نے شوخی سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"



"تمہارا گھر ہے موتی! یہاں آج تم لوگ نہ ہوتے تو مجھ پر کیا کیا نہ بیت جاتی۔" ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ شہپارہ کا چہرہ دیکھو تھکا دیا۔ قریب کو سے لمحے پر دل دھڑک رہا تھا۔

گانے کی محفل تو پہلے ہی اجڑ گئی تھی۔ سازندے بھی اپنا اپنا تان تنبورا سنبھال کے اندر چلے گئے۔ کرین حیدرآباد کے واقعات سنانے لگی اور شہپارہ سب کے سامنے میرے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ میں گھبرا گیا۔ اس کے سراپے سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کے آنکھیں پٹ پٹاتی رہی۔ پھر اس کے لبوں پر تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ یہی کیفیت میری تھی۔ "آپ ۔ آپ۔" وہ جھجک کے بولی۔ "میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ بولنا نہیں جانتے۔" میرا دماغ سن سنا گیا۔ کوئی معقول بات عقل میں نہیں آئی۔ وہ خود ہی سنبھل کے کہنے لگی۔ "میرا نام شہپارہ ہے۔"

"میں نے سن لیا ہے۔" میں بدحواسی سے بولا۔

وہ کچھ جھجکی۔ "آپ ان سے بالکل جدا معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ کا خیال ہے؟ ورنہ مجھے تو اپنے آپ میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "آپ ہی بتایئے آپ کو مجھ میں کیا چیز جدا نظر آتی ہے؟"

"یہی چیز کہ جب آپ آئے ہیں خاموش خاموش بیٹھے ہیں۔ نہ داد نہ بیداد۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو رقص و موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے اور جیسے آپ کو جبراً یہاں کھینچ کے لایا گیا ہے۔ کیسے میرا خیال درست ہے نا؟"

"مجھے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ آپ تو ان محفلوں کے عادی ہوں گے؟"

"نہیں میں پہلی بار کسی ایسی جگہ آیا ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"سچ؟" وہ تعجب سے بولی۔ "آپ بنا رہے ہیں۔"

"آپ جو سمجھیے۔" میں نے کسی قدر خفت سے کہا۔

"واقعی؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ بھلا آپ......" اس کی پتلیاں تھرکنے لگیں۔ "پھر تو آپ کو یہ سب کچھ اجنبی اجنبی لگ رہا ہوگا۔ سچ بتایئے۔ یہ ماحول آپ کو پسند آیا؟"

"سچ پوچھیے تو نہیں آیا۔ ممکن ہے بعد میں آ جائے۔"

"خدا نہ کرے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کیوں! آپ تو خوب یہاں۔ ۔ ۔" میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ تو بہت خوش خوش نظر آ رہی ہیں۔"

"ہاں بہت خوش ہوں۔" وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔

"آپ خوب گاتی ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اور خوب ناچتی ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ بھی تو کہیے۔"

میں نے چونک کے دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی صرف پلکیں نظر آ رہی تھیں جو تھرتھرا رہی تھیں۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ ان سب کی توجہ ہماری طرف مرکوز ہو گئی ہے۔ ہم معلوں چپ تھے اور وہ گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لے رہے تھے۔ موتی کا قہقہہ اٹھا تو مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ شہپارہ کے جسم کا تمام خون چہرے پر سمٹ آیا۔ ہماری گھبراہٹ سے سب کی کلکاریاں چھوٹ پڑیں۔ میری نازک نگاہی نے اور مہمیز لگائی۔

"ہم کو تمہاری نجریا نے مارا' نجریا نے مارا' مارا۔" کانتے نے کولہے پر ہاتھ رکھ کے مٹکتے ہوئے گایا۔ "دیکھا نا استاد!"

تجمل نے اچک کر اس کی گردن پکڑ لی۔ "میں تیری کھال اُدھیڑ دوں گا۔" وہ غرا کے بولا۔ "بھر بھر نے مجھے اپنا شانہ بنایا، پوری سب سے پہلے تیری ہی گردن پر آزمانا پڑے گا۔"

"وہ دن کب آئے گا؟" کانتے نے چاقو کھول کے کہا۔ "اس کی دھار بھی بہت بانکی ہے استاد! کاٹ دو۔"

شہپارہ اداس بیٹھی تھی کانتے کی باتوں پر اسے ہنسی آ گئی۔ کانتے نے ایک سرد آہ بھری۔ "استاد! کبھی کبھی مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ ساری بات گردن کے اوپر کھنچنے کی ہے اگر گردن بدل جایا کرتیں تو کتنا مزہ آتا۔ چھوٹی بھی کبھی بالڑے کی گردن اُدھار مانگ کے اِدھر آیا کرتا۔ اپنی قسمت بھی چند گھنٹوں کے لیے بدل جایا کرتی۔"

"کوئی فرق نہ پڑتا۔" موتی نے کہا۔ "گردن کے نیچے بھی ایک چیز ہوتی ہے اسے کہاں سے لاتا؟"

"استاد! میری مانو تو آج لاڈلے کو یہیں چھوڑ جاؤ' کچھ تو حرم ودم تو ٹوٹے۔ کرین، تم لاڈلے کے بارے میں کیا کہتی ہو؟" کانتے نے پوچھا۔

"میرا بس چلے تو انہیں یہیں رکھ لوں۔" کرین نے وارفتگی سے کہا۔

"ہے ہے ظالم!" موتی پر جیسے گریہ طاری ہو گیا۔

دیر ہو گئی تھی۔ تجمل جھنجلا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کرین نے اس سے کچھ دیر اور بیٹھنے کے لیے اصرار کیا مگر تجمل اٹھ چکا تھا وہ دوبارہ فرش پر نہیں بیٹھا۔ اس کے اٹھتے ہی سب ٹھنڈی سانسیں بھرتے' ہائے' ویلا مچاتے' انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ گئے۔ "اب کب آؤ گے؟" کرین نے تجمل کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کہا۔ "سال دو سال بعد پھیرا لگا جانا۔"

"جلدی آؤں گا کرین!" تجمل نے جواب دیا۔ "کوئی پریشانی ہو تو خبر کر دینا' کوئی ایسی ویسی بات ہو تو گلی سے کسی آدمی کو بلا لینا اپنے آدمی یہاں گھومتے رہتے ہیں۔"

"اور میرے لیے کیا حکم ہے؟" موتی نے کرین کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "آسنسول آؤ گی یا بس یہیں یہیں تک بات ہے؟"

"تم دل سے بلاؤ گے تو سر کے بل آؤں گی۔" کرین کھل کھلا کے بولی۔ "اور ابھی تو تم شہر میں ٹھہرو گے' جب تک یہاں ہو میرے حجرے پر روز حاضری یہ میرا حکم ہے۔"

شہپارہ سب سے پیچھے تھی مجھے یقین تھا کہ چلتے وقت وہ مجھ سے ضرور بات کرے گی اس لیے میں دانستہ اُن لوگوں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ در وازے پہ اس نے جھک کے تسلیم کی' میں نے آنکھوں کے اشارے سے جواب دیا۔ اس نے روشنی کے ایک جھماکے کی طرح مجھ سے قریب ہو کے چپکے سے کہا۔ "دیکھیے آپ پھر کبھی اِدھر نہ آئیے گا۔" اس سے قبل کہ کانتے ہمیں مڑ کے دیکھتا' وہ اپنا چہرہ چھپا کے مکان کے اندر واپس ہو گئی۔

جس وقت ہم یہاں داخل ہوئے تھے یہ پورا علاقہ جگ مگا رہا تھا۔ اب معلوم ہوتا تھا بلٹ چلی گئی ہے۔ روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ چھٹن صاحب پنواڑی کی دکان بھی بند ہو گئی تھی لیکن ابھی کچھ راہ گیر موجود تھے۔ کہیں کہیں کوئی دروازہ کھلا ہوا تھا اور گلیوں میں جگہ جگہ پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ تجمل کی رفتار تیز تھی گشت لگانے والے سپاہیوں کی نظر جب تجمل پر پڑی تو انھوں نے تجمل کی خیر خیریت دریافت کی۔ واپسی میں ہمیں بہت سے آدمی ٹکرائے' ان میں بیشتر تعداد تجمل کے آدمیوں کی تھی۔ وہ بات تجمل سے کرتے تھے اور گھور کے مجھے دیکھتے تھے۔ کسی کی نظر میں اشتیاق تھا' کسی کی نظر میں تجسس' کہیں خشونت تھی کہیں عقیدت۔ میں ان دو دنوں ہی میں بہت سے لوگوں کے چہروں سے آشنا ہو چکا تھا۔ کٹے پھٹے داغ دار ٹیڑھے میڑھے یہ چہرے کل اور آج تجمل کے اڈے پر آئے میری واپسی اور موجدار کی سرکوبی کی مبارک باد دینے آئے تھے۔ کرین کے اڈے میں بیٹھے ہوئے تجمل اور راہ چلتے ہوئے تجمل میں نمایاں فرق تھا۔ اب وہ اتنا خاموش نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی بڑھ گئی تھی' سینہ پھولا ہوا تھا' آواز میں غضب اور غصہ تھا جیسے وہ سب سے ناراض ہو اور جیسے کسی نے خلافِ طبع کوئی بات کہہ دی تو اس کا خون پی جائے گا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور یہ کہتا جا رہا تھا کہ تجمل اور اس کے آدمیوں کی طرف آنکھ اُٹھانے والے کی آنکھ نکال لی جائے گی' وہ کہتا تھا جس میں جو ہو وہ حسرت نکال لے کسی میں دم خم ہو تو سینہ ٹھونک کے سامنے آئے اور تجمل کے گریبان پر ہاتھ ڈالے' ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔ اس کی بے اندازہ لاف و گزاف سے مجھے خدشہ ہوا شاید تجمل ابھی تک موجدار کی موت کے سلسلے میں اُن اندیشوں سے پاک نہیں ہوا ہے جس کا اشارہ کانتے نے کیا تھا۔ اس کا ذہن ابھی تک آگندہ ہے۔ پھر پھر تجمل کی مستانہ واپسی لوگوں کی آمد رفت مبارک بادیں گھوشی اور موجدار کے ساتھیوں کی ہم رکابی اور سونا گاچھی میں ترانہ آمد کرین سے باتیں اور

واقعے میں انہماک دیکھ کے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اب پولیس جس سے موتی نکالتے اور گھوشی نے اس دوران میں کوئی ایسی بات نہیں کہی اندیشے میرے ذہن میں دوبارہ ابھرتے۔ جمل کی دیکھا دیکھی موتی نکالنے اس ملنے والے جمل کے دوسرے آدمی بھی بڑھ چڑھ کے باتیں کر رہے تھے مگر نے وہاں جمل یا اس کے کسی آدمی کے بارے میں اپنے تعلق کا معمولی سا نہیں کیا وہ سب بڑے تپاک سے ملے تھے۔

ہم گھر واپس پہنچنے میں دو بج گئے۔ موتی کو ایک علیحدہ کمرے میں سلا دیا اور میں بڑے کمرے کی چاندنی پر لیٹ گیا۔ جسم سخت اور کھردری زمین پر سونے کا عادی ہو گیا تھا تکیے کی عادت بھی جیل میں چھوٹ گئی تھی۔ نیند نہیں آئی نیند آتی نیند اس طرح آنے لگتی تو یہ دن کیوں آتے۔ نیند تو اسی دن سے اچٹ گئی جس دن کو دیکھا تھا وہ نیند کے ساتھ سب کچھ لے گئی خود بھی کانٹوں بستر ہی ہو گئی مجھے بھی کانٹے چبھو گئی۔ برابر کے کمرے سے جمل کی کھانسی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا میری وجہ سے کتنے لوگ جاگ رہے تھے میں یہاں آ کے جمل کا سکون درہم برہم کر دیا۔ پتہ نہیں موجدار کی لاش کے ساتھ واقعہ پیش آیا۔ جمل نے اسے کہاں چھپایا اور شورہ پشتوں کی زبانیں بند کرنے کیا ترکیب ایجاد کی میرے کل کا دھڑکا بے وجہ نہیں تھا کہ کسی وقت بھی سکتی ہے میرے پیروں میں تو بیڑیاں پڑی رہیں گی ہی، جمل اور اس کے کئی آدمی بھی اندر ہو جائیں گے۔ جمل کو جیل میں ڈالنے کے لیے پولیس کو ایک بہانہ درکار ہو گا کیونکہ جمل سارا الزام اپنے سر لے گا۔ جمل کے جو آدمی باہر رہ جائیں گے وہ ایک دوسرے کا خون کرتے پھریں گے اور اس شخص کا گھر ہی نہیں علاقہ تک اجاڑ دیں گے جس کے متعلق ذرا سا شبہ ہو گا کہ اس نے موجدار کی موت کی مخبری کی ہے۔

دوپہر سے ایک ہی بات میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ درمیان میں جمل کے چہرے پر سکون دیکھ کے اس گردش میں کچھ کمی ضرور آ گئی تھی مگر وہ سکون میری خوش فہمی تھی۔ کریم کے کان میں کچھ کہنے کے بعد جمل کے چہرے پر شکنوں کا جال اور گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے اب کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ دو ہی صورتیں میری عقل میں آتی تھیں۔ یا تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر کے اقبال جرم کر لوں کہ موجدار کے ساتھ اصل میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ میرا مقصد اسے مارنا نہیں تھا۔ پھر عدالت جو چاہے فیصلہ کرے قریب ترین سزا موت تھی۔ زندگی اور موت ویسے بھی میرے لیے یکساں تھیں مگر اس طرح میں جمل اور اس کے ساتھیوں کو عذاب سے نجات دلا سکتا تھا جو ایک صرف میری وجہ سے کسی بھی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے یا پھر میرے فرار میں ان کی نجات تھی۔ فرار ہو کے میں پولیس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا۔ فرار ہو کے میں کوراں کی تلاش بھی جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ کہیں تو ہو گی، کسی نہ کسی جگہ کبھی نہ کبھی وقت سے اور مولوی صاحب مجھے نظر آ ہی جائیں گے حالانکہ دھندلا ہی دیر ہو گئی لیکن امید ٹوٹے نہیں ٹوٹتی تھی۔ اسی امید میں میں نے چاند میاں کے گھر کا

گزر گیا تھا۔ چاند میاں کی باتوں سے یہ امید بھی ٹوٹ سی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس رات کے واقعے کے بعد جس رات کو راحیلہ مجھ سے جدا ہوئی تھی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ بدمعاش مجھے پھنسانے کے لیے بوجا کے ہاں لے گیا اور ایک فرضی غنڈے مینی کا نام بھی لے دیا۔ مینی کا شاید کوئی وجود نہیں تھا مگر یہ امید ہی مجھ سے چمٹ کر لاتی رہی۔ وہ دونوں غنڈے یا ان میں سے ایک اب تک ضرور موجود ہو گا جس نے مرا یک کنڈے سے اس منحوس رات میں ہم پر حملہ کیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی آخری سانس تک راحیلہ کی تلاش جاری رکھنی تھی اور یہ تبھی ممکن تھا جب میں یہاں سے فرار ہو جاتا۔

اور فرار کیسے ہو جاتا؟ باہر صحن میں جمیل کے کئی آدمی پہرا دے رہے تھے۔ دن میں اس کا امکان نہیں تھا کہ جمیل مجھے تنہا چھوڑے گا۔ ایک ہی واقعہ اسے میری طرف سے محتاط رکھنے کے لیے بہت تھا۔ جمیل کے آدمی شہر بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس بڑے شہر میں چھپنا آسان، فرار ہونا مشکل تھا جب تک جمیل کو مجھ پر مکمل اعتماد نہ ہو جائے کہ میں ایک بار تنہا باہر جا کے صحیح و سلامت واپس آ جاؤں گا وہ مجھے ایک قدم بھی اڈے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ جمیل میری طرف سے بری طرح کھٹک گیا تھا۔ میں نے ہی اُسے کل رات اشارۃً بتایا تھا کہ وہ لڑکی زرین نہیں ہے جس کے لیے میں مجمع میں چاند میاں پر جھپٹ پڑا تھا اسی لیے آج صبح میرے غائب ہو جانے کے بعد وہ سیدھا چاند میاں کے گھر پہنچ گیا اور جب میں اُسے وہاں نظر نہیں آیا تو اُس نے موجود اڈے کا رخ کیا۔ جمیل اس حقیقت سے بھی واقف ہو گا کہ چاند میاں کے مرنے کے بعد میری بے قراری میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ اس میں اُسے مزید شدت کا یقین ہو گا۔

میرے پیروں میں پہرے ہوئے تھے۔ ہر جگہ جمیل کی زنجیریں پڑی تھیں اور ایک زنجیر اس عمارت کے اوپر موجود تھی اس کا نام زرین تھا۔ یہ زنجیر میں نے خود اپنے پیروں میں ڈال لی تھی۔ کل شام سے میں اس کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ جمیل کے پیروں میں زرین کی زنجیر ڈال کے خود کہیں بھاگ جانا بھی مناسب بات نہیں تھی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ نسرین کے ہاں سے زرین کو لانے کے بعد یہ مسائل کھڑے ہو جائیں گے تب بھی اُسے نسرین کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میرے فرار کے بعد جمیل ہر طرح اس کی دل جوئی کی کوشش کرتا مگر جمیل کی زندگی ہر لمحے خطروں کی زد پر رہتی تھی۔ ایک بھینسے آزادی ہو کے جیسے جیل۔ لو یہ تو صرف میرا فیصلہ تھا۔ زرین کو بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے تھا۔ اس کی اپنی بھی تو ایک حیثیت تھی وہ بھی تو کچھ سوچتی ہو گی۔ کچھ خواب اس نے بھی تو دیکھ رکھے ہوں گے۔ زرین کے خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے سوچا ابھی اوپر جا کے اس کے فلیٹ کی کنڈی کھٹکھٹاؤں اور کہوں اب تم آزاد ہو جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ میں تمہارا اتنا خیال نہیں رکھ سکتا کیونکہ مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ وہ جانے دنیا کے کس کونے میں گم ہو گیا ہے۔

میری آہوں اور کروٹوں کی آہٹیں جمیل کے کانوں میں بھی پہنچ گئیں۔ اس کے کان اس کی آنکھیں میری ہی جانب لگی ہوئی تھیں وہ کھانستا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ تبھی جلائی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آ کے رک گیا۔ "جاگ رہا ہے لاڈلے؟" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر سوتا کیوں نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیند تو کل رات بھی تیری آنکھوں میں نہیں تھی اب سو جا لاڈلے سو جا۔" وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں بھی تو نیند نہیں آ رہی۔" میں نے تیکھے انداز سے کہا۔

"ہاں!" وہ گردن ہلا کے بولا۔ "میری نیند بھی اڑ گئی ہے۔"

"کیوں تمہیں کیا ہو گیا؟" میں نے تنک کے پوچھا۔

"پتہ نہیں لاڈلے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا ہو گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کیا بات ہے میں آ گیا ہوں۔"

اُس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ گھور کے مجھے دیکھا پھر تلخی سے کہنے لگا۔ "ظاہر ہی بات ہے۔ تو آ گیا ہے۔" اس کی تلخی کچھ اور گہری ہو گئی۔ "تو جو آ گیا ہے لاڈلے!"

اس کا لہجہ ہی ایسا تھا کہ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے یہاں آ کے تمہیں سکون دینے کے بجائے اور پریشان کر دیا۔ تم مجھ سے بہت ناراض ہو گے!"

"ہاں! میں تجھ سے بہت ناراض ہوں لاڈلے۔" وہ مضطرب ہو کے بولا۔ "تو ایسی باتیں کرتا رہے گا تو میں تجھ سے بالکل روٹھ جاؤں گا۔"

"تم بھی روٹھ جاؤ، مجھ سے سب روٹھ گئے ہیں۔"

اُس نے میرا سر اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "یہی تو آفت ہے کہ تجھ سے روٹھا نہیں جاتا۔ میں تجھ سے روٹھ نہیں سکتا۔"

"میں۔۔ میں۔" میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ "میں چلا جاؤں گا۔"

"چلا جائے گا؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "مجھے چھوڑ کے چلا جائے گا؟ مجھے معلوم ہے تو اتنا بزدل نہیں ہے۔"

"جب تک میں رہوں گا ڈر کوئی مصیبت آتی رہے گی۔"

"مصیبت یہ نہیں لاڈلے جو تو سمجھتا ہے مصیبت تو یہ ہے کہ تو کچھ سمجھتا نہیں۔" وہ پھر تڑپتے ہوئے بولا۔ "تجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

"مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے اور اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے میرے جانے سے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"کون سے حالات؟ یہ تو کیا بک رہا ہے؟" وہ کڑوے لہجے میں بولا۔

"حالات تمہارے سامنے ہیں جو کچھ ہوا، وہ اچانک ہو گیا۔"

"کیا تو میرے سامنے صفائی پیش کر رہا ہے؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"میں تمھیں حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"لاڈلے جھوٹ مت بول تُو نے حقیقت ہی تو نہیں بتائی" دُکھ حالات کا نہیں لاڈلے دُکھ تو یہ ہے کہ تُو نے حقیقت نہیں بتائی۔ یہ حالات اپنا اوڑھنا بچھونا ہیں کبھی دھوپ کبھی چھاؤں کبھی ہاتھ اوچھا پڑ جاتا ہے کبھی ٹھیک جا پڑتا ہے۔ تُو مجھے حالات سمجھانے چلا ہے۔"

"لیکن اس بار تم جھوٹ بول رہے ہو تم مجھ سے نہیں خود سے جھوٹ بول رہے ہو تم جانتے ہو اتنے لوگوں کا منہ بند کرنا کتنا مشکل کام ہے اور پھر لوگ بھی جب ہوں تمھیں حالات کی سنگینی کا پورا احساس ہے جس کا اظہار تم میرے سامنے کرنا نہیں چاہتے۔ تمھارا چہرہ بتا رہا ہے تمھاری آواز بتا رہی ہے۔"

"میری آواز، میرا چہرہ" وہ منہ چڑا کے بولا۔ "تُو نے ان میں جھانک کے ہی تو دیکھا لاڈلے۔ یہ حالات تو میں کسی طرح سنبھال ہی لوں گا ان حرام زادوں سے نمٹنا مجھے آتا ہے۔ میں تجھے آج اس بدنام جگہ جان کے لے گیا تھا تاکہ تجھے پتا چل جائے کہ مجھل کے سینے میں کتنی طاقت ہے۔ اس کی فکر نہ کر، یہاں بہت سے ہیں جو تیرے بجائے خود جیل جانے کو تیار ہو جائیں گے۔ پولیس جیل ان ہو جائیں انھیں دیکھنے کو جی چاہنے لگتا ہے جیل تو ہماری ڈیوٹی ہے لاڈلے۔ چھٹیوں میں ہم گھر آتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے میاں مٹھو، سارا شہر سنبھالا جا سکتا ہے پر تجھے سنبھالنا اور تجھ سے نمٹنا مشکل نظر آتا ہے۔ تُو سمجھ میں نہیں آتا۔ غم تو یہ ہے کہ تیری نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ لاڈلے لاڈلے" وہ بے چینی سے بولا۔ "مجھے رگ رگ پتے اس لیے نہیں بتانے تجھے کہ تُو آزاد ہو کے انھیں نوچنا کھسوٹنا شروع کر دے۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسروں کی دُکھتی رگیں نہ معلوم ہوں تو اس کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔ تُو تو جیسے نکل چلا آتے ہی ہاتھ دکھانے شروع کر دیے۔ کچھ تو تسلی کی ہوتی اور میں لاڈلے میری بات سن تیرے سر کی قسم چاقو تیرے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا۔ میں نے تجھے — بے قرار ہو گیا۔ مجھے تیری چاقو بازی دیکھنے کا شوق نہیں ہے۔ جب تُو جیل میں کتابیں پڑھتا تھا اور قلم سے لکھتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔"

"مجھے کیا، یہ خود پسند ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کے ناگواری سے کہا۔ "میں چاند میاں اور مجیدا کے پاس اپنی چاقو زنی کے جوہر دکھانے نہیں گیا تھا میں تو وہاں کسی اور کام سے گیا تھا۔"

"اور کیا چلا گیا تھا میری آنکھیں جیسے بند ہو گئی تھیں۔"

"میں اسے اتنا مشکل کام نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے تمھیں نہیں بتایا ورنہ بات بڑھ جاتی اور پھر مجھ سے اپنے سوا کسی کو بتایا بھی نہیں جاتا۔"

"کسی کو تو بتا دے لاڈلے اتنا مت خوف کر۔"

"کیا بتاؤں؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"کون ہے وہ کہاں ہے کدھر ہے؟"

"کون؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہی جو تجھے جیل سے لے گئی تھی، کون ہے وہ کدھر رہتی ہے؟"

"کاش میں اُس کا پتہ جانتا؟ میں نے تمھیں کل ہی یہ بتا دیا تھا۔"

"چاند میاں کو اس کا پتہ معلوم تھا؟"

"میں اسی خیال سے اس کے پاس گیا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن اس کا پتہ نہیں چلا" وہ تیزی سے بولا۔ "جہاں تک اپنا دماغ کام کرتا ہے لاڈلے اُڑ پھپھار رہا ہے سات سال کا پھیر پڑ گیا ہے۔ سات سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو، ہو بھی یا نہ ہو۔"

"ایسا مت کہو" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہو گی۔"

"مجھے بتا وہ تجھے کہاں اور کب ملی تھی؟"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس نے میرے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تو ناراض ہونے لگا۔ "یہ اپنا چہرہ کیوں چھپاتا ہے سالا مجھل کا لاڈلا مجھل کے ہوتے ہوئے آنکھوں میں پانی لاتا ہے۔"

"مجھے جانے دو، میں اسے تمام دنیا میں ڈھونڈوں گا۔"

"کوئی کسی کو اس طرح سے ڈھونڈتا ہے بیٹا۔ تُو نے سات سال تُو نے جیل میں بتائے ہیں ذرا سا وقت ملا تو اتنا تیز بھاگنے لگا۔ آنکھ میں پانی آ جائے تو چیزیں صاف نظر نہیں آتیں۔ تیز بھاگنے میں سانس پھول جاتا ہے۔ تُو نے کتابیں ہی کیا پڑھ لی ہیں؟ تُو تو اپنے آپ کو الجھا رہا ہے وحشی۔ کام خراب کر رہا ہے۔ اس طرح وہ تجھے تھوڑی مل جائے گی۔ دیکھا بدحواسی میں بات اور خراب ہو گئی۔ یہ کام طریقے سے بھی ہو سکتا تھا میری مان جاتی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کر۔ میں اس لیے تجھ پر زور دیتا ہوں کہ جو غور میں نے نہیں کیا تھا۔ لاڈلے تیرے پاس وقت ہے۔ مجھ میں جب سمجھنے کی قوت آئی تو وقت نکل چکا تھا۔ تُو بھی وہی کر رہا ہے۔ بتا جیل میں چلا جائے گا تو اسے کیسے تلاش کرے گا۔ ایک جگہ سے بچ گیا ہے دوسری جگہ پھنس جائے گا۔ اوسان ٹھیک رکھ۔ پہلے اپنے آپ کو تلاش کر۔"

"جو تم کہتے ہو وہ میں بھی سوچتا ہوں مگر وہ مجھے بہت یاد آتی ہے۔ تمھیں کیا پتہ ہے میں نے اُس کے لیے کن کن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔"

"اور کیا حاصل ہوا؟"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں مجھل کو بتاتا، ابھی نہیں جانتا تھا کہ میں نے اس لڑکی کے لیے اپنے ابا، امی اور بہن بھائیوں کو چھوڑ دیا۔ میرے آبائی گھر میں اب دوسرے لوگ رہتے ہیں۔ میری امی مر گئی ہیں۔ میری رہائی کرانے کو لوگوں نے پیچھے کوشش کی تھی اور ابھی لوگوں نے میرے ساتھ رہنے نہیں دیا۔ مجھل کو کیا اندازہ تھا کہ میرا سینہ کیسا ہے، میرے اندر بار بار آگ لگتی ہے۔ میرا جی دیواروں سے سر پھوڑنے کو چاہتا ہے۔ میرا جی کرتا ہے کہ اپنے جسم پر چاقو کے لاتعداد گھاؤ لگاؤں کہ کوئی جگہ

باتی نہ سے تجمل مجھے سمجھاتا بجھاتا رہا اور اس کی باتیں سمجھنے کے سوا میرے پاس راستہ بھی کیا تھا۔ ہر راستے پر تجمل بیٹھا تھا، ہر چوراہے پر پولیس موجود تھی، ایسی حالت میں کوئی کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ "تو آج زریں کے پاس بھی نہیں گیا؟" تجمل ناراضی سے بولا۔

"وقت ہی نہیں ملا۔" میں نے اداسی سے جواب دیا۔

"وہ کیا سوچتی ہوگی، اُسے لا کے قید کر دیا۔ صبح اٹھ کے فوراً وہاں جانا اور دیکھیں صبح تیری یہ حالت نہ دیکھیں۔ سمجھ لاڈلے ایسے وقت میں تو اداس رہ کے مجھے پریشان کرے گا۔ اس وقت تیرا سنبھلے رہنا ضروری ہے۔ میری خاطر کچھ وقت اور گزار لے۔ اب تو سو جا، چل لیٹ جا۔" اس نے میرے کندھے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ اس نے ایک تکیہ میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ کچھ دیر کمرے میں ٹھہرا رہا، پھر ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا اور گہری گہری سانسیں لیتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تک کہ کمرے کی سیاہی اجلی ہونے لگی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر گیا تو نصیب میاں اور دو کر لوگ ورزش کر رہے تھے۔ کوئی دیوار پر لگے تکیے پر گھونسے لگا رہا تھا، کسی کا سر نیچے اور پیر اوپر تھے۔ نصیب میاں بنیان پہنے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں کھولنے کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ورزش ختم کر دی اور بلند آواز میں بولا۔ "آہا آفتابِ عالم تاب طلوع ہو گیا۔" پھر اس نے خاص انداز میں آنکھیں میچیں اور کہنے لگا۔ "از راہِ خدا اس نابکار کو پھر آزمائش میں نہ ڈال لیجئے گا، جو کچھ دن رہ گئے ہیں وہ رسوائی میں گزریں گے۔ غلاموں کی ہم رکابی کے بغیر باہر جانے کا قصد کیجئے۔ سرکار کی سواری دھوم دھام سے نکلنا چاہیے۔"

میں نے توجہ نہیں دی، وہ اپنے ساتھ چائے کی ایک پیالی پینے کی آوازیں لگاتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں زریں کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تیزی کی وجہ سے میری سانس اکھڑ گئی تھی۔ کسی نے نہایت عجلت میں دروازہ کھولا۔ وہ زریں ہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ دوپٹا شانے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ شاید اسے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آئی کہ میں ہی اس کے سامنے موجود ہوں۔ پھر اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں اور وہ مجھے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ "تم نے کل میرا انتظار کیا ہوگا۔" اس کی شکایت سننے سے پہلے خود میں نے ہی پہل کر دی۔ "کل دن بھر مصروفیت رہی۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ "کیا حال ہے؟ جی تو نہیں گھبرا رہا ہوگا؟" اُسے چپ دیکھ کے میں نے گھبرا کے پوچھا۔ "کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"نہیں تو۔" اس نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔ "کوئی پریشانی نہیں۔"

"ناشتہ کر لیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں اور تم نے؟" اس نے نظریں اٹھا کے پوچھا۔

"میں نے بھی نہیں کیا، سوچا تمہارے ساتھ کروں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر سرخ لہریں آ کے گزر گئی ہیں۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"ماما سے کہہ دو۔"

"میں خود لاتی ہوں، وہ اور اس کی بیٹی مجھے کام ہی نہیں کرنے دیتیں۔" وہ فوراً باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں اندر کمرے میں آ کے اس کی مسہری پر بیٹھ گیا۔ چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ رسالے اور کتابوں کا ایک ڈھیر میز پر رکھا تھا۔ اس وقت بھی بجلی چل رہی تھی۔ مجھے اس کے بستر سے اس کی خوشبو آتی محسوس ہوئی، ایسی ہی خوشبو کہ اس کے جسم سے آتی تھی۔ جب میں نے اس کا سر دبایا تھا تو اس کے بالوں میں بھی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار تکیہ منہ سے لگا لیا۔ زریں کے قدموں کی چاپ سے مجھے ہوش آیا۔ اس نے ٹرے میز پر لا کے رکھ دی اور میرے سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ اس دوران اس نے منہ بھی دھو لیا تھا۔ بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ دوپٹے سے سر ڈھک لیا تھا۔ اتنی جلدی وہ ناشتے کا سامان لے آئی تھی۔ "شروع کرو۔" اس نے مجھے گم دیکھ کے کہا۔

"ہاں تم بھی تو شروع کرو۔" میں نے جھجک کے کہا۔

اس نے پوری کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور سر جھکا کے کھاتی رہی۔

"میں نے کل دن بھر تمہارا انتظار کیا۔" وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔

"بس کل دن بھر الجھنیں ہی رہیں۔"

"مجھے تمہاری مصروفیت کا تھوڑا بہت علم ہو گیا ہے۔" میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ "گھبراؤ نہیں، اب مجھے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم ہوا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی جو کل ہوا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کل کیا ہوا؟" میں نے جھینپ کے پوچھا۔

"معلوم ہوا کہ تم نے چاند میاں اور مرجدار سے بدلے لیا اور بھی بہت سی باتیں مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہوئیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس معلوم ہو گیا۔ تم نے ناشتے سے ہاتھ کیوں اٹھا لیا؟"

"پہلے بتاؤ یہاں کون آیا تھا؟"

"کوئی بھی نہیں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "مجھے تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔" اس کا انداز شکایت کا ہو گیا۔

"ضرور یہاں کوئی آیا تھا اور تمہیں کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں؟"

"مجھے معلوم ہوا کہ تم نے ایک لمبی مدت جیل میں گزاری ہے۔" وہ سکون سے بولی۔ "تم پر قتل کا الزام تھا۔ جیل میں تم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔"

"اور کیا کیا؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"بس ابھی اتنا ہی کچھ معلوم ہوا ہے۔"

"اور تمھیں ڈر نہیں لگا؟ تمھیں مجھ سے نفرت نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ شرما گئی۔

"تو مجھ پر ترس آیا ہو گا؟"

"ہاں یہ کہہ سکتے ہو۔" وہ خوشی سے بولی۔

"گویا تمھیں اس ماحول کا خوب اندازہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں میرے لیے یہ سب باتیں نئی ہیں جو میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مگر تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟" وہ روانی سے بولی۔

"کچھ نہیں، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔"

"کیا بات؟" وہ چونک کے بولی۔

"زرین! اچھا ہوا تمھیں کسی ذریعے سے سہی اس ماحول کا اندازہ ہو گیا۔ میں تم سے اسی سلسلے میں بات کرنے آیا تھا۔ نسرین کے گھر سے نکلنے سے پہلے اور بعد کو میں راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ تمھیں ساتھ لے کے کہاں جاؤں، ہر جگہ نظر دوڑائی اس کے سوا کوئی جگہ نظر نہیں آئی مگر ظاہر ہے یہ تمھارے لیے مستقل جگہ نہیں ہو سکتی یہ تو ایک عارضی پناہ گاہ ہے۔ یہاں عجیب عجیب لوگ رہتے ہیں، تم ایک بڑے خاندان کی مہذب لڑکی ہو۔ کچھ دنوں بعد تمھیں اس ماحول سے خوف آنے لگے گا۔ یہاں کسی کا کوئی بھروسا نہیں کہ وہ کب جیل میں چلا جائے یا قتل ہو جائے۔ یہاں ایک دوسرے پر لوگ جان چھڑکتے ہیں، میں جب اُدھر دیکھتا ہوں اور جب تمھیں دیکھتا ہوں تو میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔"

"اتنے پریشان نہ ہو۔ میری کوشش ہو گی کہ میں یہاں اپنے آپ کو گراں محسوس نہ ہونے دوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "اب یہی میرا خاندان ہے یہی میری تہذیب ہے۔"

"پھر بھی زرین! تمھیں اپنے متعلق کچھ نہ کچھ سوچنا ضرور ہو گا۔" ابھی ابھی وہ شکیلہ سے گفتگو کر رہی تھی اتنی سی دیر میں بدل گئی۔ مجھے یاسیت سے دیکھنے لگی اور بے چینی سے اپنے دوپٹے کا گوٹا اُدھیڑنے لگی۔ "زرین۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو بہت خوب صورت ہو ایک اچھی لڑکی میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب تم میں موجود ہیں یہ جگہ تمھارے رہنے کی نہیں کیونکہ یہاں کے مکین خود اپنی جان ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں۔"

"مجھے ان مکینوں سے کوئی غرض نہیں۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "یہ سب لوگ اچھے ہیں انھوں نے مجھے پناہ دی ہے اور پھر تم جو موجود ہو۔"

"میں ـــ میں ـــ میں کہاں ہوں تم مجھے شرمندہ مت کرو۔"

"کیوں! کیا تم مجھے راستے میں چھوڑ جاؤ گے۔ اب میرا کون سا گھر ہے کیا میں وہاں واپس جا سکتی ہوں وہ لوگ مجھے پہلے ہی کون سا گھر میں رکھے ہوئے تھے۔"

"میں تمھیں کیسے بتاؤں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "مجھے خود یہاں نہیں رہنا، مجھے بہت دور جانا ہے۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"نہیں میں تمھیں ساتھ نہیں لے جا سکتا، نہ جانے مجھے کہاں کہاں جانا پڑے، میرا کوئی یقین نہیں ہے، میں اگر یہاں بھی رہوں تب بھی اپنے آپ میں نہیں ہوں گا۔"

دعوت

میزبان: عبدالناصر۔ راولپنڈی

◆ "انسان کا پیٹ اس کا دشمن ہے" ــــ عربی کہاوت
◆ "شکم سیری آدمی کو کند ذہن بنا دیتی ہے" ــــ فرینکلن
◆ "بھوک سے پہلے کھانا مکروہ بھی ہے اور مذموم بھی" ــــ غزالی
◆ "کھانے کے لیے زندہ نہ رہو بلکہ زندہ رہنے کے لیے کھاؤ" انگریزی کہاوت
◆ "گھر بیگانہ سہی، پیٹ تو اپنا ہے" ــــ پنجابی کہاوت
◆ "پیٹو خود اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودتا ہے" فرانسیسی کہاوت
◆ "تلوار سے اتنے آدمی نہیں مرتے جتنے بسیار خوری سے مرتے ہیں" بو علی سینا
◆ "اتنا کھاؤ، جتنا ہضم کر سکو" ــــ بو علی سینا

"آخر وہ کون سی بات ہے جو تمھیں اس قدر الجھائے ہوئے ہے۔"

"میں تمھیں کیا بتاؤں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"تمھارا غبار دل ہلکا ہو جائے گا۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی اپنے سینے میں محفوظ کر لوں گی مجھ پہ اعتبار کرو۔"

"زرین! وہ کوئی راز نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"پھر کیا ہے؟ تمھیں آخر کیا پریشانی ہے۔"

"کوئی پریشانی نہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "اپنے آپ سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ میں اپنی ضمانت نہیں دے سکتا۔ میرا دل دنیا میں نہیں لگتا۔" میں نے اُس کا چہرہ دیکھنے کے لیے سر اٹھایا۔ "تم کہتی تھیں تمھاری ایک بڑی جاگیر ہے جس پہ تمھارے بد دیانت خالو نے قبضہ کر لیا ہے زرین تم اپنے گھر جا کے ایک نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔ میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں تمھارے خالو کو تمھارے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اپنا گھر پھر اپنا گھر ہوتا ہے تم کہیں بھی سکون سے نہ رہ سکو گی تم میرے ساتھ چلو اگر وہ نہ مانے تو میں تمھیں واپس لے آؤں گا۔ پھر ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈ لیں گے۔"

"میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں کون مجھے اتنے دنوں کی گمشدگی کے بعد قبول کرے گا۔ میں کس منہ سے وہاں جاؤں گی۔"

"وقت اور تمھارا رویہ ہر تلخی دور کر دے گا۔"

"نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ تیز آواز میں بولی۔ "میں اب وہاں نہیں جا سکتی۔ اس سے تو بہتر ہے تم میرا گلا گھونٹ دو۔"

"زرین۔ ایک بار تمھیں اور آزمانے میں کیا حرج ہے۔ میں تو تمھارے ساتھ رہوں گا۔ ان سے بات کر لیں گے، وہ کیسے نہیں مانیں گے، وہ تو تمھیں دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جائیں گے اور ہر حالت میں مفاہمت پہ آمادہ ہوں گے اب تک تم وہاں غضب کے اور گھٹن کے دور میں تھیں اب تم ذرا ہمت اور حوصلے سے بات کرنا۔ میں تمھاری خیریت پوچھتا رہوں گا۔ تم اپنی جاگیر کسی اور کے نام کر کے

اپنے خالو کی دست برد سے محفوظ رہ سکتی ہو ہزار طریقے نکل آئیں گے۔ ہمت پیدا کرو زرین! میں تمھارے بھلے ہی کے لیے اصرار کر رہا ہوں۔ میں تمھارا دشمن نہیں ہوں ورنہ میں تمھیں یہاں کیوں لاتا۔ وہاں اگر تمھیں کوئی پریشانی ہو تو مجھے خط لکھ دینا' تجمل کو تار دے دینا۔ ایک نہیں کئی کئی آدمی تمھاری مدد کو آجائیں گے۔ مگر جب تک تم خود بے حوصلہ رہو گی' کوئی بھی تمھاری مدد کو نہیں آسکے گا۔"

اس نے منہ پھیر لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں اُسے جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ میں بدحواس ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کس طرح اُسے خاموش کروں۔ اس کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ جھجکتے جھجکتے اس کی کرسی کے پاس پہنچا۔ مجھے معلوم تھا آدمی کب روتا ہے۔ دل میں کھلبلی مچتی ہے جب ڈرتا ہے' آنکھیں جلنے لگتی ہیں جب لڑتا ہے۔ اس وقت مجھے خود پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اُسے بیٹھے بٹھائے رلا دیا۔ وہ ابھی کتنی شوخی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے اس انداز میں دیکھا تھا۔ مجھ سے اس کی شوخی دیکھی نہیں گئی۔ میں خوش نہیں ہوں تو شاید میرا جی چاہتا ہے دنیا کا ہر آدمی ناخوش رہے۔ جی میں آیا کہہ دوں تم ہنسو مگر نہیں۔ میں تمھاری نگہبانی کرتا رہوں گا کیونکہ میں تمھیں نسرین کے ہاں سے لایا ہوں۔ زبان سے یہ لفظ ادا نہیں ہو سکے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پا کے اُس کا سر اُٹھانے کی کوشش کی۔ پھر ہاتھ اس کے بالوں سے مس ہوتے تو لرزنے لگے۔ "زرین۔ زرین!" میری ڈگمگاتی ہوئی آواز ابھری۔ "زرین۔ میں نے تمھارے لیے ایک تجویز سوچی ہے تم اس پر سکون سے سوچ سکتی ہو۔ ہم کسی دوسری ترکیب پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ تم تو ایک بہت اچھی بات پر رونے لگیں۔ مت روؤ۔ مت روؤ۔ ورنہ میں تمھیں چھوڑ کے کہیں چلا جاؤں گا۔ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

میری بات بے اثر نہیں ہوئی۔ اُس نے سر اُٹھا کے مجھے دیکھا تو مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ "میں دوپہر کو آؤں گا۔" میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ "نیچے میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ جب میں دوپہر کو آؤں تو تم میرے لیے میٹھے چاول پکا کے رکھنا' مجھے میٹھے چاول کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا اور میری بات پر سکون سے سوچنا۔" یہ کہتا ہوا میں وحشت میں وہاں سے بھاگ آیا۔ اتنی تیزی سے کہ سیڑھیوں سے پھسل گیا۔ گھٹنے اور کولھے میں چوٹ آگئی مگر بڑے پھاٹک کے آگے کھڑا ہوا نیچے تجمل میرا انتظار کر رہا تھا۔

*

اندر کمرے میں جہاں میں رات سویا تھا' محفل جمی ہوئی تھی۔ موجود ادھر کے آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ موتی تجمل کے بائیں طرف اور نصیب میاں دائیں طرف تھے۔ درمیان میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے تجمل پیچوان پی رہا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی شور مچ گیا۔ موتی نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ تجمل کے سامنے شہر کے مختلف حصوں کی سرگرمیوں کی رُوداد پیش کی جا رہی تھی۔ فلاں علاقے میں مندی ہے' فلاں میں تیزی ہے۔ اُدھر پولیس کا دباؤ بڑھ گیا ہے۔ اِدھر پیالہ والے کا ڈی ایس پی تبدیل ہو کے جالندھر چلا گیا ہے۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کسی نے آ کے اطلاع دی کہ گنشی داس اُستاد سے ملنے کے لیے آیا ہے۔

موتی چونک پڑا' کانتے بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گنشی داس کا نام پر سارے کمرے میں بھنبھناہٹ ہونے لگی۔ تجمل نے اُسے دوسرے کمرے میں بٹھانے کا حکم دیا۔ "کچھ پہلے ہی آگیا۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "آ موتی' گھوڑشی نصیب میاں لگے..." تجمل اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے بولا اور میرا ہاتھ پکڑ کے باہر صحن سے ... میں آگیا۔ یہاں ایک چوکی بچھی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر مونڈھے پڑے تھے۔ حقے ... تجمل کا حقہ اس کے سامنے رکھ کے چلا گیا۔ تجمل نے مجھے اپنے ساتھ چوکی پر بٹھا لیا۔ چند منٹ بعد سیٹھ گنشی داس دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں نمودار ہوا۔ دونوں آدمیوں نے بڑے بڑے خوان سر پر اُٹھا رکھے تھے۔ سیٹھ نے آگے سب سے پہلے سب کو پرنام کیا۔ اس کا انداز بالکل ملا ہوا تھا۔ تجمل نے اُسے مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر نرمی سے پوچھا۔ "کیا حال ہے سیٹھ؟"

"اُستاد رات میں نشے میں تھا' کچھ خیال نہیں رہا۔"

"کوئی بات نہیں سیٹھ۔ رات تم اگر نشے میں نہ ہوتے اور صبح یہاں آجاتے تو بھی ہمارے دل کے دروازے اسی طرح کھلے ہوئے ملتے۔"

"مجھے بہت دُکھ ہے اُستاد پر مجھے پسند بہت ہے۔ وہ ٹیلے بیچے ہیں ..."

"کرنی سے بات کرلو' ممکن ہے وہ مان جائے مگر وہ قیمتی سے نہیں ہلے گی۔ تمہیں اُٹھانے سے پہلے یہ خیال کرلینا کہ اس کی پہنچ بہت دور ہے۔"

"رات کی بات جانے دو۔" میں نے کہہ دیا' "مجھے دُکھ ہے' میں نشے میں تھا۔" سیٹھ نے تنگ کے کہا۔ "اب اُس کا ذکر مت کرو۔"

"جانے دو۔" تجمل بے پروائی سے بولا۔ "پر سیٹھ ایک بات سن لو زیادہ نشہ ہر چیز کا بگاڑ ہوتا ہے۔ طاقت کا' دولت کا' حسن کا' شراب کا۔"

"میں سمجھتا ہوں اُستاد۔" سیٹھ نے نظریں جھکا کے کہا۔ "یہ خوان نذر کے لیے لایا ہوں اسے قبول کرلو۔"

"اس کی ضرورت نہیں سیٹھ' اسے واپس لے جاؤ' تمھارا آنا ہی بہت ہے۔"

"نہیں اُستاد' یہ تو تمھیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔" تجمل کے انکار پر اس کا اصرار بڑھ گیا اور اُس نے خوان قبول کیے بغیر رخصت ہونے سے انکار کر دیا۔ تجمل نے اُسے قبول کر لیا۔ نصیب میاں نے ذرا چائے کا اہتمام کیا۔ جب خوانوں سے سرپوش اُٹھائے گئے تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تجمل نے خوان پوش ڈھک دیا اور سیٹھ سے اس کے کاروبار کی جگہ اور کام کے متعلق پوچھنے لگا۔ سیٹھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ سب سے ہاتھ ملایا۔ جب وہ میری طرف آیا تو اُس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ "لالہ جی۔" وہ زیر لب مسکرا کے بولا۔ "میری خواہش ہے تم میرے ساتھ کام کرو اور اگر کبھی تمھیں میری ضرورت پڑے تو بے جھجک چلے آنا۔"

"شکریہ۔" میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

"اُستاد کبھی آپ لوگ اس طرف آئیں تو یہاں ایک مجرے کا انتظام کرا دیا جائے..."



وہ عجیب انداز میں بولا "موتی ابھی تو آپ یہاں ہیں۔"

"ہاں۔ مگر دیکھو سیٹھ شہر پارہ نہیں لگنے دے گی۔"

موتی کی بات پر کانٹے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سیٹھ اور تجمل نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ سیٹھ کے جانے کے بعد تجمل نے دونوں خوان نصیب میاں کے حوالے کیے کہ وہ انہیں اپنا اور جمعدار کے آدمیوں میں تقسیم کر دے۔ پچھلی رات کا واقعہ تھا۔ سیٹھ کی اچانک آمد میرے لیے حیرت کی بات تھی مگر تجمل کے بُشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے سیٹھ کی آمد کا پہلے سے یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے سیٹھ کی آمد سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سیٹھ آج رات پھر شہر پارہ کے پاس جائے گا۔ شہر پارہ اس کے سامنے ناچے گی اور سیٹھ للچائی نظروں سے اسے دیکھتا رہے گا۔ اس کا جی بھر جائے گا۔ وہ تھک جائے گی اور کرنسی نوٹوں کے لالچ میں اسے سیٹھ کے حوالے کر دے گی۔ مگر مجھے یہ سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔

مجھے حسب عادت زریں کے پاس میٹھے چاول کھانے کے لیے جاتے ہوئے جھجک ہوئی تھی۔ میں سہ پہر تک نہیں گیا پھر زریں نے مجھے ملا کے ہاتھ خود ہی بلوا لیا۔ اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے کوئی اور بات نہیں کی۔ چاول کیسے ہیں، اچھے ہیں، بس یہی بات ہوئی۔ اس نے بہت لذیذ چاول پکائے تھے۔ مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔ سکول سے واپسی پر امی بطور خاص میرے لیے میٹھے چاول چھپا کے رکھ دیتی تھیں کہ انہیں کوئی اور نہ کھا جائے۔ رات کو تجمل پھر مجھے اپنے ساتھ لے کے مختلف علاقوں میں گھمانے نکل گیا۔ نئے علاقے لوگوں سے بھینٹ ہوئی۔ تجمل کی ٹیکسی پیچھے پیچھے اور کئی گلیاں تھیں وہ کئی ہوٹلوں، جوئے خانوں اور شراب کے اڈوں پر گیا اور اس نے پچھلی رات والی تناتنی کا مظاہرہ کیا۔ ایک بڑے علاقے کا چکر کاٹتا ہوا تجمل آدھی رات کو اڈے پر واپس آیا۔ میں موقع کا منتظر تھا۔ رات کو جب خاموشی چھا گئی تو میں نے اس کے کمرے میں جا کے زریں کا ذکر کیا کہ وہ مجھے کہاں اور کیسے ملی اور کہاں سے آئی ہے۔ میں نے اسے زریں کے متعلق ساری بات بتا دی اور اس سے اصرار کیا کہ زریں کی بہتری اسی میں ہے کہ اسے اس کے گھر فیض آباد پہنچا دیا جائے۔ اس نے میری باتیں درمیان میں کوئی دخل دیے بغیر اطمینان سے سنیں۔ "زریں کی منشا کیا ہے؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"اس کی منشا نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"پھر تو اسے اس جہنم میں دوبارہ کیوں رسید کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اس لڑکی کو بیٹی کہا ہے۔ وہ کیا کہے گی کہ باپ نے بیٹی بنالیا۔ بنا کے بھیڑیا جا سو جا تو تو کبھی کبھی بالکل بچہ بن جاتا ہے۔"

میں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی اور جن باتوں سے زریں کو قائل کرنا چاہا تھا وہ اس کے سامنے دہرا دیں۔

"میں نے تو کچھ اور سوچا تھا لالے، زریں بہت ہی خوب صورت لڑکی ہے بہت بھولی بھالی۔ تو کیا کھٹو بن گیا ہے۔"

"تم میری باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتے۔ اس کی ایک بڑی جاگیر فیض آباد میں ہے وہ اسے مل جائے تو وہ اطمینان سے رہ سکتی ہے۔"

"وہ لڑکی ہے اور جوان ہے لالے۔ لڑکی کے لیے جاگیر اس وقت تک بے کار ہوتی ہے جب تک کوئی اسے سنبھالنے والا نہ ہو۔ نہیں نہیں۔" میری ضد ______ سے وہ جھنجلا گیا اور ناراض ہو کے کہنے لگا۔ "لالے! وہ اس چار دیواری سے تبھی باہر نکل سکتی ہے جب خود اس کی منشا ہو۔ میں تجھے اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

اس کے بعد تجمل سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں خفا ہو کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے دوسرے دن اس سے بات بھی کم کی۔ دوسرے دن رات کو وہ پھر مجھے گھمانے لے گیا۔ میں بے دلی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ دوسرے دن دو مرتبہ زریں کے پاس بھی گیا اور چند لمحے ٹھہر کے واپس آ گیا۔ بہر حال راستہ بند تھا۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں تجمل نے شاید جمعدار کے اڈے کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر دیا تھا کیونکہ تجمل کے انداز میں اب اُتنا اکھڑ پن نہیں رہا تھا۔ شاید جمعدار کا معاملہ تجمل کی مرضی کے مطابق دب گیا تھا۔ گھمنڈی کو مستقل طور پر جمعدار کے اڈے پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ ساتھ میں تجمل کے آدمی بھی تھے۔ پہلے دن میں نے ان لوگوں کے یہاں کا جو حال سنا تھا وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ دن بھر یہاں لوگوں کی بھیڑ رہتی۔ سب وہ لوگ جو تجمل کے ساتھ رہتے تھے اڈے سے نکل جاتے۔ پھر وہ لوگ آتے رہتے جو یہاں نہیں رہتے تھے۔ کوئی سلام کرنے آتا، کوئی ڈنکے کی چوٹ رشوت دیتا، کوئی صرف کانٹے سے بات کرتا۔ کسی کا تعلق صرف شمول سے تھا، کوئی نقدی کے پاس کے روپے جمع کرا دیتا تھا۔ یہ سب مال اکٹھا کر کے نصیب میاں کے حوالے کر دیا جاتا جو ایک بڑے سے رجسٹر کھاتے میں اس کا اندراج کرتا۔ زیادہ بات زبانی ہوتی تھی۔ تجمل بیٹھا بیٹھا حقہ پیتا رہتا یا غصہ ہوتا یا خوش ہوتا یا گالیاں دیتا یا آنے والے لوگوں سے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ میں نے محسوس کیا جب میں سامنے آتا ہوں تو موضوع کچھ بدل سا جاتا ہے۔ بیچ بیچ سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں پھر تجمل مجھے ساتھ لے کے دوسرے کمرے میں چلا آتا ہے۔

"مجھے یہاں آئے ہوئے دس دن سے زیادہ گزر چکے تھے۔ میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ یا تو کمرے میں تنہا خاموش بیٹھا رہوں یا ان لوگوں کی باتیں سنتا رہوں موتی

مستقل واپس چلا گیا تھا۔ جب طبیعت بہت گھبراتی تو میں زریں کے پاس چلا جاتا۔ لیکن وہاں کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ اُسے دیکھ کے مجھے کرارا یا وہ تنے لگتی اور میں گھبرا کے پھر نیچے آجاتا۔ اور پھر اس کے پاس چلا جاتا۔ زریں کے لمبے بال اور بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت بھلی لگتی تھیں۔ اب وہ عموماً سوئی ہوئی رہتی تھیں۔ جب میں واپس نیچے آتا تو خود کو ملامت کرتا کہ اس کے سامنے مجھ سے بات کیوں نہیں کی جاتی۔ جو سوچ کے جاتا ہوں وہ بھول کیوں جاتا ہوں اور یاد آتا ہے تو دہرانے کی ہمت کیوں نہیں پڑتی۔ سو ایک دن میں ارادہ کر کے گیا کہ آج اس سے ضرور بات کروں گا۔ اُس نے حسبِ معمول مجھے چائے پیش کی اور میرے سامنے خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے لب کھولنے کی جرأت کی جیسے آج میں پہلی بار اس سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "زریں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیا۔ کیا بات ہے؟" وہ سٹ پٹا گئی۔ "طبیعت تو خراب نہیں ہے؟"

"زریں۔" میں نے اضطراب سے کہا۔ "میں مر جاؤں گا۔"

"نہیں۔" وہ سراسیمگی سے مجھے دیکھنے لگی۔ "آخر تمھیں کیا غم ہے؟"

"میرا غم یہ ہے کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ کاش یہ ایک گاؤں یا ایک شہر کے برابر ہوتی۔"

"تو پھر کیا ہوتا؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"پھر شاید مجھے قرار آجاتا۔"

"مجھے بتاؤ تمھیں کس طرح قرار آسکتا ہے؟" وہ بے چینی سے بولی۔ "میں تمھارے کسی کام آسکتی ہوں۔ میں تمھارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"

"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اور اس پریشانی میں تمھیں میری پریشانی بھی لاحق ہو گئی۔"

"ہاں۔ تم میری بات مان لیتیں تو اچھا ہوتا۔ اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ میں تمھیں بار سمجھتا ہوں۔ میں تم سے پیچھا چھڑا رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمھاری اور اس جگہ کی تمام باتیں ذہن میں رکھ کے یہ تجویز پیش کی تھی۔ میں تم سے رخصت نہیں لے رہا تھا۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا۔ کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"یہی کہ تم جہاں کہتے ہو میں وہاں چلی جاؤں گی چاہے بعد کو کچھ ہو۔ میں تمھیں اور پریشان نہیں کروں گی۔ تم مجھے جہاں چاہے پہنچا سکتے ہو۔ میں تمھارے اختیار میں ہوں۔"

"زریں زریں۔" میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔ "میں تمھیں تمھارے گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔ تمھارا گھر۔ تمھاری ماں اور باپ کا گھر۔"

"تم چاہے جہاں پہنچا دو۔ میں تیار ہوں۔"

"زریں! میں تمھیں وہاں دروازے پر چھوڑ کے نہیں آؤں گا۔ میں تمھارے لیے لڑوں گا۔ تمھیں اپنے گھر میں عزت سے بٹھا کے آؤں گا اور ہو سکا تو تمھارے پاس کوئی آدمی چھوڑ کے آؤں گا۔ میں تجمل سے کہہ کے ماما اور اس کی لڑکی بھی تمھارے ہمراہ کر سکتا ہوں۔ تجمل کے دوست تو شہر شہر میں موجود ہیں لیکن فیض آباد میں بھی کوئی ہو

نہیں ہوا، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک بار وہاں جا کے صورتِ حال تو دیکھنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے تم جو چاہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے بمشکل اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے کچھ دیر اس کی واپسی کا انتظار کیا پھر کچھ سوچ کے نیچے اتر آیا۔

مجھے تجمل کو آمادہ کرنے میں تین چار دن لگ گئے۔ اس کے باوجود اس نے خود میرے ساتھ اوپر جا کے زریں سے بات کی۔ زریں نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ تجمل نے اس سے کہا کہ فیض آباد میں اگر وہ کسی قسم کی پریشانی سے دوچار ہو تو اُسے فوراً مطلع کرے۔ تجمل نے اس سے یہاں تک پوچھا کہ کہیں اس نے میرے دباؤ میں آ کے تو یہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ فیصلہ اس نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ تجمل اسے سمجھاتا رہا۔ زریں نے اپنے فیصلے میں تبدیلی نہیں کی۔ "تم جب چاہو یہاں آسکتی ہو۔ اس کے لیے لاڈلے کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ تم میری بیٹی ہو۔" یہ کہتے ہوئے تجمل کی آواز بھرّانے لگی اور اسے نہ جانے کیا ہوا۔ وہ مجھے زریں کے پاس چھوڑ کے تیزی سے نیچے اتر گیا۔

فیض آباد میں تجمل کا کوئی دوست نہیں تھا لیکن لکھنؤ میں کرتی جیسا ایک دوست کلن خاں موجود تھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد کا فاصلہ بہت کم ہے۔ تجمل نے نصیب میاں سے کلن خاں کے نام ایک مختصر خط لکھوایا کہ وہ فیض آباد جا کے اس کی بھیجی ہوئی لڑکی کی جاگیر واپس دلانے کے لیے ضروری قدم اٹھائے۔ ایسا ہی ایک خط اس نے میرے حوالے کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجمل مجھے تنہا روانہ نہیں کرے گا۔ اس نے فقّے، شوقی اور سائے کو میری ہمراہی کے لیے منتخب کیا۔ فقّے کو حکم دیا گیا کہ اگر زریں ضروری سمجھے تو وہ وہاں کچھ دنوں تک قیام کر سکتا ہے۔ تین دن کے اندر اندر زریں کے بیس جوڑے بنوائے گئے اور کئی زیور۔ تجمل نے اُسے کچھ نقدی بھی دی۔ رات کے وقت گہرے اندھیرے میں جب سارا محلہ سویا ہوا تھا۔ تجمل نے زریں کے سر پہ ہاتھ رکھ کے اُسے رخصت کیا۔ ماما پچھلے دروازے سے زریں کو لے کے نیچے اتری اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ احتیاطاً یہ رازداری کی گئی تھی۔ اسٹیشن پر ہمیں دیر تک گاڑی کا انتظار کرنا پڑا۔ زریں کو فرسٹ کلاس کے ایک ڈبّے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس میں آئی تھی، فرسٹ کلاس میں واپس جا رہی تھی۔ ہم سب اس کے برابر کے ڈبّے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن شام کو گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی۔ طویل قامت، گرانڈیل، سرخ و سپید کلن خاں اپنے ساتھیوں سمیت اسٹیشن پر موجود تھا۔ اس نے ہم سب کو گلے لگایا جیسے ہماری پرانی جان پہچان ہو۔ کلن خاں کا اصرار تھا کہ ہم ایک رات

لکھنؤ ہی میں گزاریں مگر ہم اُسی رات فیض آباد روانہ ہو گئے۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر جامو ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں ایک بڑے مکان میں ٹھیرا دیا گیا۔ میں نے سفر میں دانستہ زرّیں کے پاس بار بار جانے سے گریز کیا تھا۔ اب بھی میں اُس سے دُور دُور رہا۔ صبح تک ہم ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہے۔ میں نے کپتن خاں اور جامو کو زرّیں کی ساری کہانی سُنائی۔ انھوں نے اُس کے خالو کو کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ صلاح ٹھیری کہ اُس سے کوئی مفاہمت نہ کی جائے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہم پندرہ آدمی، کپتن خاں، جامو، اُن کے ساتھی اور ہم چار زرّیں کی وسیع و عریض حویلی میں پہنچے تو اُس کا خالو ہمیں دیکھ کے بوکھلا گیا۔ اُس سے کوئی بات ہی نہیں کی گئی۔ اُسے یہ یقین دلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ہم کس مقصد سے آئے ہیں۔ جامو نے اُسے حکم دیا کہ وہ شام تک حویلی خالی کر دے اور حویلی کے علاوہ دوسری تمام جائداد اور زمینوں کی دستاویزیں بھی زرّیں کے حوالے کر دے۔ اس سلسلے میں کوئی چھل فریب یا کوئی قانونی اُلجھن ڈالی گئی تو انجام تباہ کن ہو گا جیسا کہ میرا خیال تھا، اُس سے کہیں زیادہ آسانی سے بات نمٹ گئی۔ وہ ہم سے اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اُس نے زرّیں کے قدموں پر سر رکھ کے معافی مانگنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس کی ساری ہمتیں خوشامدیں ضائع ہو گئیں۔ چار آدمی وہاں تعینات کر کے باقی واپس آ گئے۔ حویلی میں سامان کا بیشتر حصہ زرّیں کی ملکیت تھا۔ جامو نے ایک وکیل بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اُس نے ضروری کاغذات تیار کیے۔ شام کو میں زرّیں کو ساتھ لے کے اُس کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ لرز رہی تھی اور مجھے اُسے سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اپنے آدمی پھیلا کے جامو نے اس بات کا بھی انتظام کر دیا کہ محلّے والے کوئی رخنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ جامو کے وکیل نے کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد زرّیں کے خالو اور اُس کے خاندان کو حویلی سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔ زرّیں کو اپنی خالہ اور بہن بھائیوں سے نہیں ملنے دیا گیا۔ اُن کا سامان جامو کے آدمیوں کی نگرانی میں دن بھر ڈھلتا رہا۔

شام تک حویلی پر زرّیں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اپنے مکان میں دوبارہ آ کے اُس کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چیزیں دیکھتی تھی۔ پوری حویلی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ حویلی کے آبائی ملازم وہیں رہ گئے تھے۔ وہ زرّیں کی واپسی پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ زرّیں ملازماؤں سے گلے مل مل کے روتی تھی اور ایک ایک چیز آنکھوں سے لگاتی تھی۔ اُس نے مجھے پوری حویلی کی سیر کرائی۔ اپنی امّی اور ابّا کی قدِ آدم تصویریں دکھائیں۔ بیٹھک کھول دی گئی تھی۔ کپتن خاں، جامو اور اُن کے ساتھی وہاں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کے کھانے کا انتظام جامو نے کیا تھا۔ حویلی ہی میں کھانا آ گیا تھا۔ حویلی میں کھانے پینے کا فوری انتظام ممکن نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہو گیا۔ [illegible] نکلتے [illegible] ہوئے میرا دل بہت پریشان رہا تھا۔ نہ معلوم فیض آباد میں کیا واقعات پیش آئیں۔

کھانے کے بعد جامو نے ہم سب کو گانا سُننے کی دعوت دی۔ میں نے زرّیں کی وجہ سے انکار کیا مگر وہ نہیں مانا۔ حویلی کے اندر اور باہر جامو کے آدمی موجود تھے اس لیے کسی خطرے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے زرّیں سے اجازت لی کہ میں جامو کے ساتھ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں شاید رات کو دیر ہو جائے۔

فیض آباد کا بازار مختصر تھا مگر یہاں لکھنؤ سے زیادہ نفاست نظر آتی تھی لکھنؤ کی طرح تو نہیں مگر جامو کی عزت فیض آباد میں بھی کچھ کم نہیں تھی۔ اُس کا ڈیل ڈول موتی جیسا تھا۔ بہت منہ پھٹ تھا۔ بات بات پر گالی بکتا تھا۔ "میں تمھیں ایک خاص جگہ لے جا رہا ہوں۔ میں نے پہلے ہی وہاں کہلا بھیجا تھا کہ آج دن ڈھلے کے بعد کسی وقت میں اپنے مہمانوں کے ساتھ آؤں گا۔ وہاں ایک چیز دیکھنے کی ہے ظالم زیادہ بات نہیں کرتی۔ کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ اُس کی یہی ادا اپنا خانہ خراب کر دیتی ہے۔ لگتی کیا ہے دل پر چھریاں چلاتی ہے۔ زمانے والے" جامو اُس کی تعریف کرتا رہا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر پہنچے۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے کسی کی سُریلی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل بے تاب ہو گیا۔ جامو سچ کہتا تھا۔ اُس کی آواز میں عجیب سوز تھا۔ جامو کی ایک ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک پختہ عمر عورت نے عاجزانہ انداز سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس لڑکی نے ہماری آمد کی وجہ سے گانا بند کر دیا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے ناخن کُرید رہی تھی۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو جامو نے آواز لگائی "نیلم جان! بس آج جادو جگا دو۔ مہمان دل چھینک کے جائیں تو بات ہے۔" جامو کی آواز پر اُس نے سر اُٹھایا اور زیرِ لب مسکرا کے دیکھا۔ جیسے ہی اُس نے سر اُٹھایا، میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ دل کی دھڑکن مفقود ہو گئی۔ سینہ کسی نے چاقو سے چیر دیا۔ رگ رگ پہ میں سنّاٹا چھا گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے یہ دھند ہٹانے کی کوشش کی۔ نیلم جان نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے اُٹھی۔ اُس نے جھروکے سے چھلانگ لگا دی۔

میں چیخا اور چلّاتا ہوا ایک ہی جست میں سیڑھیاں عبور کر گیا۔ میری بہن فہمیدہ سڑک پہ بے حال پڑی تھی۔ خون سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

باقی آئندہ شمارے میں

ابوالفضل صدیقی، اردو کے منفرد ادیب، اردو کے مایہ ناز ادیب، ان کا سب کچھ اپنا ہے۔ زبان، لہجہ، موضوع، اس بار بھی ان کی کہانی جانوروں سے متعلق ہے۔ بس جانوروں میں ذرا سا فرق ہے۔ جنگل اور مینا کا فرق، دیکھیے چچا ابوالفضل صدیقی نے ان جانوروں کے متعلق کیسی خوب صورت، اثر انگیز تحریر لکھی ہے۔

ستاری کال

نوشتہ خاص

ایک گاؤں کی کہانی جہاں ایک مثالی سماج موجود تھا

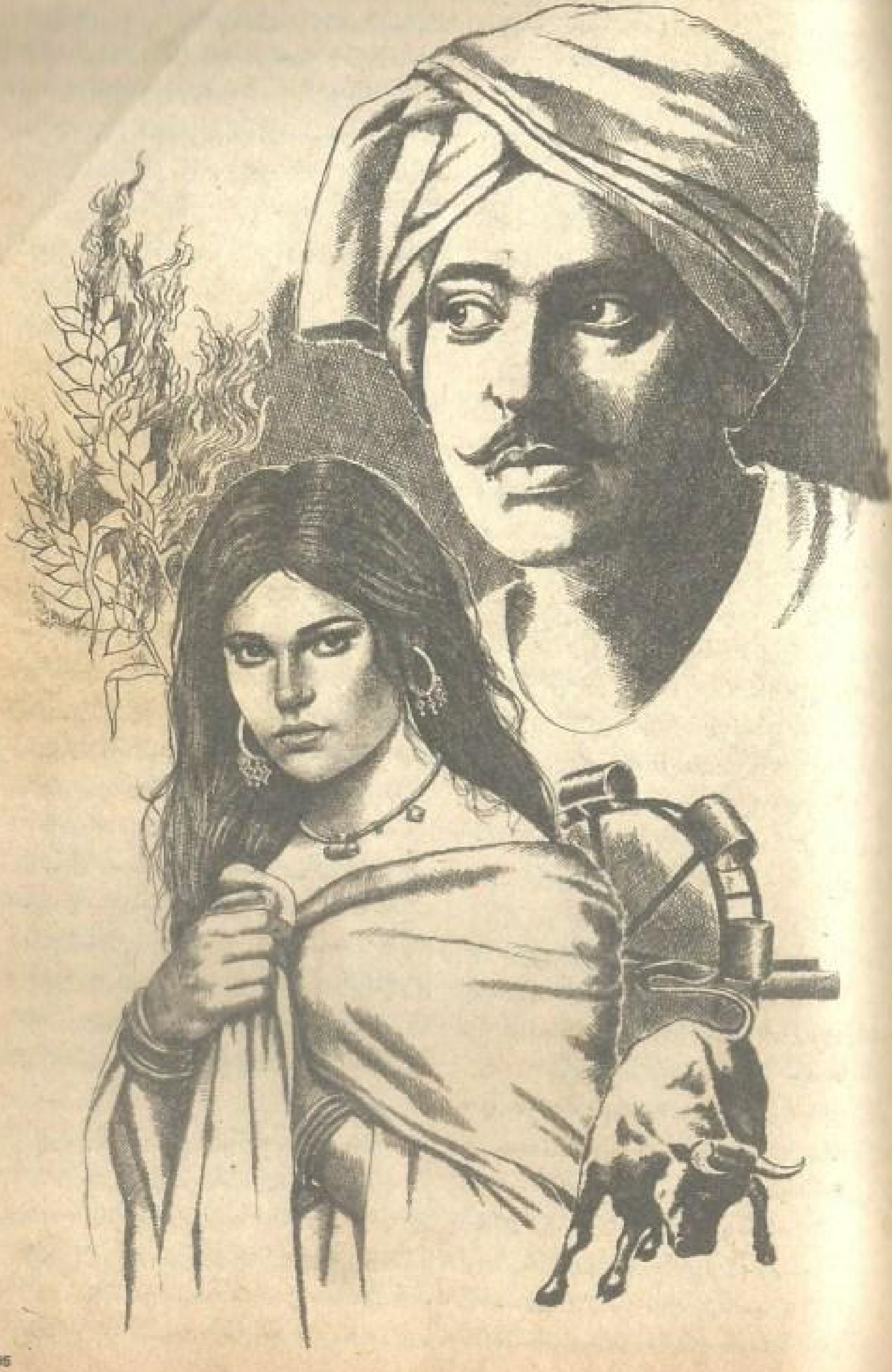
گاؤں کی کنواریں کے سینے دھک ہو کر رہ جاتے، گوری چٹی نوجوان بہوئیں سہم جاتیں اور اب تو کھلے منہ اندھیرے کے اُجالے نکلنے والی ادھیڑ بیوائیں تک ہاتھ بھر کا لمبا گھونگٹ نکال کر چلتیں۔ وقت بے وقت نکلنے بیٹھنے ڈرتیں اور آتے جاتے جھگی جھگی سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوتیں۔ کچھ ایسی ویرانی جوانی لالہ ہزاری لال پر چڑھی تھی کہ ساری بستی چونک پڑی۔ چلتے پھرتے بھری نظریں اٹھ گئیں۔ ابھی اچھی طرح مسیں بھی نہ بھیگنے پائی تھیں کہ پھر نچال سا برپا کر دیا۔ جوں جوں بڑھتے قیامت بن کر گاؤں کی صورت پر سوار ہوتے چلے گئے ورنہ سا ہو کاری لال اس گاؤں کے بسیا بھی نہ تھے۔ سنا کرتے ہیں کہ راٹھوروں کے گاؤں میں نمک مرچ کی دکان تھی اور کوڑیا بنیا پکارے جاتے تھے۔ گھر میں جو رو دوا ناک نقشے کی ٹک کی درست تھی۔ نکلتے بیٹھتے راٹھور ٹھرکے ٹھاکر زمیں دار کی نگاہ تلے پڑ گئی۔ بیچارہ کوڑیا بنیا ایک حد تک تو نبھاتا رہا لیکن جب زمیں دار حد سے گزرنے لگا اور اس کو اندیشہ لاحق ہونے لگا کہ اب عزت خطرے میں ہے تو لالا ان اس کی جھونپڑی سے اچک کر ٹھکرائن بنا کے حویلی میں پہنچائی جانے والی ہیں تو غریب ایک رات راٹھور نگر چھوڑ کر اپنی ناک بچا کر بھاگ پڑا۔

کوڑیا بنیا جس وقت راٹھور نگر سے بھاگا تو اس کی ملکیت ایک لدو بھینسا، پانچ روپے اور نمک مرچ ہلدی کی چند پڑیاں اور دو تین گدڑیاں تھیں۔ یہ سب اندھیری رات میں جھونپڑی کے اندر ہی چپکے چپکے بھینسے کی پیٹھ پر لادا۔ نیچے نمک مرچ ہلدی کی پڑیاں اور اوپر سے گدڑیاں، انٹی میں پانچ روپے اور چپکے سے بھینسا ہانک کر چل پڑا۔ آگے بھینسا، پیچھے خود اور برابر میں ہاتھ پکڑے جورو۔ گاؤں سے باہر نکل کے وہ بیچاری تو چلنے سے بالکل معذور ہو گئی کہ پورے دنوں سے تھی۔ ٹھاکر کی امانت کا بوجھ پیدل چلنے میں سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ جب دیکھا بالکل گھسٹنے ہی لگی تو مجبور ہو کر بڑی مشکل سے گٹھڑی کی طرح اٹھا کے کوڑیا نے اُسے بھینسے کی پیٹھ پر پڑیوں اور گدڑیوں کے اوپر لاد دیا۔

راٹھوروں اور چوہانوں کی تاریخی لاگ ڈانٹ چلی آتی ہے۔ آج تک ایک دوسرے کے مفرور مجرموں اور بھاگے ہوئے غلاموں کو پناہ دینے کی روایات موجود ہیں۔ کئی دن پہلے چوہان گڑھ کے زمیں دار کے سامنے کوڑیا نے اپنی عرضی پیش کر دی تھی اور اس نے رہنے کو ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا اور دکان کے لیے جگہ بنا دی تھی۔ ساتوں رات دس کوس کی منزل مار کر کوڑیا چوہان گڑھ پہنچ گیا اور راٹھور نگر اجاڑ کے کوڑیا بنیے نے چوہان گڑھ بسایا۔

✻

پھمی دیوی تو پھمی دیوی ہیں، جدھر نگاہ سیدھی کر دیں اور جدھر بھی قدم اٹھا دیں۔ چوہان گڑھ میں کوڑیا بنیا مکھی مارتا۔ راٹھور نگر کا تارا چمکا یا ناک کان سلامت لے کر آیا اور راٹھوروں سے اندر چند سال سا چرچا تھا۔ جس پر راٹھور نگر والا مع مال کے قبضہ کیے لیتا تھا۔ ہزاری لال کیا پیدا ہوئے پیدا وار ہی پیدا ور ساتھ لائے۔ اُن کی تقدیر سے دیکھتے دیکھتے سب کچھ آ گیا۔ کوڑیا بنیا جس وقت چوہان گڑھ میں آیا تو اچھا خاصا قحط لیے کی صورت آ یا تھا۔ ڈھائی روپے کی مالیت کا بھینسا مع لدان کے ساتھ تھا اور انٹی میں پانچ روپے تھے مگر بھینسے کی پیٹھ پر جلوہ لالائن کیا سوار ہوئیں لچھمی دیوی آ بیٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بھینسے کی پیٹھ چاندی کی ہو گئی۔ پانچ روپے تو انٹی میں تھے ہی اور بھینسا پاس۔ بنئیوں سے نمک مرچ خریدا اور موٹے جھوٹے اناج کے بدلے چار چار چھ چھ کوس چاروں طرف دیہات میں بیچا۔ بڑا چھوٹا اناج یہاں سے لادتا وہاں ڈالتا۔ وہاں سے لادتا یہاں بیچتا۔



ایک جگہ سے رکھا، دوسری جگہ ساٹھی کے بدلے دے دی۔ یہاں سے باہر ابھرا، وہاں جوار کے بدلے دے دیا۔ جو خریدے اور من میں دس سیر گیہوں ملائے۔ گجی تانی اور ڈیوڑھا کر دیا اور دولت کو پاؤں پھیلا کر گویا بچی بسا لی۔ دو سال میں تجارت کا پہیا تیز ہوا، دائرہ بڑھا، ساکھ بنی، بلا پیسے کے چلتے تو چوہان گڑھ کے جس گھر سے چاہے جنس لا اور کرتے جاتے اور اب تو چاروں طرف چار چار کوس بات بن گئی۔ تجارت کے ساتھ سود بیاج لین دین کا چھوٹا موٹا سلسلہ چل پڑا۔ تجارت سود بیاج کی برکت سے تین چار برس ہی میں کروڑیا بنیا لالہ کوڑی مل ہو گئے۔ لکشمی دیوی تو ان سے کچھ قول سا ہار گئیں تھیں۔ چوہان گڑھ بسانے کے بارھویں سال میں ایسے بڑھے کہ ساہو کوڑی مل کہلانے لگے۔ دس دس کوس تک لین دین پھیل گیا۔ سیکڑوں من غلے کی بھری سال بھرنے لگی۔ بارھویں سال میں گاؤں کے زمیں دار پر قتل کا مقدمہ پڑا۔ ساہو کوڑی مل نے قرض دیا اور دس ہزار روپے میں چوہان گڑھ ساہو جی کے پاس رہن دخلی میں آگیا اس شرط پر کہ اصل جوں کی توں کھڑی ہے اور سود گاؤں کی آمدنی اور منافع سے ادا ہوتا ہے۔ یہیں سے کروڑیا بنیا ساہو کوڑی مل اور ساہو کوڑی مل سے چوہان گڑھ کے زمیں دار بن گئے اور لین دین سود بیاج کی وہ ترقی ہوئی کہ دور دور دیہات میں دانے دانے پر ان کی مہر ہو گئی۔ گنے کی گانٹھ گانٹھ پر ان کا نام لکھ گیا۔ آس پاس کے دسیوں گاؤں میں ان کے لین دین سے چولہے گرم ہونے لگے، کنواریاں پار لگنے لگیں، کفن پڑنے لگے۔

خیر ساہو کوڑی مل تو ویش تھے اور دولت کے ساتھ اپنا نسخہ ہزارہا سال سے سمجھے ہوئے تھے مگر زمیں داری لیں بے سان گمان اس طرح ایک دم ہاتھ آجانے میں انھیں بھی اب کچھ شبہ ہونے لگا تھا اور لالائن کو تو خوب ہی معلوم تھا کہ ہزاری مل راٹھور نگر سے خون بھی ساتھ لایا ہے وہ راج پوت اور زمین کے رشتے بھی ہزارہا سال سے سنتی چلی آئی تھیں اور خوب جانتی تھیں کہ ان کی دنیا میں تقدیر خون کا عطیہ ہے اور خون قدرت تقدیر والوں ہی کو عطا کیا کرتی ہے جب تو ان سے یہ بات کچھ کچھ ہزاری مل کے علم میں آئی تو مونچھیں خوب بڑھا کر اٹھائیں۔ سینہ بھی اچھی طرح تان کر چلنے لگے اور جیسے بالشت بھر نتھنے اچکا کر کھڑے ہو گئے اور جوں جوں بڑھے ان کی گردن اکڑتی چلی گئی۔ خیر یہ تو لیلی بھی ان کے آبائی خون کا دیا یاتی تقاضا تھا خواہ کمتر لنگوٹی بھی ثابت نہ ہوتی پھر زمین کی ملکیت اور حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں آنے کا فطری احساس جسم کے اندر دبے ہی خون بالشت بھر اوپر اچھالنے لگتا ہے اور ان کے اندر تو سچ مچ خالص راٹھور خون ہی مچل رہا تھا۔ بیٹے کی اٹھان اور سج دھج دیکھ کر لالائن اپنی عنفوان شباب کی حادثاتی غلطی پر اب بڑھاپے میں پھولی نہ سماتیں چاہے کوئی ذرا کہے یا سمجھے وہ تو فخریہ کنور جی ہی کے لقب سے پکارتیں۔ نام اور لقب تو وہی قائم ہو گا جس سے ماں پکارے گی۔ لالہ ہزاری مل بچپن ہی سے کنور ہزاری مل پکارے گئے، جوان ہونے پر تو سچ مچ راج کرنے لگے۔

ساہو جی ٹھنڈے ویش تھے مگر لہلہاتے لبسوہ گاؤں کی حکومت بیٹھے بٹھائے ہاتھوں میں آجانے نے انھیں بھی تھوڑا بہت متاثر کیا۔ زمانے کا سرد و گرم دیکھے ہوئے تھے۔ حکومت آنے سے کئی برس پیشتر چوہان گڑھ دور دیہات کی اقتصادیات پر ان کا نہایت ہی پرسکون اور منظم قبضہ ہو چکا تھا۔ چار چار چھ چھ کوس چاروں طرف شادی بیاہ، غمی، مقدمے بازی مرض کے اخراجات تو درکنار گھر گھر سود کی روٹی ہی اٹھتی تھی۔ بیوپار لین دین لی پر چلتی تھی اور سیکڑوں ہزاروں ایکڑ زمین پر کھیتی کیاری انھی کے سود کے سہارے پر ہوتی تھی۔ چوہان گڑھ کی زمیں داری ہاتھ میں آنے کے بعد بچارے بہت کچھ قابو میں تھے صرف ٹھاکر رنکانی بن کر بیٹھ گئے۔ مکان ساہو کاری بڑھنے کے ہی کے زمانے میں اچھا خاصا بنا لیا تھا مگر ٹھاکر رنکانی روایات کے مطابق اب انھیں ترمیم کرنی پڑی۔ چودھیری اونچی کرسی کی چورخی بند و بست کی حویلی بلند ڈیوڑھی بنوائی۔ گاؤں کا روایاتی آئین جلد سے باضابطہ نقل رقم حاصل کر کے دیکھا جسے پچھلا زمیں دار بھولے ہوئے تھا اور اس کے مطابق کاشت کاروں پر اپنے حقوق قائم کیے۔ لمبے چوڑے زرخیز رقبے کاشت کا دیے دخل کر کے اعلا پیمانے پر خود کاشت سیر پھیلائی۔ کھنڈ سال کا کاروبار پروان چڑھایا اور جب تنظیم پر پورا قابو پایا تو ٹھاکر رنکانی بن کر چوپال پر بیٹھ گئے۔ وہ پکے ٹھاکر رنکانی تھے۔ زمین ٹلے آسمان تھمے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، انھیں چوپال سے نیچے اترنا قسم تھی۔ کہیں شادی غمی ہو بستی میں لڑائی جھگڑا ہو جو موکیت پڑیں۔ آگ لگے، پچھم پورب سے جا ملے مگر ساہو جی کو چوپال کی کی جانب دیکھنا حرام تھا۔ حتا کہ لالائن سورگ باشی ہوئیں تو آگ لگانے کا بیٹے کو دے کر ارتھی رخصت کر دی اور شمشان تک نہ گئے البتہ بچارے نے رسوئی چوپال میں بنا لی اور اپنے ذاتی انتظام میں لے کر ایک برہمن اور ایک کہار کے سپرد کر دی اور اس کے بعد دوپہر شام دونوں وقت بھوجن کرنے حویلی میں جو جایا کرتے تھے اس سے بھی مستثنا ہو گئے۔ البتہ بیٹے کی شادی کی فکر رہی مگر برہمن ابھی کسی مہورت پانچ سال تک لگن اور مہورت ہی نہ بتاتے تھے۔ ساہو جی نے اپنے تمام معمولات زندگی حتا کہ حرکات و سکنات کچھ ہی کھانے جیسے اصولوں میں ڈھالے تھے۔ بااصل تو وہ خلقی طور پر قانع ہوئے تھے اور ٹھاکر رنکانی بن کر تو وہ جیسے مجسم قناعت اور اصول بن کر رہ گئے تھے۔ زمیں داری کے کام کے لیے چوپال میں علاحدہ نشست بنائی۔ ساہو کاری کا کاروبار اور کھنڈ سال کے حساب کتاب کی دیکھ بھال کے لیے چوپال کے دوسرے حصے میں جگہ مقرر کی۔ آنے جانے ملنے ملانے والوں کے لیے علاحدہ جگہ بنائی۔ ہر کام وقت کے سانچے میں ڈھالا۔ قابو یافتگی کا یہ عالم تھا کہ چوپال پر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف پھیلے ہوئے کاروبار کی مشینری کا پرزہ پرزہ پھیرے ہوئے تھے اور پورب پچھم اتر دکھن اوپر نیچے دولت نے ان کے گھر میں آنے کا ہر راستہ دیکھ لیا تھا۔ ان کے سونے چاندی گیہوں چنے کھانڈ شیرے ہر چیز میں جیسے مقناطیس کی سی کشش تھی۔

اپنے اصول کے مطابق ساہو جی روزانہ صبح سے دوپہر تک سود بیاج کی وصول یابی کرتے۔ دوپہر تک وصول یابی کا کام ختم کر کے کھانا کھاتے۔ دوپہر ہی میں آرام کر کے سہ پہر سے پھر کام پر آجاتے اور شام تک قرض بانٹتے۔ پرانی اسامیاں

...بتاتے اور سورج غروب ہونے کے بعد تیل کے ڈلیٹ پر رکھا ہوا کرٹے
...جلا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر ذرا جھکتے۔ کچھ منہ میں اشلوک بڑبڑاتے اور
...معمول کہ صبح سے شام تک کا حساب کتاب بہی مکمل کرتے اور رات کے کھانے
...تک آنے جانے والوں سے دنیا بھر کی گپ شپ کرتے۔ تجارتی لین دین
...کے جوڑ توڑ بٹھاتے۔ گاؤں بھر کی اچھی بری خبریں سنتے اور وہ بات
...سے پوشیدہ راز ہضم کر کے اور اپنے مطلب کی نکال کر سو جاتے۔

☼

کنور جی عنفوانِ شباب میں تو ایسے نظر آئے کہ نام ہی نام کو بنیے کے
...ہیں اور دراصل خاص چھتری ہی چھتری ہیں۔ بڑے جوان گڑھ کی مردم
...شماری چماروں کولیوں بھر جیسی تیلیوں اور جلاہوں فقیروں جنگلیوں وغیرہ
...آرام پر مشتمل تھی۔ ایک گھر سنار کا تھا وہ بھی ذات کا مہاجن۔ گاؤں کی
...اس بھرت آبادی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جوان راج پوتوں نے خاص
...اہتمام کے ساتھ آباد کیا ہے کہ اونچی ذات کا ایک فرد بھی نہیں پنپنے دیا ہے
...مطلب کے مطابق نہایت کامیاب شخصی حکومت قائم ہے۔ کنور جی چاروں
...شان مانی شکرایت بجا ہے تھے ایسی کہ پچھلی سات صدی سے جو نانوں
...کو بھی بجا نہ ملی تھی۔

مگر ساہو جی پکے بنیے تھے اور ان تمام راج پوتی ٹھاٹ سامان کے
...اس ہاتھی کی زرکار عماری کے باوجود جس پر سوتیج براجمان تھے، انھیں وہ
...کی پیٹھ بھی اچھی طرح یاد تھی جس پر لد کے وہ آدھی رات دانھور نگر سے
...بھاگ کر جوان گڑھ پہنچے تھے اور کوڑیا بنیے سے ساہو کوڑی مل بنے تھے
...کوڑی نے تو ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو لاڈ جی ہو کر بھی کنور جی پایا
...تھا بھر تو سچے ہی خوش دیکھے تھے۔ پھر باپ کی روز افزوں ترقی اور نئی نئی
...آشتی نے پورا پورا اباؤ اصل پر پٹا دیا۔ ماں کا ایک پرچی بھی تلاٹے اور بولا
...ٹھورا راج پوت بن گئے ورنہ باپ تو بنیے ساہوکار تھے جن کے پاس
...اسامی مردہ گھر میں پڑا چھوڑ کر کفن کے لیے قرض مانگنے آتا تو اس کے نم
...آنکھوں میں آنسو بھر کر شریک ہونے والے جذبے پر درد لہجے اور نرم لفظوں میں
...دیتے۔ مگر مرنے والے کی روت کا چلتے چلتے بھر پور فائدہ اٹھاتے
...اپنی خصوص شرح اور ہنی روپیہ سود بڑھوانی بیاج کی بڑھا لیتے اور سوتے سے
...بھی گر پوچھا جاتا تو اپنے ہر اسامی کے کھیت کی پیداوار کا تخمینہ اور گنے
...کے قطرے قطرے کا وزن صحیح صحیح بتا دیتے۔ ہر اسامی کے جمع خرچ کا
...ہر وقت دماغ کے اندر لگائے رکھتے۔ معمولات زندگی کی ہر قدر چاندی کے
...جھنک میں نگاہ کے سامنے چمکتی رہتی۔ انتظام پختہ اور کاروبار کا یہ عالم تھا کہ آفتاب
...بیٹھے بغیر چوپال کی سیڑھی سے نیچے قدم آ جائے تو تار بتا تھا۔ ادھر کنور
...راجپوت کے آدمی تھے۔ دس بارہ سال ہی کی عمر سے شکرے کی طرح
...گردن گھما گھما کر لڑکی کنکھیں بھینکنے لگے تھے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں

اندھیر پا کر دیا۔ شروع شروع میں تو جنگل کی وہ چار داد اگوں کی اطلاع جب
ساہو جی کے کان تک پہنچی تو انھوں نے تقدیر ... سمجھ کر ... جنگل
نے کڑی فہمائش کی اور لمبی چوڑی اونچ نیچ دکھائی۔ ساہو جی ٹھاکر ... کی قسم کی
چیز تھے مگر کنور جی چوپال میں کوئی حرکت کرتے ہی نہ تھے۔ جنگل کی بات تو آدھی
جنگل ہی میں جہاں کی تہاں رہ جایا کرتی اور آدھی گاؤں تک اڑتی اڑتی پہنچتی اور
آدھی ہی کی تہائی چہارم درے کے ذریعے سے ساہو جی کے کان میں پہنچتی اور پھر
اس کے کہ ساہو جی بیٹے کو زبانی فہمائش کر دیں اور کوئی بس نہ تھا۔ ساہو جی کے
بس کی تو یہ بات تھی بھی نہیں کہ ان کی دم بنے پھرتے رہیں مگر جب چند جوا
خواہوں کی پھرتیلی پارٹی کنور جی کی مدد معاون ہو گئی اور جب شام کا دھندلکا
چھوڑ دن دہاڑے گاؤں کی گلیوں میں بھیڑ بکریاں پکڑنے لگے اور ساہو جی کے
کان میں ہر چھوٹی بڑی پہنچی تو وہ سر پیٹ اٹھے۔ نوجوان بیٹے کو بہترا سمجھایا کہ
تم بنیے کے پوت ہو۔ اپنی ماں کے پیٹ میں بھیجے کی پیٹھ پر لد کر اس گاؤں
کو بھاگ گئے تھے۔ تمھارے ماں باپ تیسرے فاقے سے یہاں پہنچے تھے۔ بھوک کے
مارے تمھاری ماں کے پاؤں ڈولتے تھے۔ جس دن تم پیدا ہوئے ہمارے سر پر آنا چھونس
نہیں تھا کہ تمھیں دھوپ سے بچاتے۔ تمھاری چھٹی کے دن چھٹانک بھر تیل اور
ڈلے بھر سونٹھ تمھاری ماں کی اکلوتی کے لیے میسر نہ تھی۔ تم اپنی اصل مت بھولو۔
جس چوپال پر آج تمھارا باپ بیٹھا ہے کل یہیں اس کی دو گز لمبی چوڑی ٹکا ... کرنج
کی ... گئی تھی اور یہ گاؤں تمھارے باپ کی بیری نہیں ہے اگر آج زمیں دار دس ہزار لے
لے دے تو کل چھوٹ جانے۔ تم بنیے کے بیٹے ہو۔ تمھارا دھرم پیسہ ہے۔ یہ تمھاری
ٹھاکروں کے لونڈوں جیسی حرکتیں تمھارا سارا کاروبار مٹی میں ملا دیں گی۔"

ساہو جی سمجھاتے ہی رہے مگر عشق کا بھوت نصیحتوں سے کب اترا ہے۔
مجبور ہو کے ساہو جی نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ رحمن نائی نے فوراً شادی کرنے
کی رائے دی۔ نبی بخش جلاہے نے کاروبار کی ذمے داری اور بوجھ ڈالنے کا مشورہ
دیا۔ یہ دونوں باتیں ساہو جی کے دماغ میں پہلے سے تھیں لیکن شادی تو وقت کا بند
تھی۔ پانچ برس تک برہمن شادی کی لگن مہورت ہی نہ بتاتے تھے۔ پانچ سال میں
سے دو سال تو کٹ چکے تھے تین باقی تھے اور تین سال میں ساہو جی کو ہر سال
میں تین سو پینسٹھ مرتبہ زمین اپنی کیلی کی حرکت سے جھٹک کر قلا بازیاں کھاتی
معلوم ہو رہی تھی۔ ساہو جی نے اصرار کیا تو برہمن بچاروں نے بہت ساداں پن
کرانے کے بعد بیاہ کی لگن نکال ہی دی۔

لالہ ہزاری لال کا بیاہ وہ ناگر نا جلدی جلدی لگن کے بغیر ہی ایک ساتھ
ہو گیا۔ وہ سوئی چوپال سے اٹھ کر پھر حویلی میں پہنچ گئی۔ کنور جی نے بھی حویلی کی
شکل دیکھی۔ ساتھ ہی ساتھ کاشت اور کھنڈ سال کی ذمے داری سر ہو گئی۔ فطری
طور پر ان بوجھوں سے کنور جی کی حرکات کو ایک جھٹکا سا لگا مگر جلدی ہی ان کی
رفتار کا رخ بدل گیا اور منزل جہاں کی تہاں رہی۔

کاروبار اور خانگی زندگی کی تنظیم نے ان کے مشاغل میں بھی نظام سا

پیدا کر دیا اور اب اپنے راستے پر نہایت سلامت روی کی چال چلنے لگے۔ اب تک مطلب براری کے لیے باپ کا قابو اور اقتدار تھا۔ اب وہ اقتدار اُن کے اپنے پاس آگیا۔ ہزاروں من غلّے اور سیکڑوں من شکر کا کام تھا۔ سیکڑوں مزدوروں بیسیوں ملازموں کی رستی تھی اور کسی خود سے بڑی عظمت ہوتی ہے۔ پہلے سے کسی قدر زیادہ آسانی اور بالکل خاموشی کے ساتھ کام نکلنے لگے۔ ساہو جی بھی مطمئن ہو گئے کہ اس ہائے ہائے سے نجات ملی کہ شام کو گھر جا کے کھیتوں میں چماری پچھوئی سیر بھر رات گئے جنگل جھاڑے کے وقت اندھیرے کھیت میں جنگلی دبوچ لی۔ رات کو غلاموں کے گھر بھیجا یا لالا صبح ہوتے کولہوں کے جھونپڑوں پہ جاپڑے۔ جنگل سے لکڑیاں لاتے ہیں لکڑہاروں میں تالاب کے کنارے پکڑ لیں، دن ڈھلے گھٹ ٹکھٹ سے پانی دے جاتے پھر بھی گھسیٹ لی۔ آم کے باغ میں لگ گئے اور سرسوں کے کھیت میں گھوڑوں کے ڈھیروں پر بھوکے خر کی طرح شکار کھیلا کہ پاس چھننے والیوں کے غول میں تیندوے کی طرح آگرے۔ کوئی روتی بسورتی چیخی چلی آئی تو خیر اور کسی نے شور مچایا تو اپنا گاؤں چھوڑ چار چار گاؤں بدنامی کی چھینٹیں اُڑیں۔ کوئی خاموش گھونگھٹ نکالے بھی چلی آئی تو بھی گاؤں میں ہے ہے ہو گئی۔ انگلیاں اُٹھ گئیں۔ اور کچھ نہیں تو کنوری کے ندیموں میں سے کسی نے فقرہ چست کر دیا۔

اب تو یہاں تک آزادی تھی کہ عورتیں جنگل جھاڑے کے لیے غول بنا کر بھی نہ جایا کریں۔ کنوری کے ماندے نے رفتہ رفتہ دلیری کا عنصر بالکل معدوم ہو گیا اور یہ دیکھ کر ساہو جی نے قلمدان اور بہی کھاتا اپنے ہاتھ میں رکھا۔ باقی لین دین کا عملی کام بھی کنوری کو سونپ دیا اور منیم کھنڈ سال کا کاروبار تھا یا لگان شرح سود، معافی، قرقی، جبینٹ، بیگار، وصول یابی جنس، بیسیوں طریقیں پر پیٹ کی بھوک جنسی بھوک کے ساتھ بجھانا کرنے لگی۔ کنوری کی آسنیں کلائیوں میں لالچی کا طلائی بھی رفو ہو گیا اور ایسا خوب صورتی کے ساتھ رفو ہوا کہ گھر کنوری کی دادا ہوئی۔ چین کی بنسی بجنے لگی۔ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کنوری کی عملی پالیسی میں شامل ہو گیا۔ اب اُن میں لالچی جیسی مٹھاس پیدا ہو گئی تھی۔ کھنڈ سال کے کام میں تو بالکل گھی اور شکر بن کر رہ گئے۔ اچھوت اور قرض میں جکڑے کی نفسیات کے جُٹے پرانے مرض نکلے مٹھاس درمیان میں لگا کر جنسی تعلقات قائم کرنے میں کمال حاصل کیا۔ اب کھانڈ اور شکر کی خریداری میں سے خواص کے بھر پور رشتہ اور بن گئے۔ کنوری کا شباب پہلے سے کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ گاؤں کے اندر ہر نوجوانی کو خوش آمدید کرتا رہا۔ نہایت سبک روی کے ساتھ خوشبو چینیاں بجنے لگیں اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بہی کھاتے کے اندر میں طرح طرح کے حیلوں کے ہتھیاروں سے کنوری کا شکار ہونے لگا۔ ہر نوجوان بیٹی کا باپ، ہر نئی بیوی کا شوہر اور ہر جوان ماں کا بیٹا جو ہمیشہ سے کنوری کا شاکی تھا، آج اُن کے گن گانے لگا اور ساہو جی کے کان میں بھی تعریفیں پہنچنے لگیں۔

جب جاڑوں کی لمبی راتوں میں کھنڈ سال کے بوجھل دھوئیں کو اوس سے اُٹھتی ہوئی نم گرد اور اوپر سے گرتے ہوئے کہرے سے فضائے بسیط کا سینہ میں دھکیلتی ہوتی تو کنوری کو اپنی کھنڈ سال کے بنے ہوئے قیرے راب کھانڈ گڑ کی طاقت کا اندازہ ہوتا جب بھٹی جھونکنے والے جاڑوں کے لیے اُن کی نوجوان بیویاں نوخیز لڑکیاں اور نو عمر بہنیں رات کا کھانا لے کر آتیں تو کنوری کھنڈ سال کی نیچی دیوار کی منڈیر پر آنے کے وقت سے پیشتر عکسی رکھا دیا کا برتن اُن کے جھگڑے میں کھانڈ بھر بھر کر رکھ دیتے۔ روٹی کھلا کر جماریاں ہو کر نکلتیں۔ کھانڈ کا بھرا تھیلا اُٹھاتیں اور کنوری مٹی کے تیل کی ڈبیا کی مدھم روشنی میں بھانپ لیتے اور چپکے سے جس پر نظر ٹھہر جاتی اُس کے پیچھے ہو لیتے اور کھنڈ سال کے کچا ڈھٹرے سے باہر ہو کر گنے کے رقبے میں پہنچ جاتے۔ گنے کا کھیت تو کنوری کا محفوظ قلعہ تھا جس کے اندر وہ نہایت ہی بے فکر ہو کر اپنے کھانڈ سے بھرے ہوئے جھگڑے کی قیمت کا حساب کتاب چکا لیتے۔ یہ عمل بھٹی جھونکتے ہوئے جاڑوں سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ہوتا۔ گنے کے کھیت میں کہیں آہستہ آہستہ پتیاں کھڑکھڑاتیں اور جھینگیاں ہجوم اُٹھتیں تو جاڑے سمجھتے کہ گیدڑ گنا چبا چبا کر رس چوس رہا ہے اور جب ادھر سے کنوری دکھائی دیتے آہستہ آہستہ سلامت روی کی چال چلتے۔ سر ڈالے ہونٹ چاٹتے تو انہیں آتا دیکھ کر جلدی جلدی بھٹی جھونک ڈالنے لگتے۔

ورنہ جب جماریاں جمع ہو کر برتن لیے واپس جاتی ہوئیں کنوری کھنڈ سال کے دروازے پر آہستہ سے ٹھہراتے اور اُن میں سے جسے چاہتے اشارے سے بلا لیتے۔ اب تو وہ یہاں تک نڈر ہو گئی تھیں کہ ایک تو چلی آتی تھی اور سب کھل کھلاتی ہنستی کھلاتی چلی جاتیں اور پیچھے سے جماد بڑے زور سے بھٹی جھونکتے۔ کڑھائیوں سے یکساں رفتار کے ساتھ میٹھی میٹھی بھاپ کے بگولے ساون بھادوں کی گھٹا کی طرح اُٹھا اُٹھ کر لوٹتے ہوتے۔ نیچے سے اُبلتا ہوا رس گرتا ہوتا بھاپ کے بوجھل بادل کھنڈ سال کے چھپر کی بلند چھت سے ٹکرا ٹکرا کر بھٹتے ہوتے اور مٹی کے تیل کی ڈبیاں بجلی کی طرح لرزتی ہوئیں۔ بڑے کڑھاؤ میں اُبل کے دونے سے بہہ بہہ کر رس پڑتا ہوتا اور آخر کی چھوٹی کڑھائی سے کھانڈ تیار ہو ہو کر پرنالے کی راہ ناندوں میں چلتی ہوتی اور بغل میں کنوری کی کوٹھری بند ہو جاتی۔ جماد برابر گاتے جاتے بھٹی جھونک ڈالتے جاتے اور صبح چمنی کے بعد میں کی دیوار کی آڑ آڑ کھنڈ سال کے دروازے سے پکی کھانڈ سے گڑوی بھرے جماری نکل جاتی۔

ماگھ پوس کی طویل برفانی ڈوبی راتوں میں کھنڈ سال کی بھٹی جھونکتی ہوتی گرم رس کے اُبال چڑھتے ہوتے، بھاگن چیت کی چاندنی راتیں، ہنرمند راتوں میں ہتول جھومتی سنہری راتوں کے اندر کھیت سے کھلیان تک پیچھے سے گیہوں چنے کی مشتی خوشبو میں ڈوبی ڈوبی اوپر آم کی بور کی مہک کے ساتھ مستی رہیں کھانڈ

اور لوٹی سے لے کر کچی کیریوں کی چٹنی اور آم کے رس تک بھوک اور
اور بھوک میں پیارے پیارے چاشنی دار اور چٹ پٹے محبوب تر ہوتے ہیں
اور ساون میں آم کے باغوں کے اندر دن دہاڑے کالی کالی اندھیرے پڑے
ول میں رم جھم پروائی ہلارے لے کر آم کے رس میں شراب کی تندی اور شہد کی
اس بھرتی رہی اور برسات کی نم ناک اندھیریوں کا پروان چڑھا نشہ فرحت
سال میں کرنوں کے پکائے دھان کے سنہرے خوشوں کی خوشبو سے ملا
اور بڑی گر جیسے دائمی سرور کے عالم میں غم پر غم چڑھاتے رنگا رنگ دن
شیاں اور خوشہ چینیاں کرتے برسیں گزر گئیں۔

(۱۲)

ہندوستانی دیہات کا مزاج سخت قسم کا روایاتی ہوتا ہے کوئی نئی روایت لانا چھتر میں جونک لگانے کے مترادف ہوتا ہے۔ کنور جی کے باپ دادا کے زمانے میں گاؤں آیا تو انھوں نے دستور دہی، واجب الارض کے روایاتی آئین میں تھوڑی بہت ترمیم و تنسیخ کر کے گاؤں کو سود بیاج کے راستے پر لگا لیا اور ٹھاکر کے زمانے میں تو بھینٹ بیگار ہی چلا کرتی تھی۔ جب کنور ہزاری لال کے ہاتھ میں عنانِ حکومت پہنچی تو انھوں نے سب پچھلی روایتیں اپنے مطلب کے راستوں پر لگا لیں۔ یہ مزاج بھی پیدا کر لیا جو بالعموم دیہات کی خاموش فضا میں مفقود ہے اور جہاں سب کردار عام طور پر ایک ہی خمیر اور سانچے کے تمیر ہوتے ہیں اور جب تو دیگر استحصال کی طرح کنور جی کو یہ استحصال بھی غیر اور معلوم ہونے لگا۔ جب کنور جی کی عمر تیس سے متجاوز تھی اور انھیں جدید طریقۂ استحصال جاری کیے ہوئے سوا ستر سال گزر چکے تھے۔ گاؤں بھی اسے ان کا جائز اور قدرتی حق سمجھنے لگا تھا۔ بھوک کے دباؤ میں چنے جو شکر کی طرح جاوداں قسم بھی الجھن الجھن کر کھلتے ہیں۔ جوان کو دھکو برسیں گزر گئی تھیں جس طرح جنگل میں گیہوں چنے گئے کا ہر پودا کنور جی کے لیے بیان چڑھتا اسی طرح گاؤں کے اندر ہر بیٹی بہن اور بہو کنور جی کے لیے بہار آتی۔

گاؤں میں ایک گھر سنار کا تھا اور بالعموم جس طرح دیہاتی سناروں کے گھروں کی جائے وقوع ہوا کرتی ہے یہ بھی گاؤں کے بیچوں بیچ زمیں دار کے پچھواڑے زیر دیوار واقع تھا۔ ریوتی سنار کا گھر ہر اعتبار سے مختصر تھا۔ تنگ سا آنگن مت کر زمیں دار کی حویلی چوپال اور مویشی خانے سے گھرا ہوا اور ایک جانب تیلی سی گلی جس میں دروازہ تھا اور دروازے کے برابر ایک چھوٹی سی کوٹھری جس میں ریوتی کی دکان تھی۔ گھر کیا تھا جیسے دانتوں بیچ زبان۔ پھر ریوتی سنار اور اس کی عورت۔ نہ کوئی آل بچہ اور نہ کوئی عزیز رشتے دار فقط دو دم۔ ریوتی کنور جی کے باپ بھی تو جا کی عمر کی حد تک کنور جی سے بڑا تھا اور ریوتی کی بیوی شوہر سے چار پانچ سال عمر میں چھوٹی ہوگی وہ بھی کنور جی سے دس بارہ سال عمر میں بڑی تھی لیکن چونکہ اولاد کی نعمت سے محروم رہی تھی لہٰذا ناک نقشہ رنگ ڈھنگ تھوڑا بہت گرم تک بنا رہا اپنے خاص وقت پر کنور جی کی نگاہِ التفات سے نہایت کامیاب گزر چکی تھی۔ اب بڑھاپے میں کنور جی اور ریوتی سنار میں اس کے سوا کوئی تعلق نہ رہا تھا کہ کبھی کبھی جب کوئی اسامی زیور گرو کرنے آتا اور پرکھنے میں کنور جی اور ساہو جی دونوں کو شبہ رہتا تو ریوتی سنار سے کسوٹی پر پرکھوا کر دیکھتے اور پھر بھی تشفی نہ ہوتا تو تیزاب پر گھلواتے۔ آج اسی قسم کی پرکھ کے لیے کنور جی ریوتی سنار کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازے پر ایک بیل تانگا رکا۔ ریوتی سنار تو زیور کی پرکھ کے سلسلے میں دھونکنی اور بھٹی میں سر غرق تھا ادھر ایں ہی چھچھلتی سی نگاہ اٹھا کر کچھ سمجھ پایا مگر کنور جی نے بڑے غور سے دیکھا۔ حالانکہ اس نے تانگے سے اترنے سے قبل ہی اندر نہایت اہتمام کے ساتھ سر سے پاؤں تک چادر سنبھال لی تھی اور لمبا سا گھونگٹ نکال کر اتری تھی مگر کنور جی اب عمر اور تجربے کے اس دور سے گزر رہے تھے جب خط کا مضمون لفافہ دیکھ کر ہی بھانپ جایا کرتے ہیں اور یہاں تو مضمون کے عنوان ہی سرخ سرخ انگلیاں اور عقب سے پاؤں چادر سے باہر سامنے تھے اور دبیز چادر کی تہوں سے کنور جی نے اس کے باریک باریک خدوخال تک پڑھ لیے اور پھر پھر نہ بھی کنور جی کو مورنی کی سی چال اور قیافت کی موزونی قد ہی سب کچھ بتانے کے لیے بہت کافی تھی۔ جب تک وہ تانگے سے اتر کر پائل کے گھنگروؤں کے ساز کے ساتھ رقص کرتی دروازے کے اندر گئی اس وقت تک کنور جی سے چادر کے اندر بھی کچھ کہہ گئی۔ ریوتی سنار تو پگھلے سونے کو بھٹی میں تپا کر پرکھتے رہے کنور جی نے اتنے فاصلے سے کچی چاندی پرکھ لی۔

پیچھے ہی پیچھے تانگے سے اتر کر ریوتی کا سالا آیا۔ کنور جی بھانپ گئے کہ ریوتی کی چھوٹی سالی مہمان آئی ہے۔ پہلے والا زمانہ ہوتا تو کنور جی کو ایسی فتوحات میں کئی دن لگتے اور موقع تلاش کرنے کے بعد ایک مہم سی سر کرنی پڑتی لیکن کار براری یقینی تھی مگر اب تو جب سے ذرا مزاج میں ٹھنڈک اور ہاتھ پاؤں میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تھا تو مدتوں سے سانپوں پر سانپ لوٹتے چلے آ رہے تھے لاٹھی ٹوٹنے کا نہ جب سوال تھا اور نہ اب مگر یہاں آج جیسے اور فریب کے داؤ والے قسم کے ہتھکنڈوں میں سے کسی کی کامیابی محال تھی دیری کی پتے بازیاں مدتوں سے بھول سی گئے تھے۔ زیور کی جانچ کرا کے وہ دکان سے چل دیے لیکن سوچتے سوچتے تھک گئے اور کوئی تدبیر تقدیر کے ساتھ ہم آغوش ہوتی ہوئی سمجھ میں نہ آئی۔ تیسرا پہر ہو گیا۔ مجبور ہو کر وقت کے بعد انھوں نے اپنے پرانے دست راست کنھیا چمار سے مشورہ کیا۔ کنھیا جوڑ توڑ میں دیری کے زمانے میں کنور جی کا دستِ راست رہ چکا تھا اور اب قریب کے عہد میں بیکار رہا ہو گیا تھا اس وقت اس نے اپنے پرانے معیار پر مشورہ دیا۔ رات بھی کچھ دور نہیں تھی تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اب کنھیا کے مشورے سے طے ہو گیا رات کی اس مہم میں کنھیا کی ڈیوٹی بھی اہم تھی۔ کنھیا نے نہایت ہی آسان گر اور راستہ بتلایا۔

خوش نصیبی سے رات اندھیری اور یخ بستہ تھی۔ ایسی راتیں گاؤں کے اندر بلا کی سنسان ہوا کرتی ہیں۔ سردی کے مارے دیہاتی کر گئے بھی میدان چھوڑ کے کونوں کھدروں میں منہ میں دم دبائے اور دم منہ پر لپیٹے دبکے پڑے تھے اور گاؤں

کے آدمی آگو ننگے بے ساکو جھو کے بند منڈیروں اور جھونپڑیوں میں ایک ایک گڈری
کے سہارے ایک ایک پیال کے ڈھیر کے اندر ایک ایک پورا خاندان دبکا پڑا
تھا اور کہیں کہیں الاؤ کی آنچ کے توسل میں ایک تیلی چادر ہی میں چودہ پندرہ
گھنٹے لمبی رات کی کروٹ کٹنی ہوتی تھی۔ کنور جی خلافِ معمول آج ذرا دیر سے حویلی
میں کھانا کھانے آئے اور نوکروں کی آنکھ بچا کر ڈیوڑھی کے راستے باہر جانے کے
بجائے چپکے سے حویلی کے زینے پر چڑھ گئے اور حویلی کی چھتوں چھتوں سنار کے
چھپر کی لکڑی سے بلی کے سے قدم ڈالتے سنار کی کوٹھری کی چھت پر پہنچے چھت
سے گھر کی چار دیواری پر اُترے چار دیواری کی منڈیر سے گھر کے صحن میں کود پڑے۔
دیوتی سنار کا چھوٹا سا گھر بھی اسی وسیع تاریکی اور بھیانک سناٹے میں گم تھا
جو ساری بستی نگلے ہوئے تھا۔

کنور جی کو سرِ شام ہی اُن کے جاسوس کنھیا چمار نے بتا دیا تھا کہ دیوتی اور
اُن کا مہمان باہر دُکان میں سوئیں گے اور دیوتی کی بیوی اپنی بہن کے ساتھ
زنانہ مکان میں کوٹھری کے اندر سوئے گی۔ صحن میں پہنچ کر کنور جی نے جیسے تاریک
ماحول ایک نظر پر تولا اور پھر دبے پاؤں دروازے کی جانب گئے، کنڈی دیکھی کہ
اندر سے چڑھی ہوئی ہے؟ پھر پلٹے اور صحن سے گزرتے چھپر میں بڑھے چھپر کے پیچھے
کوٹھری تھی اور دیوتی سنار کا کل زنانہ مکان یہی چھپر اور کوٹھری تھا۔ آہستہ سے کوٹھری
کے کواڑ ٹٹولے دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک گہری سی سانس لے کر دو منٹ توقف
کیا اور بند دروازے کی جانب اندھیرے میں ٹکٹکی لگائی اور بڑھ کر کواڑوں سے
بالکل چمٹ گئے اور دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ ایک کواڑ کی چولی پکڑ کر
زور کیا آہستہ سے کواڑ اوپر چڑھایا اور چول سے اُتر گیا اور دونوں کواڑوں کے درمیان
چوڑی جھری ہو گئی۔ جھری سے پنجہ گھسا کر اندر ڈال کر زنجیر کھول لی دروازہ کھل
گیا۔ اندھیرا تو یکساں تھا جیسا چھت پر ویسا ہی صحن اور چھپر میں اور ویسا ہی یہاں۔
گھپ اندھیرے ہی میں کنور جی نے اندازہ کر لیا کہ ایک جانب پیال کا موٹا بچھونا
پڑا ہوا ہے جس پر دونوں بہنیں ساتھ سو رہی ہیں۔ شہر تو دیکھے ہی اندھیرے کے اُجالے
یکساں دیکھتا ہے اور اس وقت تو شکار پر تھا لیکن اندھیرے میں نئے اور
پرانے کی تمیز کرنی تھی جس میں انھیں ذرا دقت سی ہوئی مگر پرانے شکاری تھے،
بڑی ذکاوت کے ساتھ کان لگائے۔ ایک طرف سے مہین مہین خراٹوں کی
آواز آ رہی تھی، دوسرے سے ہلکی سانسیں سنائی دے رہی تھیں مخصوص انداز
میں حملہ کرتے وقت ذرا تامّل سا ہوا مگر پھر تن بہ تقدیر جو کچھ بھی ہاتھ آئے اسی پر
اکتفا کریں گے، فیصلہ کیے اندھیرے میں تیر چلا ہی دیا اور کنور جی کی شتری
زوروں پر تھی سنبھال تھی چھوتے تو جلا ہاتھ سینے پر پڑتا اور اس وقت تڑپتا
بھی کھلے ہی بنا پر۔ جیسے کوٹھری کی تاریک وحشت چھت کے نیچے خاموش غضب
ایک چیخ سی آواز گونج کر ایک دم جہاں کی تہاں گھٹ گئی اور جیسے کوئی بے نام خوشی۔
کچھ پیال کی سرسراہٹ البتہ ہوئی اور جیسے لحاف کچھ کسمسایا ہلا سا اور پھر بدستور خاموشی تھی۔
دیوتی کی بیوی جہاں دیدہ عورت تھی سمجھتے ہیں بھی ہوش و حواس درست
رکھے سامنے وقت پر کنور جی کی چیرہ دستی کا تجربہ کر چکی تھی اور گھر گھر کے تجربات
دیکھ چکی تھی۔ نہایت تیز رفتاری سے پیال کے دوسرے سرے پر کھسک گئی
آہستہ کرتا بھی نہیں پایا مگر پیال کے نرم نرم گرم گرم بچھونے میں تو زندگی کی
بڑی آتشیں زندگی اُنگلے نکلنے میں صبح سی دو ڈگمگی شعلہ سال رنج اور بھی
چٹ چٹاچٹ چنگاریاں سی پھیل اٹھیں اور لوئیں سی تھرتھرا کر جیسے ذرا دیر
میں آگ بجھ گئی۔

ساری بستی سوتی رہی اور ساری بستی سے زیادہ بے خبر نیند کا وہ جو
دیوتی کی بیوی سوتی رہی۔ تاریک فضا میں بدستور سناٹا رہا اور کوٹھری کے اندر
کے بستر پر چلتے تیز سانسوں اور غراہٹوں کی آوازیں سنائی بھی پڑتی تھیں مگر اب
جیسے سانپ سونگھ گیا فرش پر منکا منکا آسودہ تھا اور فرش سے چھت تک موت کا
بعد والا سکوت طاری تھا۔ چھپر میں اندھیرے کی سن سناہٹ اور صحن میں رات
کی جھنجھناہٹ تک بند تھی۔ جیسے ساری کائنات دم بخود ہو کر رہ گئی ہو کنور جی نالی
تر اوپر سے گزرے تھے مگر واپس پیچھے کے بجائے آہستہ سے صحن سے گزرے دروازے کی
زنجیر کھول کر مکان سے باہر پتلی گلی میں آ گئے جہاں دکان کے سامنے دروازے کے
عین برابر کنھیا چمار ہاتھ میں لٹھ لیے پہرے پر چوکس کھڑا تھا۔ دکان کی زنجیر احتیاطاً
باہر سے لگا دی تھی مگر دکان کے اندر دیوتی اور اس کا مہمان سالا لحافوں میں
دبکے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے ایسی گہری کہ ساری بستی چیخ اٹھتی تو بھی شور ان
کے کانوں تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور پھر بفرضِ محال اگر گھر کے اندر
کوئی شور اٹھتا بھی اور ان کے کان تک آواز پہنچ بھی جاتی تو زنجیر تو باہر سے بند
تھی اور اگر اس کے باوجود اندر سے کواڑ اتار کر نکل بھی آتے تو آخر ہتھیار بند کنھیا
چمار انھیں روکنے ہی کے لیے موجود تھا۔ کنور جی کے باہر نکلتے ہی کنھیا نے آہستہ سے
دکان کی باہر سے لگائی ہوئی کنڈی اتار دی اور کنور جی کے ساتھ ہو لیا۔

کنور جی مدتوں سے جاڑوں کی طویل سرد راتیں گنگے کے دو تہے کے
درمیان چلتی ہوئی گھنڈسال میں گزارا کرتے۔ جہاں طرح طرح کی مٹھائیں کنور جی
کے رونگٹے رونگٹے میں رچی رہتیں۔ بہار کی سنہری رو پہلی راتیں کھلیان میں بسر
ہوتیں جہاں پکے ہوئے اناج کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ بھانت بھانت
کے کھلے ہوئے جنگلی پھولوں کی مہک مل کر اور کنور جی کے رگ و پے میں حلول
ہو کر انھیں مجسم دامانِ گل فروش بنائے رکھتی۔ برسات کی نم گرم کالی کالی راتیں
جب آسمان سے شراب برسا کرتی ہے اور زمین سے نم اٹھا کرتے ہیں مست
ہواؤں میں نشیلی تاریکیاں اور سوندھی نم ناکیاں زندگی میں رس ہی رس بھر دیتی ہیں
کنور جی بستی سے ملحق اپنے آم کے باغ میں گزارتے جہاں کتنی ہی آموں سندور لال
گرخوں کے رس چوس جاتے۔ شاید انھیں بھی شمار نہ تھی۔ وہ دیوتی سنار کے دروازے
سے نکل کر سیدھے گھنڈسال جانے کا ارادہ کر کے چلے۔ چند قدم ساتھ چل کر کنھیا
چمار اپنے گھر کی جانب جاتی ہوئی گلی میں کٹ گیا۔ کنور جی کو بستی سے باہر ہوتے
ہی یاد آیا کہ گھنڈسال میں صرف ایک کمبل ہے اور سوز رضائی جو اوڑھ لیے ہوئے

مختصر پُر اثر

ابوظفر زین

خلیفہ عبدالملک بن مروان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بیٹے ولید نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حالات نے پلٹا کھایا۔ ولید کے دل میں مدینے والوں کی محبت بیدار ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ کے خاص آدمی ہشام مخزومی کو معزول کر کے اس کی جگہ قریش کے جواں سال عمر بن عبدالعزیز کو مدینے کا حاکم مقرر کر دیا۔ عمر بن عبدالعزیز بعد میں خلیفہ بنے۔

ہشام مخزومی کو اس کی بداعمالیوں کی سزا میں مدینے کے ایک چوراہے پر کھڑا کر دیا گیا اور عام منادی کرا دی گئی کہ ہر شخص ہشام سے اپنا انتقام لے سکتا ہے۔ شہر کے لوگ ہشام کی زیادتیوں کی سزا دینے کے لیے بے چین تھے اور وہ تصویرِ عبرت بنا ہوا تھا۔ شہر والوں نے اسے بے حد ستایا۔ یہ سزا ختم ہونے کے بعد ہشام کے دماغ پر ایک خوف طاری تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ جب اہلِ حرم کے لوگ آئیں گے تو اس کی بوٹیاں نوچ لی جائیں گی کیونکہ اس نے اپنے اقتدار کے دور میں سب سے زیادہ اسی خاندان کو ستایا تھا لیکن جب امام زین العابدین اپنے اہلِ خاندان اور عقیدت مندوں کے ساتھ ہشام کے قریب پہنچے تو ان کا طرزِ عمل دوسرے لوگوں کے طرزِ عمل سے قطعی مختلف تھا۔ انھوں نے وحشت اور بربریت کے مجسمے ہشام مخزومی کو سلام کیا اور اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔ پھر سوال کیا: "ہشام! میں اس مصیبت میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

انیسویں صدی کے یورپ پر نپولین کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے جنگوں کی تھوک سپلائی شروع کی اور ان جنگوں نے مُردہ سپاہیوں کی تھوک سپلائی شروع کی اور ان مُردہ سپاہیوں نے دانتوں کی تھوک سپلائی۔ ان دنوں ہڈی یا پلاسٹک کے نقلی دانت وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس لیے ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو مُردہ سپاہیوں کے دانت اکھاڑ لیتا تھا اور انھیں امیروں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ امیروں کو عموماً نقلی دانتوں کی ضرورت رہتی ہے۔ انگلستان میں ہزاروں امرا کی بتیسیاں واٹرلو کے میدان سے درآمد کی گئی تھیں اور ترکہ در ترکہ ورثے میں منتقل ہوتی رہی تھیں۔ ملکہ وکٹوریا کے زمانے تک ان بتیسیوں کے چند سیٹ موجود اور زیرِ استعمال تھے۔

کھانا کھانے چلے آئے تھے' حویلی ہی میں رہ گئی ہے لہٰذا رضائی لینے کے لیے پلٹے۔ دبے پاؤں چوپال کی سیڑھیاں چڑھتے حویلی کی ڈیوڑھی کے دروازے پر ٹھہرے جو چوپال کے چبوترے کے اوپر کھلتا تھا۔ دروازے کے عین برابر مٹھو چوکیدار کی کوٹھری تھی۔ اوپر کی سیڑھی پر پہنچ کر کنور جی نے دیہاتی قاعدے کے مطابق مٹھو کو مطلع کیا کہ "میں ہوں" مگر جواب نہ ملا۔ ایں؟ کیا مٹھو آج سو کر رہ گیا؟ انھوں نے دل میں خیال کیا اور دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے کوٹھری میں جھانکا۔

لالٹین ٹمٹما رہی تھی اور مٹھو پلنگ پر لحاف میں منہ ڈھانکے بے خبر سو رہا تھا۔ انھیں حیرت ہوئی۔ آہستہ آہستہ پکارا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اندر بڑھے اور لحاف کھینچا تو جھجکتے رہ گئے۔ بستر خالی تھا اور لحاف کے نیچے مٹھو کی لاٹھی اس طرح لمبی لمبی رکھی تھی کہ بظاہر دیکھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ مٹھو لحاف میں سو رہا ہے۔ انھوں نے لحاف پاؤں سے ہٹایا تو مٹھو کی جگہ اس کی لاٹھی لمبی لمبی بستر پر رکھی ہوئی پائی جو بادی النظر میں اوپر سے ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے اس میں کوئی سو رہا ہے۔ انھوں نے دل کو سمجھایا۔ کوئی بات نہیں۔ مٹھو پہرے پر ہے۔ پچھواڑے مگر چھت کی جانب سے تو وہ خود آ رہے ہیں اور آواز بھی نہیں سنی۔ انھوں نے دو منٹ سکوت کیا اور گہری سانس لی۔

'اونہہ بے نالائق۔ تنہا اندھیرے میں پہرے پر چل دیا ہے' انھوں نے اپنے پشتینی وفادار باڈی گارڈ کی لاٹھی اور لالٹین یہاں چھوڑنے کا جواز اپنے دل میں پیش کیا اور جیسے نہایت آہستہ سے کہیں کواڑ کا کھٹکا سنائی دیا اور پھر جیسے کسی بند جگہ میں کنڈی چڑھانے کی آواز سنی۔ وہ کوٹھری سے باہر آئے اور جیسے ڈیوڑھی کے کواڑوں کے سامنے اور پیش دروازے کی زمین پر مٹھو چوکیدار ایکا ایکی اُگ سا آیا۔ کواڑ جوں کے توں بند تھے۔ انھوں نے مٹھو کو سر سے پاؤں تک پرکھا۔ "اور کہاں تھا؟" کا رسمی سوال ان کے منہ سے نکلا۔ سوال تو نوعِ اجنبیت کے سلسلے میں یوں ہی بے معنی سا تھا مگر جواب میں نوجوان ملازم کی گھگھی کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ کنور جی کی باعزت دولت کی تاریکیوں میں بھی دن کی روشنی سے چھلکم نہ دیکھتی تھی اور مدتوں سے مٹھو کے پہرے کا راستہ بچاتے ہوئے تھے۔ اس وقت اس کی ناگفتنی کیفیت دیکھ کر گفتنی و ناگفتنی سب کے سب بغیر کہے سب کچھ سمجھ گئے مگر جیسے ان کے اندر دیرینہ شاہ کی بوڑھی سی کروٹ لے گئی۔

انھوں نے اس کے حلق سے نکلتی ہوئی مہمل آواز کی کلام موزوں کی جانب خود ہی رہنمائی کر دی۔ "ہوں! پچھواڑے پہرے پر جایا کر۔ تو لالٹین اور لاٹھی لے کر جایا کر۔" اور لمبے تڑنگے جنگل کو جیسے نصیحت اوپر نیچے جھمک دیتا اور دل کو سمجھایا کہ جنگل تو زمین داروں کے بڑے جاں نثار ہوتے ہیں اور بڑے معتمد نمک حلال۔ ایسی حرکات میں کیا پڑنے کو آ رہا ہے ان کا جلبار۔

بت بنا ہٹ سن کر بوڑھے سا بوجی چوپال ہی سے کھانسے۔ کنور جی کی توجہ اُدھر گئی۔ سوچا اب کون ڈیوڑھی کے پٹ کھلوا کر رضائی لینے اندر جائے اور بوجی کو سوتے سے جگائے۔ خرامی کے قدم ڈالتے چوپال میں گھس گئے اور الگنی پر پڑے چوپال کے لحافوں میں سے ایک لحاف اتار کر گنگناتے چلے گئے اور سیڑھیوں سے اترتے وقت مٹھو چوکیدار کو ہوشیار رہنے کی رسمی ہدایت دینا نہ بھولے۔

کھڑسال پر کام بڑھ چکا تھا۔ مزدور اور کاری گر اپنی اپنی منڈیوں اور دھوں میں دبک چکے تھے اور عمل سناٹا تھا۔ ان کی کوٹھری میں لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ کنور جی اپنے بستر میں دبک گئے اور لحاف کی گرم گرم نرم نرم سوندھی سوندھی لوریاں سی دیتی لہروں تلے نیند کے گنگناتے تھپیڑوں میں جب انھوں نے آج کے لین دین کا حساب لگایا تو میزان میں نفع ہی نفع آیا اور کچھ بھی ہو بہو جی تھیں تو خیر بہو جی مگر بے لگن کی جا ہی نہ بر بن کھینچ تان کر لگن ہوتے نکال دیں تو کیا ہوتا ہے ان کے ستارے اپنے راستے پر چلیں گے ان کے ستارے اپنے راستے پر چلیں گے۔ ستاروں کی چال پر کس کا بس تھا۔ ان کا نہ بہو جی کا۔ یہ بھی ستاروں کی چال کی بات تھی کہ تمام دن بلبل ہزار سے دست و گریباں بہنے والے اچھوت کی تقدیر ساری رات ایسی جاگتی کہ سونے والوں کی پہرہ داری کرتی۔

"یہ کتاب ہم نے لکھ تو لی۔
لیکن جب چھاپنے کا ارادہ ہوا تو لوگوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو یہ کورس میں لگ جائے یعنی ٹیکسٹ بک بورڈ والے اسے منظور کر لیں اور عزیز طلبہ کا خونِ ناحق ہمارے حساب میں لکھا جائے۔ جن سے اب بھی ملکہ نور جہاں کے حالات پوچھے جائیں تو ملکہ ترنم نور جہاں کے حالات بتاتے ہیں۔ ہم نے احتیاطاً اس کا مسودہ ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین میر نسیم صاحب کو بھیجا جو انھوں نے گہرے غور و خوض کے بعد نامنظور کر دیا۔ میر صاحب کوئی بات غلط کریں یا صحیح، غور و خوض ضرور کرتے ہیں۔ اُن سے پہلے یہ ہو چکا ہے کہ ایک صاحب کسی کام سے بورڈ گئے۔ وہاں اپنے پسندیدہ فلمی نغمات کی کاپی بھول آئے۔ بورڈ والوں نے اُسی کو منظور کر کے پرائمری کے نصاب میں داخل کر دیا۔

سوالات

(۱) محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیوں کیے تھے؟
(۲) محمود غزنوی نے سترہ حملے کس ملک پر کیے تھے؟
(۳) ہندوستان پر سترہ حملے کس بادشاہ نے کیے تھے؟ جواب میں نام کی ...
(۴) محمود غزنوی نے ہندوستان پر اٹھارہ حملے کیوں نہیں کیے؟ سترہ پر اکتفا کیوں کی؟

نوٹ: سوال نمبر ۲، ۳ اور ۴ لازمی ہیں۔

"اردو کی آخری کتاب" — ابنِ انشا

چھوٹی بہن پر تو خیر ہی گزری ہی لیکن بڑی کے نزدیک تو وہی ہوئی جو اُس پر دس بارہ سال پیشتر بیت چکی تھی۔ چھوٹی بہن پر تو بڑی خیریت سے بیتی ایک بچی بھی نہ سنائی دی ورنہ ریوتی کی بیوی پر تو اپنے وقت میں ایسے زور و شور سے بیتی تھی کہ سارا گاؤں گونج اٹھا تھا اور ریوتی سنار تین دن گھر سے نکل کر دکان تک نہ آئے تھے اور بیچارے منہ چھپائے پڑے رہے تھے۔ ریوتی کی بیوی جانتی تھی کہ رات پھر آنے والی ہے اور وہ روز خیریت سے تھوڑی بیت سکتی ہے۔ اور کچھ نہ ہوا تو اتنا ہی بھونک پڑا تو اُس کی تو کچھ نہیں تھی، چار ہاتھ کا خصم بیٹھا تھا۔ چند روز گاؤں والے سرگوشیاں کر کے چپ ہو رہے تھے۔ اس بیچاری کنواری لڑکی کی تو بڑی بدنامی ہو جائے گی، ناک کٹ جائے گی۔ پرایا دھن اپنی امانت میں رکھنے کی گنجائش نہ دیکھی اور دوپہر ہی کو اُلٹے پاؤں رخصت کر دیا۔

کنور جی اور بہو جی دونوں آج کی شب ایک ہی تقدیر سے دوچار ہوئے۔ اب تک تو مٹھوا کا بچا جو دھا چوکیداری پر تھا۔ مٹھوا نے تو ابھی مہینے عشرے ہی سے بچا کی جگہ لی تھی۔ بہو جی کے پاس تو کنور جی جیسے کچھ نفیس ستون سے شہر کی آڑ تھی اور اس آڑ میں بیٹھ کر خواہ مسیح کا کام والا پچاس سالہ چار کھنیا ہو یا دوپہر کا کام والا جوان مسنڈا رمضانی جُلاہا ہو یا رات کا چوکیدار بوڑھے جودھا کے بجائے نوخیز مٹھوا۔ آنکہ پدر نتواند پسر تمام کند سب کی کارگزاری کنور جی کے ہی حساب میں درج ہوتی مگر چھوت تو چھوت ہے، نہ لگے تو جنگلی چمار جُلاہا سر سے پاؤں تک چمٹا رہے اور نہ لگے اور لگ گئے تو برہمن چھتری ویش پاس سے چھو کر نکل جائے تو چھوت کر رہ جائے۔ بہو جی کو تو جنگلی کی چھوت لگ کر بھی نہ لگ سکی۔ مسلمان کو کنور جی کی چھوت ایسی گھسی کہ غریب ناک کان کے ساتھ ہاتھ پاؤں سے بھی نہ چھوٹ سکی۔ کنور جی کے بائیں ہاتھ کا تو تب اور ریوتی کی بیوی کے بائیں پہلو کی کروٹ رنگ لے آئی۔ بیچاری کے پیٹ میں مینڈھے کا کیڑا بیٹھ گیا۔ تیسرے ہی مہینے میکے سے خبر پا کر ریوتی کی بیوی پہنچی۔ دیہاتی دائیوں کے علاج کے ذریعے کنور جی کی زندہ شرارت کا ازالہ کرنے کی کوشش کی شہر تک کے دواؤں میں منگائیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور یہاں تک کہ وہ شور پڑ کر رہا جو زمانہ پیشتر ریوتی کی بیوی کروٹ بدل کر اور ریوتی کی سالی دم سادھ کر بچا گئی تھیں مگر شور تو اپنی پنچایت کے زور سے اپنی بڑی سے بڑی لغزشوں کا ازالہ کر لیتے ہیں۔ اس کے ازالے میں ریوتی کی بیوی ناکام رہی تو پنچوں نے بروقت دست گیری کی۔ مہاجن سناروں کی دیہاتی پنچایت نے تاوان ڈال کر قصور معاف کر دیا اور زور دے کر ریوتی سنار کا بیٹا قرار دے کر اس کے سر منڈھ دیا اور لڑکی کو بھرے کنواری مان کر ایک نوجوان مہاجن سنار کے ساتھ اس کا بندھن کر دیا۔ بیٹا دے کر ریوتی کی بیوی گود بھرے خوشی خوشی گھر آئیں اور بہن کا گھر بھی بسا آئیں۔ ریوتی سنار کا اگرچہ یہ بار بہت زیادہ کھلا۔ مدتوں سے لگی جورو ہی کو وہ پہچانتے تھے جو جا کہ پنچوں نے جو زبردستی اس پر یہ تاکید کر چپکا ہو گا۔ بڑھاپے میں سالی سے تبسم کر کے اقرار کر لیا اور ریوتی بیٹے والے کہلائے۔

حادثے کی ستم ظریفی یہی ہی ساعت کی مٹھوا چوکیدار کے پہرے کی کارگزاری کنور جی کے گھر میں راج کماری کے ڈیپ میں چمک اٹھی مگر بہو جی کو تو علم تھا ہی اور کنور جی کے ہاں بھی پشتوں سے حساب کتاب ہی پیشتر چلا آرہا تھا۔ اُن کے اور بہو جی کے درمیان حساب کتاب کی عمر بھر کی میزان انگلیوں پر تھی اور آج کی رات تو آج کی رات۔ آج کی رات کے ادھر ادھر دُور دُور کوئی رات اکیلی تھی نہ رہی ہی۔ پھر کنور جی میزان کی بیشی کی اہمیت کیوں نہ سمجھ گئے ہوں گے اور یہ تو اسی سال کے اندر کی بات تھی انھیں تو سالہا سال کی ایک ایک بات یاد تھی جن تاریخوں میں بہو جی کے لڑکی ہوئی انھی کے ادھر ادھر دھنا کے ریوتی کی سالی کے لڑکا ہوا۔ اِن دونوں ان ہونیوں کے وہ اور ریوتی سنار دونوں بچارے جتنے قصور وار تھے اس کا بھی انھیں خوب اندازہ تھا۔ ریوتی سنار کے لڑکے اور اپنی لڑکی کے رشتے کے میزان میں انھیں صفر آنے کا حساب بھی معلوم تھا۔ ریوتی سنار کنور جی اور مٹھوا تینوں حساب دوستاں در دل کر کے رہ گئے۔ سابو جی کے گھر کا راستہ تو مدتوں سے اور دلوں ہی کی کمائیاں دیکھے ہوئے تھا۔ مٹھوا کی محنت کے ستاروں نے بھی ادھر رخ

کر دیا اور پھول وتی کے روپ میں اُن کے گھر چہک گئے۔ مثل مشہور ہے کہ شودر کے گھر میں پدمنی جنم لیتی ہے مگر یہاں ستاروں کی چال دو پشت سے اُلٹی تھی۔ چھتری ویش کی کوکھ میں جا براجا اور شودر نے پدمنی کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے۔

ریوتی بچارے کی بھی ساری عمر تیرا میرا سونا چاندی بناتے سنوارتے گزری تھی۔ ہمیشہ اوروں ہی کے مال سے اُن کے ہاتھ پیلے ہوتے تھے۔ ریوتی کی کھیتی یوں جمتے بسے کنور جی کی ایک ہی جست کے طفیل ہری ہو گئی اور اُن کے گھر کا بے آب و گیاہ ویران میدان بیٹے کی آواز سے چہک اٹھا۔ دنیا میں ہری پرشاد کا وجود کالی رات میں چھت سے چاند پڑنے کے حادثے کی صورت میں نازل ہوا تھا۔ ماں کے پیٹ میں پھوڑا سے بن کر عالم وجود میں آئے اور باپ کی گردن پر سوار ہو کر سوار ہوئے۔ ریوتی کے سامنے اُس کے تجاہلِ عارفانہ کی زندہ تشکیل ماں نہ ماں میں تیرا مہمان، جبریہ بیٹا بن کر کھڑے ہو گئے۔

وقت گزرتا گیا۔ وقت بڑا اندمال کرنے والا ہوتا ہے۔ ریوتی سنار کے بدن پر ہری پرشاد کا وہ وجود جو ناسور بن کر رونما ہوا اور بعد گزشت بن کر رہ گیا، سچ مچ اُن کا کارآمد عضو سا بن گیا۔ چاہے دنیا تو یاد رکھا ہو مگر ریوتی سنار تو اپنی وہ خود فریبی بھول گئے جو جبری رعایت میں ہری پرشاد کو اپنے سمیٹتے وقت انھوں نے اپنے اوپر طاری کی تھی اور اُن کا وہ زبردستی باپ والا بہروپ آج سچ مچ باپ سا بن کر رہ گیا۔ ریوتی سنار کی بیوی موسی تھی اور موسی تو ویسے ہی ماؤں سی ہوتی ہے وہ ماں بن کر رہ گئی تو کیا تعجب تھا۔ ہری پرشاد ریوتی سنار کے گھر میں اکلوتے لاڈلے بن کر پلے مگر اپنی اصل نسل نہ جانتے ہوئے بھی گئے اپنی اصل کو۔ صورت شکل کے اعتبار سے ماں باپ کا مناسب امتزاج۔ عادت و خصلت کے لحاظ سے باپ کی زندہ تشکیل تھا۔ ان سنار کے گھر کا تربیتی ماحول بہت ہی کم اثر انداز ہو سکا۔ بچپن ہی سے چال ڈھال بانکپن کا اندازہ کر کے ماں باپ نے پیار میں بابو بابو پکارنا شروع کیا۔ جسے شروع میں گاؤں والوں نے طنزیہ پکارا مگر سن شعور کو پہنچتے پہنچتے ہری پرشاد غائب ہو گئے اور بابو بنتے گئے اور جوان ہوتے ہوتے بابو ہی رہ گئے۔ ہری پرشاد فراموش ہو گئے۔

ریوتی سنار نے اپنے بڑھاپے کے وقت کا خیال کر کے انھیں بچپن سے کام پر لگا لیا۔ جوان ہوتے ہوتے بابو جی ہنرمند قسم کے سنار بن گئے۔ ریوتی بچارا پرانی چال کا دیہاتی سنار تھا۔ اپنی ٹھک پر بیٹھ کر باپ دادا کے موٹے بھدے نمونے گڑھنے والا مگر بابو سنار نے نئی دنیا سے متاثر ہو کے نہایت چمک دار نئی ہوئی سائیکل خریدی جس میں خوب چمک دار رنگین کریچ کا بڑا سا خوبصورت تھیلا لٹکایا اور نئی وضع کے اوزاروں سے بھرا۔ سر پر انگریزی فیشن کے چمک دار بال رکھائے۔ سرخ بلیزر کا چمک دار بٹنوں والا شارٹ کوٹ پہنا۔ سیاہ مخملی کنار کی باریک دھوتی باندھی۔ پاؤں میں سیاہ پیٹنٹ لیدر کی گرگابی پہنی اور جہاں گرد سے دس دس میل چاروں طرف جھانٹی میں گاؤں گاؤں سائیکل پر پھر پھر اُڑتے گھوم لاتے رہے جاتے چہکا کرتے اور معمولی محنت کا کام اپنے تھیلے کے جدید اوزاروں سے جہاں تہاں کر کے دینے لگے۔ شروع شروع میں تو گاؤں کے بچے بوڑھوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ ہوا لگی ہے اس لونڈے کو مگر تھوڑے دنوں گاؤں گاؤں گھر گھر گھومنے پھرنے کے سبب بابو سنار اپنے حلقے میں مخصوص اہمیت کے حامل ہو گئے۔ کام اور آمدنی کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ جھانٹی کا پرانا روایاتی حلقہ بڑھ کر بہت وسیع ہو گیا۔ ہر کھاتے پیتے گھر کی نوجوان اور بوڑھی عورت کے عزم اور چنگر سے بن گئے کہ پیسے کی جنس خفیہ بچت اور دوسرے خاموش ذریعے سے آیا ہوا مال نہایت ہی رازداری کے ساتھ زیور کی شکل میں تبدیل کر دیتے۔ یہ تو چوری چھپے کی بات تھی اور اس کا حساب کتاب بابو سنار ہی کے دل میں رہتا تھا۔ یوں بھی سیدھی سادی زیور کی تیاری میں لیتے دیتے پیسے میں چار آنے بھر کاٹنے کی تول میں اُن کے پلے رہ جاتا اور چار آنے بھر گلاوٹ میں اُن کی بھٹی کی راکھ میں مل جاتا۔ چار آنے بھر ملاوٹ تانبے کے بٹے میں بچ رہتا اور بقیہ چونی بھر تو مشہور بات ہے کہ ہوائی میں جایا کرتا ہے۔ غرض من میں پچاس سیر پانی باقی دودھ ہی دودھ تیار کر کے مالک کے ہاتھ میں دیتے۔

بابو سنار کی سائیکل کی سریلی گھنٹی بجتے ہی گاؤں کی اُبھرتی ہوئی کنواریاں شرتیں بہوئیں اور منجھلی بیاہیں اٹھلاتی ہوئی دروازے پر آ جاتیں۔ ٹوٹے پھوٹے چھلے، بالے بالیاں، پتے، کہیں کہیں کڑے چھڑے، پچھلے بچھا نجھن، رام جھول اور چھاگل پائل نکل پڑتے۔ کہیں تو بنے بنائے نئے چمک دار نئی وضع کے زیوروں سے جو بابو سنار کے تھیلے میں ڈبیوں ڈبوں کے اندر بند ہوتے الٰہ دین کے پرانے چراغ سے نئے چراغ بدل جایا کرتے اور کہیں کہیں کسی جگہ ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کا فوری کام ہوتا۔ کہیں تھر طلاق نئے نمونے کے بندوں میں اور جھمکے سہارے انگریزی نمونے کے چھلوں میں مسخ کرنے ہوتے اور جہیز دیتوں اور پہنچیوں بازو بندوں کو توڑنے اور گردوں میں قلب ماہیت کرنا ہوتا اور کبھی کبھی گلے کا ہار پاؤں کے کڑے اور ہاتھوں کی گنگھنیاں توڑ کر انگوٹھی کی تعمیر پیش نظر ہوا کرتی اور روپیں میں طلا اور منڈھے (ایڈورڈ) شاہی روپوں میں کنٹھے لگا کر اور ہنسلی کا تعویذ بنا کر میل بنانے کا آرڈر تھا۔ یہ سب بازار بابو سنار کے اس کانٹے میں چڑھتا اُترتا جو لیتے وقت تو ساڑھے گیارہ ماشے تول کر رکھتا اور تیاری کے بعد نہایت ایمان داری کے ساتھ تولے کا تیرہ ماشے تول دیتا اور شوہروں بیٹوں اور بھائیوں کی نظر سے بچا کر جمع کی ہوئی چاندی چپکے سے بابو سنار کے تھیلے کے لمبے چوڑے پیٹ میں اتر جاتی اور بابو سنار اپنی کیمیاگری کے زور سے دھڑیوں کانسا اور جرمن سلور ایسا چمکاتے کہ کچی چاندی کو شرما دیتے اور پیتل پر ملمع کا چڑھا کر پکا سونا ماند کر دیتے۔

اس کے علاوہ بابو سنار کی پوزیشن اپنے حلقہ اثر میں گشتی بینک جیسی تھی۔ ضرورت مند عورتوں کے زیورات اوچھی دنیا کا ماہوار سود در سود پر گرو رکھ کر چپکے سے بیچاریوں کا کام نکال دیتے اور اپنا اصل سود وصول کر کے جس کا تس زیور واپس کر دیتے ایسا جس کا تس کہ عمر بھر استعمال کرنے والی کیا مجال جو ذرا بھی شناخت کر سکے کہ یہ زیور اُس کا اپنا ہے یا نقل مطابق اصل سونا چاندی آخر منزل تک پہنچانے

میں بالو سنار کا فیض عام تھا اور اپنے حلقۂ اثر کے گائل راتوں میں سر ہتھیلی پر رکھ کر کمائی کر کے لانے والے جیوٹ جوان سب سے پہلے اپنی کمائی بالو سنار کے ہاتھ پر لا کر دھرتے کیونکہ انھیں بالو سنار کی ایمانداری پر اتنا ہی بھروسا تھا جتنا تھانیدار کی بے ایمانی کا اندیشہ۔ سب گروہ بالو سنار کے اتنے معتقد تھے کہ خاص بالو سنار ہی کے ہاتھ سے تھانیدار کے حق کا تہائی علیحدہ کرا کے آپس میں تقسیم کر لیتے۔ خیر یہ کام تو بالو سنار بڑے اطمینان سے کرتے لیکن جس مال میں تھانیدار کا دھرم کا حق نہ ہوا کرتا اس کی قلبِ ماہیت میں بالو سنار بڑی سرگرمی اور شدید سوز و گداز کا مظاہرہ کرتا اور جب تک تھانے میں رپورٹ اول درج ہوا اتنی دیر میں ان کی بھٹی سے گزر کر وہ ٹھکنی کے زیورے جدید سے جدید تر شکلیں اختیار کر جاتا اور تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری کے آہنی پنجے سے کوسوں دور ہو جاتا۔

پھول وتی گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی۔ بالو سنار اپنے گاؤں کا سنار تھا اور علاقے بھر کی ٹھکرائنوں، زمیندارنیوں، جاٹنیوں اور بنیائنوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ بھلا پھول وتی کی جوہر شناس نگاہیں بالو کے آرٹ پر کیوں نہ پڑتیں اور پھر اپنے گاؤں کا اور پڑوس کا لڑکا، ساتھ کا کھیلا، گھر کا پلا بڑھا معتمد جس کا باپ پھول وتی کے باپ دادا کا کھرے کھرے سونے چاندی کی پرکھ میں معتبر منیم تھا۔ پھول وتی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ دادا کو بالو کے باپ کی تعریف کرتے سنا تھا لہٰذا پھول وتی کے دل میں بھی اس کی جانب سے ایک مخصوص قسم کی دلچسپی اور عزت تھی جو ہوش سنبھالتے ہی شعور میں رچ گئی تھی۔

پھول وتی تو خیر سچ مچ پھول تھی، اسم با مسمّا اور پھول بھی کھلتا ہوا گلاب۔ بالو سنار بھی بڑا گبرو جوان نکلا تھا، بھرپور ستھرا پیشہ، باتوں میں بلا کا رس، آواز میں جانے کی سلونی سی تری کی سی جھنکار، طرز گفتگو اور لہجے میں سونے کی سی لچک، آنکھوں میں سچے موتیوں جیسی آب و تاب، متناسب جلد، زیب جسم اچھا، موزوں لباس، چال ڈھال میں فولاد کی سی لچک، جھانکتی ہونٹوں کی سکراتی ساخت، مخصوص انداز میں ہنستا تو ہونٹوں کے ساتھ آنکھیں بھی کھل کھلا پڑتیں اور جب جل ترنگ سی بجاتی ہنسی ختم کرتا تو گھنی پلکوں کی چھاؤں سے ہرن کی طرح تیز تیز کن انکھیوں سے چھپک کر حاضرین کا جائزہ لیتا۔ گاؤں کے ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتوں کی نفسیات کا شناسا تھا، فرداً فرداً ہر ایک کی افتادِ طبع کا ان کے شوہروں سے زیادہ محرم راز۔

بہو جی اپنی بھی تنظیم زر کے سلسلے میں کبھی کبھی چپکے سے بالو سنار کو گھر کے اندر بلوا کر کام دے دیا کرتیں مگر پھول وتی کی گانٹھ تو کھلی تھی، ماں سے علیحدہ تھی پھر ابھی زیور سنگھار کا شوق نیا نیا تھا۔ یوں بھی دیہات میں بہوئیں گھروں میں بھنچتی ہیں اور لمبے گھونگھٹ نکال کر چرخی چرخی دیکھی دیکھی خوارش جگہوں میں ضرورتاً نکلتی ہیں لیکن لڑکیاں تو لڑکوں کی طرح منہ کھولے دُرتوں کے پیچھے آزادی کرتی پھرتی ہیں لہٰذا پھول وتی کو کوئی دن ہی ایسا ہوتا ہو گا جس دن وہ ایک آدھ زیور کسی نہ کسی زیور کی تیاری، مرمت اور نمونے پسند کرنے کے سلسلے میں بالو سنار کی دکان میں نہ جانا پڑتا ہو۔ کسی نئے نمونے کی تیاری کے زمانے میں تو دو تین دفعہ گھنٹے گھنٹے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے جا کر بیٹھنا پڑتا اور شوق کے ساتھ تیاری کے جملہ مدارج آنکھوں کے سامنے طے ہوتے۔ نئی وضع کے بندے، نئے نمونے کے جھالوں، جوڑیوں اور انگریزی طرز کے ٹاپس اور نیکلیس کے سیٹ کی تیاری کے دوران میں تو بالو کو شہر کے کاری گروں کی مدد لینے کئی بار شہر جانا پڑتا اور شہر سے سیٹیں لا لا کر نمونے پسند کرانا پڑتا۔

گھر میں سونے کی کمی نہ تھی۔ نئے شوق میں بالیدگی تھی، بادِ صبا جیسے سہانا کہ چلتا ہی رہتا اگر کچھ دنوں کے لیے پھول وتی سست سی ہو جاتی تو بالو کوئی نہ کوئی نیا نمونہ شہر سے لا کر شوق تیز کر دیتے۔ سونے چاندی کی چمک کے ساتھ محبت چلا پاتی رہی۔ ساخت اور نکھار کے سلسلے میں عشق کی منزلیں اور پاستی رہیں، پینگ بڑھتے رہے اور بالو سنار کا ستھرا آرٹ پھول وتی کے حسن میں خود ہی چار چاند لگا لگا کر خود ہی تماشائی بنا رہا اور پھول وتی کو کندن کی طرح دمکاتا رہا۔ کنور جی جا کر ان کی دعوت دیتی راتوں میں کھاتا اور رس سے نہ معلوم کتنی شیرینیاں پیدا کرتے رہے اور برسات کی اندھیریوں میں نہ معلوم کیسے کیسے سرخیل اور سندیس کے رس چوستے رہے۔ ساہو جی ٹھاکر مکانی بنے اپنے ہی کھاتے کے صفحوں پر شیر قالین کی طرح شکار کھیلتے رہے اور سود در سود اور بیاج لاجھ بٹا نقد جنس کی لہروں میں زیر و زبر ہوتے رہے۔ ڈیوڑھی پر متھوا بھنگی چوکیداری کرتے کرتے نوجوان سے ادھیڑ ہوتا گیا اور اس کی پاسبانی کے طفیل حویلی کے اندر بہو جی کی جوانی پچاس کے پیٹے میں پہنچ کر بھی نوجوانی ہی بنی رہی۔ آج تک آدھی رات گئے تاریک آسمان میں جب کوئی ستارہ شہابِ ثاقب بن کر چھوٹتا تو متھوا بھنگی کی تقدیر کا ستارہ نابدان سے اچھلتا اور جیسے گندی کیچڑ میں سے چل کر دمکتے آسمان پر زہرہ و مشتری کی طرح چمکنے لگتا۔ ڈیوڑھی کی زنجیر اندر سے سرک چندی کی طرح آپ ہی آپ کھل جاتی اور بہتی ہوئی نالی کی لہریں پگھلے ہوئے سونے چاندی کی موجوں سے مل کر ایک نئے مرکب کی ترمینی بنانے لگتی اور اسی ترمینی کی اولین لہروں کی ابھری ہوئی ہلکی پر ہی پھول وتی تھی جس کے پھول ہر صبح سرخ رنگ اور ہر شام تیز مہک کے ساتھ کھل رہے تھے اور ہر شب بالو سنار کے گلے کا ہار بن کر تنتی ہی چلا پا رہے تھے اور کنور جی کا سولہ سترہ سال پرانا اترا ہوا راستہ بالو سنار نے چڑھنے کے لیے دریافت کر لیا تھا۔ اس پر آتی گنگا بہہ رہی تھی۔ بالو سنار اپنی ماں خالہ کا کھایا قرض مع سود در سود ادا کر رہے تھے۔ کنور جی اگر بنیے تھے تو بالو سنار بھی مہاجن تھے۔ خوش معاملگی میں کوئی کسی سے کم کب تھا؟

دونوں پارٹیاں ریلوے جیسے ڈسپلن کے ساتھ ایک دوسرے کا سامنا بچائے اپنی اپنی راہ پر چلی جا رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہوئے انجان بنی ہوئی تھیں۔ جب متھوا چوکیدار پچھیت کی جانب پہرے پر پہنچ جاتا اور رات کی خاموشی میں بالو سنار ڈیوڑھی کے کواڑوں کا مخصوص کھٹکا سن لیتے تو

باپ کے نقشِ قدم پر اٹھے ہوئے اپنے گھر کے صحن سے چار دیواری کی منڈیر
منڈیر کی سمت جست لگاتے۔ چھجے کی ہوگری پر بلی کے سے قدم ڈالتے کوٹھری کی چھت پار
کر کے حویلی کی چھتوں پر ہوتے ہوئے زینے میں اتر جاتے۔ اتنی دیر میں ہوجی کے
دالان کی کنڈی بند ہو چکی ہوتی اور چراغ بھی گل۔ پھول وتی کی کوٹھری میں لالٹین
سناتی ہوتی اور زینے سے پھول وتی کی کوٹھری تک صحن میں ایک سایہ سا چلتا
پھر نہایت آہستہ سے چٹخنی میں آہٹ سنائی دیتی۔ کواڑ بند ہونے کا کھٹکا ہوتا اور
کوٹھری میں گھپ اندھیرا اور حویلی میں ہُو کا سناٹا۔ جب دن نکلتا اور بستی کا چپا چپا
گلی کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھتا تو دونوں ماں بیٹی کے چہرے تجاہلِ عارفانہ کی معصومیت
اور رازداری کے اطمینان سے چمک اٹھتے۔

کون نہیں جانتا کہ لڑکی ذات پرایا دھن ہے۔ اسے بابو سنار بھی اچھی
طرح جانتے تھے کہ پھول وتی جانے والی چیز ہے اور پھول وتی کو بھی اندیشہ تھا کہ
بابو سنار چھوٹنے والا عنصر ہے اور نہ معلوم دونوں میں سے کس کے دماغ میں یا دونوں
کے ماتھوں میں ساتھ ساتھ یہ سودا سوار ہوا کہ اگر وہ کسی طریقے سے ایک دوسرے کو حاصل
کر سکتے ہیں تو اپنی برادری کے زور سے سماج رواج اور قانون سے ٹکرا کر ورنہ بابو
شودر سنار اور پھول وتی ویش زمیں دار ویسے بابو اپنا گاؤں چھوڑ چار چھ کوس
آس پاس چار پیسے والے گنتی شمار کے لوگوں میں سمجھے جاتے تھے اور پھر سنار کی ہر جگہ
قدر تھی لوہے کی ہتھوڑی چھینی سے چاندی بنانے والے پھر گاؤں میں کوئی زمین
ڈیل کاری ہو ویسی نہیں بڑا سا مکان نہیں ملا جوڑا کنبہ نہیں۔ ہوتی کی بڑھیا بھی مر
چکی تھی۔ باپ بیٹے فقط دو دم۔ ہستی سے زیادہ آمدنی اور خرچ ندارد۔ جو کچھ خرچ کر لیتا ہو
اپنے مانگ ٹیم کپڑے لتے ٹیپ ٹاپ رکھنے میں بابو ہی کرتا ہو جب پھول وتی نے
ایک آدھ مرتبہ اصرار کیا تو بابو نے یہ کہہ کر سمجھایا کہ آج ہم پر ایسی کیا مار پڑ گئی ہے۔

لیکن جب سائیں جی نے پھول وتی کے رشتے کی تلاش شروع کی اور چاروں
طرف بسیٹھ دوڑائے تو پھول وتی نے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے پر شدید اصرار کیا جو
ان کے ماتھوں میں مدت سے پلے وقت کے لیے محفوظ تھی مگر بابو نے شروع اطوار پر ٹالا
مگر تا بکے اور وہ تو ایک دن ہونی ہی تھی اور جب تک گاؤں میں بے خرچے گزر رہی
تھی۔ بابو سنار تھوڑی بہت مصیبت جھانی تو شہر کے اندر مدتوں سے کرتے تھے اب
دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ ویوتی سنار کی ساری عمر کی جمع جوڑیا اپنی ساری کمائی اور
پھول وتی کا گل گہنا ایسے ہی وقت کے لیے بابو سنار کے قبضے میں تھا اس میں شک
نہیں کہ یہ سرمایہ دیہات میں بڑے سے بڑا کاروبار کرنے کے لیے تو بہت تھا مگر شہر میں
ایک چھوٹی سی دکان جمانا بھی مشکل تھا اور کم سے کم اتنے ہی سرمائے کی اور ضرورت تھی
جسے پورا کرنے کا وعدہ پھول وتی نے کیا اور پوس کی اماوس کی رات کا اپنے اقدام
کے لیے تعین ہو گیا۔ سمجھے ہوئے تو ٹھوا بابو کو اور بابو ٹھوا کو۔ ہوجی پھول وتی کو اور پھول وتی
ہوجی کو اتنی ہی اچھی طرح تھے جتنے خود اپنے آپ کو لیکن ہر ایک کو یہ سمجھ کر اپنے
کام سے کام تھا دوسرے کا راز اپنا راز تھا لہٰذا ان چاروں میں سے کسی کی ذات سے
افشا ہونے کا امکان نہ تھا حتیٰ کہ ایک دوسرے کی تفاصیل میں جانے کا خیال بھی دل
میں نہ لاتے اور ایک دوسرے کی جانب سے گونگے بہرے اور اندھے بنے رہتے۔

رات کا محرمِ راز چوکیدار دن کا جاسوس قسم کا بہار ٹھوا کچھ تو قرائن سے اور
کچھ بابو کی روز روز شہر کی دوڑ دھوپ دیکھ کر شبہے میں پڑ گیا اور آج کی رات تو بلا
کی اندھیری تھی۔ اگرچہ ان کے درمیان بات چیت ہوئے بغیر از خود یہ خاموش معاہدہ سا
تھا کہ وہ ایک دوسرے کے معمولات میں مخل نہیں ہوں گے پھر بھی ٹھوا نے خلافِ
معاہدہ اقدام کیا اور جس وقت ڈیوڑھی کی زنجیر اندر سے بند کر کے حویلی میں آیا تو
آج ایک قفل ہمراہ لیتا آیا اور جس وقت صحن سے گزرا تو چپکے سے زینے میں ایک
قفل جڑ دیا اور کنجی انٹی میں لگا کر خاموشی کے ساتھ حسبِ معمول اپنے شبستان
عشرت میں چلا گیا۔

حویلی میں سناٹا تھا۔ ہوجی کے دالان میں چراغ گل ہو چکا تھا اور خاموشی
تھی۔ پوس کی اماوس کی رات! آج کی رات تو بڑے ڈھب کی تھی۔ ماحول اور
وقت کا اچھی طرح اندازہ کر کے پھول وتی دبے پاؤں اٹھی چٹخنی سے گزرتی چلتی
کوٹھار گودام میں پہنچی۔ ایک کونے میں غلے کا ڈھیر پڑا تھا۔ اسے ایک جگہ سے کریدا
اور قریب ہی پڑی ہوئی ایک کھرپی اٹھا کر مٹی کھودنا شروع کی۔ تقریباً ایک بالشت
کھودنے پر ایک تختہ نکلا اور تختہ اٹھانے پر زمین کے اندر سے تھوڑی کوشش کے
بعد تھیلی کی شکل برآمد کی اور تھیلی بغل میں دبا کر نکل آئی چٹخنی سے اپنی اوڑھنی چادر اتار
کر اچھی طرح لپیٹ لی اور زینے کی جانب چلی مگر زینہ تو آج بند تھا اور مقفل پھول
وتی کے دماغ میں بگولے گھومنے لگے۔ آج خلافِ معمول زینے میں جڑا ہوا تالا اس
کی آئندہ زندگی کے دوراہے میں جڑا ہوا تھا۔ بس آج ہی کی تو رات تھی۔ کل تو
سب راز افشا ہو جائے گا۔ اس پر اور بابو سنار پر قیامت ٹوٹ جائے گی اور بڑے بڑے
پہاڑ ٹوٹ جائیں گے گھبرانے کے دورانے پر وحشت سکوت کے کوہ بگولے کی طرح
ناچتی ہوئی ڈیوڑھی کی جانب چلی مگر آج ڈیوڑھی کا دروازہ بھی اندر سے مقفل تھا وہ
صحن میں پلٹ آئی۔ حویلی میں بلا کا سناٹا تھا اور ماحول میں مہیب تاریکی۔ اس
کی نظریں اپنی خواب گاہ کی جانب گئیں۔ چٹخنی میں لالٹین ٹمٹما رہی تھی جو اس نے
ابھی ابھی گودام سے واپس آکر چادر لپیٹنے میں چھوڑ دی تھی۔ کوٹھری میں دھندلی
دھندلی روشنی پڑ رہی تھی۔ وہ کوٹھری اس وقت اسے کال کوٹھری دکھائی دی جو
تین سال سے برات کی ایک نئی رنگین روشنی کی امین تھی۔ جہاں تو جوانی ہر صبح
ایک نئی خیرگی لیے طلوع ہوتی تھی۔ اس کے ان تین سال کے شبستانِ عشرت میں
مستقبل کے سارے سنہرے دیپ ٹمٹماتے چکنا چور ہو گئے اور پوری زندگی کی عمر ڈھلی کٹ
کر گئیں۔ ابھی وہ کبھی نہیں کو اچھی طرح سمجھ گئی مگر حویلی تو ابھی اس کے لیے
عجیب حالات کی شکل میں تھی۔ وہ تھیلی جو ابھی تک اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی جس کے
اندر اس کے مستقبل کی ساری سنہری امیدیں بند تھیں۔ ہوجی روزانہ اصول کے مطابق
اپنے وظیفے کی جگہ کا جائزہ لیتی ہیں اس نے دل میں اسے دیکھا جیسے بغلیں جھانکنے لگی
بالآخر چاروں طرف لپٹی ہوئی تاریکی سے مشورہ کیا۔ ایک اطمینان کی سانس لی مٹی
بغل سے اتار کر نیچے رکھی اور پھر گودام کی جانب چلی۔ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کرتی

کا ایک مضبوط ٹکڑا لائی اور اس میں مٹکی کا منہ باندھا اور صحن میں کھڑے بوڑھے نیم کے تنے کے قریب کھڑے ہو کر چڑھ کر اوپر تک دیکھا۔ اس نیم کے درخت پر اُسے بچپن سے بندر کی طرح چڑھنے اُترنے کی مشق تھی۔ اُس نے دس بارہ سیر وزنی مٹکی رسی میں باندھ کر اپنے گلے میں لٹکائی جیسے پھولوں کا ہار پہن لیا اور پیٹ پر بچہ چپکائے بندریا کی طرح ایک سانس میں اُوپر دکھائی دی اور اُوپر نیم کی ایک موٹی شاخ سے رینگتی کھسکتی چھت کے اُوپر کو گئی نیچے اور ڈیوڑھی کے تلے خاموش کھڑے بے ٹھوا چوکیدار چھپت پر پہرا لگاتا ہی رہا۔ ما نبو جی خاموش لگائی بے چوپال میں بیٹھے کھانستے ہی رہے اور کنور جی کھنڈسال میں رس اور کھانڈ کے اُبال اُتار چڑھاؤ میں زیروزبر ہی رہے اور پھول وتی سماج کی بلند دیوار ایک جست میں پھاند گئی۔

چھت والے راستے کے تمام پیچ و خم اور نشیب و فراز تو پھول وتی کے شعور میں اُس کی آفرینش سے بھی پہلے کے موجود تھے۔ حویلی کی چھتیں بھی چھپر کی مگری، پھر روتی سنار کے کوٹھے کی چھت پھر چاردیواری کی منڈیر۔ منڈیر کے نیچے بابو سنار ہمہ تن انتظار بنے کھڑے تھے۔ پھول وتی نے منڈیر کے اوپر سے پہلے تو رسی پکڑ کر مٹکی نیچے لٹکائی اور بابو سنار نے ہاتھ میں لے کر نیچے رکھ دی۔ پھول وتی کی ساری طاقت بابو کو دیکھ کر سلب ہو گئی یا تو بارہ سیر وزن گلے میں ٹانگ کر نیم پر بندر کی طرح چڑھتی چلی گئی تھی اور شاخ سے چھپکلی کی طرح رینگتی لنگور کی طرح جست لگا کر پھاند پڑی تھی یا اس وقت پانچ فٹ اُونچی چاردیواری پر ہانپ ہانپ کر جھک سی گئی تھی۔ بابو نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اُتارنے کے لیے ہاتھ کیا بڑھائے گود پھیلا دی اور پھول وتی پرندے کی طرح لوٹ کر آغوش میں آ پڑی۔ بابو نے اُسے سنبھالتے ہوئے زیرِ لب کہا: ”ہانپ گئیں؟“

پھولی ہوئی سانس سے تھرتھراتی آواز میں پھول وتی نے سرگوشی میں کہا ”اوں ہوں اوں۔ اِس جنگلی بچے ٹھوا نے آج نیچے اور ڈیوڑھی میں تلے بھر دیئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ شبہ گزر گیا۔“

”چلو اچھا ہے صبح تک بے جوم پڑا رہے گا۔“ پھر جلدی سے کمبل بوجھا مٹکی بغل میں دبائی، دُنی ہاتھ میں لٹکائی اور آہستہ سے بڑبڑائے ”گاڑی تو چار بجے چھوٹتی ہے چار کوس ایک بیا ماہے۔“ اور چل پڑے۔ پھول وتی چادر سنبھالتی ساتھ ہولی۔

سردی کا شباب آدھی رات آسمان سے بوجھل ہو کر گر رہا تھا۔ زمین سے غلیظ ابخرات اُٹھ رہے تھے۔ فضائے بسیط میں سردوم تاریکیوں کے تودے کے تودے لوٹتے پھرتے تھے جیسے اندھیرے میں بیاودست ہاتھی کشتی لڑ رہے تھے۔ گاؤں کی گلیاں تاریک تھیں بھیانک تھیں۔ ذرا سے کھٹکے پر خیر کی طرح جھپٹ کر ٹانگ لینے والے کتوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چند منٹ میں وہ گاؤں سے باہر ہو گئے۔ جنگل کی روشن دستیں تاریکیوں میں گم تھیں۔ کسی کسی وقت دُور کہیں گیدڑ چونک پڑتے۔ باغ کے گھنے درختوں کے جھنڈ میں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُلو کے کڑکنے کی آواز سنائی دیتی اور پھر تاریک کائنات کا دم سا گھٹ جاتا۔ ہوا بھی ساکت تھی اگر حرکت کا احساس تھا تو کہرے اور ابخرات کے سیاہ تودوں کا جو دیکھے تو نہ جا سکتے تھے مگر سیاہی کے زیرو بم میں محسوس کیے جا سکتے تھے اور ان دونوں نے دُنیا کے ظلمات میں اپنا سفر جاری رکھا۔ ہیبت ناک اسود کا چار کوس موٹائی کا یخ بستہ پہاڑ، جس کا سینہ چیر کر اس پار پہنچنے کے بعد رنگین روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ آبادیاں ہی آبادیاں تھیں۔ نغمہ ہی نغمہ تھا اور اسے کاٹ کر اُدھر پہنچنے پر اُن کا عارضی عیش دائمی بن جاتا اور اس تاریک ترین رات کی صبح اُن کی زندگی کی روشن ترین سحر میں طلوع ہونے والی تھی۔ سلونی سلونی، گرم گرم، ابدی صبح۔

وہ اسٹیشن کے راستے پر پڑ لیے۔ بستی سے ایک فرلانگ بھر دُور نکلتے ہی بابو نے پھول وتی سے کہا: ”اچھا تم سیدھی رستے رستے چلو اور میں کھیتوں کی منڈیروں منڈیروں تمھاری سیدھ میں بڑھوں گا۔“

”کیوں؟“ پھول وتی نے جیسے ڈر کے احساس سے چونک کر کہا اور بابو کے کمبل کا دامن مضبوط پکڑ لیا۔

”کوئی پیچھا کرے تو میں تمھارے ساتھ نہ پکڑا جاؤں۔“

”تو بھا؟ پیچھا کون کرنے ٹھوا اور بہو جی تو دالان میں پڑے سوتے ہیں۔“

”ملے اس سے کیا۔ پھر بھی تو احتیاط کرنا ہے۔“

”اوں اوں، آں، رات بڑی اندھیری ہے۔ ڈر ڈر سا لاگت ہے۔“

”ڈر کاہے کا ہے۔ سیدھا رستہ لگا ہے اور میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ تم میری تھار پر تھار دیکھیو۔“

وہ چل پڑی۔ بابو راستے سے کٹ کر اس کے بائیں جانب اسٹیشن کی سمت کو کھیتوں کی منڈیر منڈیر پڑ لیا۔ بغل میں مٹکی دبائے سر سے پاؤں تک کالا کمبل لپیٹے گیہوں اور سرسوں کی فصل کے درمیان دس قدم چل کر آہستہ سے کھنکارتا ہوا۔ اس کی تھار پر تھارتی ہوئی پھول وتی ”تند قدم“ ڈالتی اندھیری کا دامن کاٹتی، بھیم کی سرد ہوا کے ہلکے ہلکے چلتے تیروں کے سامنے سینہ سپر بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔

●

ٹھوا جو کتا تو پہلے ہی سے تھا عیش کے نشے کے باوجود تھیتان عشرت میں اُس نے نیم کی شاخ سے دالان کی چھت پر گرنے کا دھما کا سن لیا۔ وہ بستر سے تڑپ کر جا پڑا اور بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا چوری ہو گئی۔ ”ہو ٹھوا“ سے کی جانب لپکا۔

بہو جی نے اُس کا دامن پکڑ لیا اور زیرِ لب کہا: ”ٹھیرو، وہ بے گا۔ ہوا آیا ہوئے گا۔“

”میں نے تو آج نیچے کے کواڑوں میں تالا بھر دیا ہے۔“

”کیوں؟ تو پھر آپ مونڈر مار کے لوٹ جائے گا۔“

”مگر مجھے تو ایسا سنائی دیا کہ کہیں اُوپر سے کوئی چھت پہ پھاند ٹھوا نے

گہری سوچ کے انداز میں کہا۔

بھوجی تو دے تمسخرانہ سنجیدگی سے بولی۔ "اوپر سے چھت پہ کون جاتا؟ اوپر کہاں سے کیا آسمان سے؟" اور پھر سنجیدگی کے ساتھ کہا: "ڈیوڑھی کی کنڈی تو بھیتر سے چڑھا آئے ہو؟"

"کنڈی! میں تو آج بھیتر سے ڈیوڑھی کی کنڈی میں تالا بھر آیا ہوں۔" پھر ایک گھونٹ سا لیا اور جیسے چونک کر دائیں بائیں دیکھا اور بولا: "اوپر میں جانے کے دیکھ لو آؤں کیسا کھٹکا تھا۔"

"بیٹے کوئی وہ بجو لونڈیا لونڈا کھیلت ہوں گے۔ سان سامت کرو۔ اور کوئی دن کی بات رہ گئی ہے۔ چھیل تیا اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ اور تمھیں آج سوجھی کیا ہے کہ ڈیوڑھی نیٹے دنوں میں تالا بھر آئے؟ سو وہ چھت پہ بولایا۔ بولایا پھرتا ہوئے گا اور یہ نیچے چھراتی ہوئے گی اور میں تو جے کہت ہوں کہ تمھیں تالا بھرن کی کیا ماری جات تھی؟"

"بات یہ ہے کہ میں آج آٹھ دس دن سے بار کو دیکھ رہا ہوں: بڑی جاگ دوڑ میں ہے پاؤں گاڑی کا پہیا تھمتا نہیں ہے۔ کل دوپہر لڑکی کو نہ معلوم کہاں پہنچانے آیا۔ کل سے گھر بالکل خالی ہے۔ یہ بالکل اکیلا ہے۔ نہ معلوم کس چکر میں ہے اور حویلی میں ہر رات کا آنا جانا ہے۔"

"تو پھر تمھیں کیا؟ اور پھر تم کہتے ہو کہ دونوں تالے بھرے ہیں تو آئے کدھر سے جائے گا اور نکل کدھر سے جائے گا۔ اور بابو کی بھاگ دوڑ سے تمھیں مطلب؟ اور وہ تو سارے سارے دن گاؤں گاؤں پھرتا رہتا ہے اور روز نیٹے دن سے حویلی میں آنے جانے کا کھٹکا نہیں سنتے ہو؟"

"نہیں جس دن سے پھول وتی کی منگنی پکی ہوئی ہے یہ روز شہر جاتا ہے نہ معلوم کس چکر میں ہے۔" یہ کہتے ہوئے مٹھوا کا اندر والا چوکیدار اچھل سا پڑا اور اس نے ایک ترنگ لگائی اور دالان کے دروازے کے قریب جا کر اور زنجیر کھولنے لگا۔

بھوجی کہتی ہی رہ گئیں "ٹھیرو ٹھیرو مٹھو شانت ہو۔ سنو تو۔ لونڈیا لونڈا کھیلت ہیں۔ آج تمھیں کیا ہو گیا۔ ایسی مت کرو۔"

مٹھوا دوسری ہی جست میں باہر والے دالان کی چوڑائی پھاند کر صحن میں کھڑا دکھائی دیا اور خصوصی چوکیدارانہ سنجیدگی سے نہایت سنگین قسم کی نظریں حویلی میں چاروں طرف پھینکیں۔ ساری حویلی اندھیرے میں غائب تھی البتہ پھول وتی کی خواب گاہ سے روشنی دکھائی دے رہی تھی اُدھر آہستہ سے بڑھا۔ کوٹھری میں لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ ایک کواڑ پورا بھڑا ہوا تھا، دوسرا نصف سے زیادہ درزوں سے روشنی نکل کر صحن تک آ رہی تھی۔ دو قدم دبے پاؤں اور بڑھے اور کان لگائے پھر کھسکا کھٹکا تھا۔ پھراچرا جا پتا سا کہیں بھوجی کا خیال صحیح ہو لونڈیا لونڈا کھیلت ہوں تو مفت میں انھیں تکلیف ہو اور مجھے تاؤ آئے اور پھر بڑی عمر کی بنائی بات بگڑ جائے بڑی احتیاط سے اس نے کوٹھری کے اندر جھانکا۔ لالٹین ٹمٹما رہی تھی اور کوٹھری خالی تھی۔ اندر گیا لالٹین اٹھا کر تیزی کی اور صحن سے گزرتا زینے تک پہنچا تالا بدستور تھا۔ پلٹ کر ڈیوڑھی کا تالا دیکھا اور صحن میں آ گیا اور ذرا گھبرائی ہوئی سی آواز میں کہا: "دیکھو مجھے دھماکے پہ کھٹک گئی تھی۔ پھول وتی چھت کو نیم پہ چڑھ کے پھاند گئی۔"

"میں تو کہتی ہوں کہ تم نے تالے کہیں بھر کے تھے۔ لونڈیا لونڈے کھیلتے سرت پہ چڑھتو اب چلے آؤ۔ زینے کا تالا کھول دیو۔ گھڑی دو گھڑی میں کود کے آئے جائے گی۔" بھوجی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

مگر تجربہ کار چوکنے چوکیدار نے گہری سانس لی اور لالٹین چاروں طرف گھما کر مشتبہ نگاہ سے حویلی کے در و دیوار کا جھپلتا جھپلتا جائزہ سا لیا اور نیم کی جڑ کے قریب ذرا سی مٹی اٹھائی اور چٹکی میں لے کر مسلی اور کوٹھار کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا: "تم حویلی پر تال لیبھو۔ وہ آئے تو جائے گی کوٹھار تو جا کے دیکھو یہ نئی کھدی مٹی کہاں سے بکھری ہے۔ یہاں نیم تلے؟"

بھوجی کا ماتھا تو مٹھوا کے کوٹھار کی جانب دیکھنے ہی پہ ٹھنک گیا تھا۔ کوٹھار کا نام سن کر تو وہ دیوانہ وار دوڑیں اور مٹھوا کے ہاتھ سے لالٹین جھپٹ کر سیدھی اندر پہنچیں۔ انھیں تو پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ ان کے دفینے کا کوتا پھول وتی بھانپ گئی ہے۔ وہ کئی دن سے جگہ بدلنے کی سوچ رہی تھیں اور تازہ کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر دیکھ کر ان کے سینے میں کبوتر پھڑپھڑا اٹھے۔ ہائے کر کے پچھاڑ کھائی اور دوسری ہائے کے ساتھ منہ سے چیختی ہوئی آواز نکلی "ڈھائی سیر پکا سونا۔ دو دھڑی چاندی۔" اور تیسری ہائے کے ساتھ اس سے زیادہ چیختی ہوئی آواز بلند ہوئی "لے گئی، لٹ گئی، لٹ گئی، سب لے گئی، ست پیڑھی کی کمائی گئی اجنتل کی......"

مٹھوا نے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور آہستہ سے چوڑالے انداز میں کہا۔ "شانت ہو۔ مجھے تو باہر جان دیو جاگ ہو جائے گی باہر کیا مجھے پکڑوانے دیو گی؟" مٹھوا کے کہنے پر بھوجی آپے میں آئیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور گڑھے کے قریب جا کر کھدی ہوئی مٹی پہ پھر پچھاڑ کھائی۔

پشتوں کا چوکیدار سا بھوجی کی ڈیوڑھی اور چوپال کا رات کا حوالدار مٹھوا اپنی فرض داری اور جواب دہی کے احساس سے تڑپ سا اٹھا۔ واردات کا سونے چاندی کی چوری والا پہلو تو بڑا نازک تھا۔ گرم معروف اگلے کا نہ نگلنے کا۔ کسی سے کہہ ہی سکتے ہیں نہ چھپا ہی سکتے ہیں کہ پر کا مال تو عزت سے زیادہ چھپاتی ہے۔ یہ تو چوری میں چوری ہو گئی۔ بھوجی کو وہیں چھوڑ کر باہر کا جھپٹ کر زینے کا تالا کھول کر پھینک دیا اور کواڑ کھول کر چوپٹ کر دیے۔ پھر نہایت پھرتی کے ساتھ ڈیوڑھی کا قفل کھول کر باہر آ گیا اور چبوترے پہ کھڑے ہو کر خطرے کے سگنل والی آواز میں ٹھکارا۔ چوپال کے اندر سے بوڑھے ساجو جی نے ٹھکار پہ ٹھکار دی اور مٹھوا اپنے آقا کی خواب گاہ میں جھپٹ گیا۔ اس جواب دہی کے لیے خود کو پیش کرنے کہ "لوٹی گئی نقدی گئی اور تو زندہ رہ گیا نمک حرام؟"



مٹھوا نے سائیں جی کے پلنگ کے قریب کھڑے ہو کر دو ہی لفظوں میں گل
اور شادی کر پھول وتی بھاگ گئی۔ نقدی والی بات دبا گیا کیونکہ وہ تو چوری در
چوری والی قسم کی چیز تھی اور ویسے تو بھی کا اپنا علیحدہ کا تھا۔
ٹھاکر مکانی بیچارے لحاف سے اچھل کر جا پڑے اور کس وقت اور کتنی دیر بعد چوپال کی چوڑی سیڑھیاں اُتر گئے اور انھیں پتہ بھی نہ چلا۔ آگے آگے لپکتے اور موٹے کی درمیانی چال چلتے ہوئے، پیچھے مٹھوا لڑکھڑاتا چلتا ہوا ایک آن میں کھنڈ سال پہنچ گئے اور سیدھے بیٹے کی کوٹھری میں جا کھڑے ہوئے۔ کنور جی گرم گرم خلوت میں تھے اور اس برزخ میں آج پچاس سال کی عمر ہونے کو آئی۔ باپ کا سامنا نہ ہوا تھا، چوپچکا سے رو گئے مگر مجبوری تھی کوٹھری میں دروازہ تو درکنار کوئی روشن دان کھڑکی بھی نہ تھی۔ مجبوراً لحاف سے نکل کر اُٹھی سیدھی ساڑھی سر سے پاؤں تک لپیٹ لپاٹ کر جلدی کو بھی منہ ڈھکے اسی دروازے سے باہر جانا پڑا جس کے بیچوں بیچ سائیں جی کھڑے تھے اور ذرا پیچھے کو مٹھوا بھنگی لالٹین اور لاٹھی لیے تعینات تھا لیکن شاید اس وقت سائیں جی کو دکھائی بھی نہ دیا اور اگر دکھائی دیا تو غالباً وہ یہ سمجھ سکے کہ یہ سفید سفید بھورا بھورا سایہ سر سے پاؤں تک گٹھڑی بنے کیا برابر سے نکلا چلا گیا اور نہ چوڑیوں کی چھن چھن ہی اُن کے کان میں گئی۔

سب رُوداد چپکے چپکے باپ نے بیٹے سے بیان کی اور مٹھوا بھنگی نے اپنا ذاتی شبہ بابو پر ظاہر کیا اور اسٹیشن کے راستے کی جانب خصوصی توجہ دلائی۔ کنور جی نے کھنڈ سال کے سب نوکر چاکر جگا لیے۔ کل پندرہ آدمی تھے۔ گاؤں سے چاروں طرف چار راستے جاتے تھے۔ پانچ پانچ آدمی تین راستوں پر خاموشی کے ساتھ پکڑ کر واپس لے آنے کی ہدایت دے کر دوڑا دیے اور اسٹیشن والے راستے پر جس پر ملنے کا زیادہ امکان تھا صرف مٹھوا کو ساتھ لے کر خود دوڑے۔

لڑکی کی چال خواہ کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو لڑکی ہی کی چال تو ہوتی ہے آدھے راستے جا لیا اور اندھیرے کے سہارے نہایت خاموشی کے ساتھ حویلی میں لے کر آگئے اور پھر دھکو کی تھوڑی بہت پائے تو بھی آواز سن کر چلے تو بابو وہیں سرسوں کے کھیت میں دو سو گز کے فاصلے پر برابر دبک گئے اور پھر جو بستی کی جانب دبکی اُٹھے تو کنور جی اور مٹھوا کے پہنچنے سے قبل اپنے گھر میں پہنچ گئے اور کپڑے بدل کر پلنگ میں دبک گئے۔ بات بڑی سی اُلجھی بن گئی۔ اب تک تو مٹھوا، بیوی جی اور پھول وتی کے درمیان خانگی شے سمجھو تا چلا آ رہا تھا۔ آج کنور جی بھی اس میں شریک ہو گئے۔ مٹھوا اور کنور جی راستے سے حویلی تک پھول وتی کو اتنی خاموشی سے لائے تھے کہ کسی کے کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ پھول وتی کو حویلی میں پہنچا کر دونوں نے سب کے سامنے خوب تبیج اُڑائے اور کھنڈ سال کے سب نوکروں پر تاکید کر بوڑھے سائیں جی تک یہ پیغام گیا کہ پھول وتی حویلی میں نکلی وہ کپاس کے گودام میں ڈھیر پر سو کر رہ گئی تھی۔ بیوی جی گودھولی کا ہو گیا۔ حویلی کی ہر کونی جگہ تلاش کرنے کے بعد انھوں نے شور مچا دیا اور جب کسی راستے پر نہ ملی تو کپاس کے گودام میں دیکھا سوتی ہوئی ملی۔

سب کو مطمئن کر کے رات کے آخری حصے میں حویلی میں پھر گئے کیونکہ

بیٹی کو نہمائش کرنی ضروری تھی مگر انھوں نے پھول وتی کو آڑے دے منہ پڑا پایا لیکن بیوی جی کو انتہا سے زیادہ بے تاب دیکھا یہاں تک کہ انھیں ایک مرتبہ بیوی کو سکون کی ہدایت کرنی پڑی اور یہ سمجھانا پڑا کہ لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے بدنامی کا اندیشہ ہے اور لگی لگائی شادی اُکھڑ جانے کا ڈر ہے۔ غرض تھوڑا بہت بیوی کو خاموش کر کے بیٹی کی جانب متوجہ ہوئے نہایت تلخ انداز اور پست آواز میں سمجھاتے رہے اور سمجھاتے سمجھاتے یہاں تک سمجھایا کہ اپنا اور بابو سنار کا رشتہ بھی سمجھا گئے بابو سنار اس کا بھائی اُس کے باپ کی جوانی کی لغزشوں کی زندہ تشکیل ہے سمجھ کر تو پھول وتی اچھل پڑی جیسے کوئی مضبوط اور تنی ہوئی رسی ایک دم قینچی کے چلتے ہوئے پھلوں کے درمیان آ جائے وہ نیم بیہوش ہو کر ادھر اُدھر جا پڑی۔ ماضی، حال، مستقبل کے سب بنتے کھیل کھلاتے راستے منقطع ہو کر خفت، رنج اور خشونت میں تبدیل ہو گئے۔

صبح ماں بیٹی میں بیٹی واپس لانے کے مسئلے پر تبادلۂ خیال ہوا مگر رات کے جدید ترین انکشاف نے صبح تک غور کرتے کرتے اُسے مفلوج سا کر دیا تھا بابو سنار اُس کا بھائی۔ اُف ماضی تجھ پر تف۔ اے حال تجھ پر خاک اور اے مستقبل تجھ پر موت۔ ماں بڑی بے چین تھی اور ترکیب کتنی سیدھی سادی بتائی تھی کہ جس راستے نکل لے گئی ہے اسی راستے آج لے کر پلٹ آ۔ ماں کے زیادہ اصرار پر بیٹی سے نہ رہا گیا اور بڑے بے باکی کے انداز میں بولی: "ماں جی! دیکھو تو بابا جی بابو کو میرا بھائی بتاتے ہیں اور تم مجھ سے کہتی ہو کہ آج رات اس کے پاس جاؤں؟"

—ایسی تیسی اس بابو کی جو تیرا بھائی بنے جب مٹھوا بھنگی یہاں تھا تو بابو جی

بھائی کون سے رشتے سے بن گیا۔ مٹھوا کنورجی کے بیٹے بیٹیاں تو ایک بابو چھوڑ گھر گھر ساری بستی میں کھیلتے پھرتے ہیں مٹھوا بیچارے کو تو ساری عمر رات بھر ڈیوڑھی سے لے کر بھیت تک پہرے پر گزر گئی ہے" ماں نے بیٹی پر انکشاف کیا اور اب کی مرتبہ پھول وتی بڑے زور سے اچھل پڑی اور ماں کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔ ماں نے ایک گھونٹ سا لے کر سلسلۂ کلام جاری کیا" اور وہ جو کہلاتے ہیں تیرے پتا جی بڑے حساب کے کچے بنے پھرتے ہیں انھیں کچھ اپنا تا نا بانا معلوم ہے اور انھوں نے تیرے بھائے کو یہ بات کہہ دی۔ کیا وہ نہیں پہچانتے ہیں مٹھوا چوکیدار کو" ماں نے پھر ٹھنڈی گہری ٹھنڈی سانس بھر کر لی" ہائے میری بیٹی! میری عمر بھر کی جمع جوڑ یا ڈھائی سیر کا سونا دس سیر چاندی آہ۔ ہائے بس اب تو تیرے ہاتھ ہے اور اگر میں کنورجی کو بتا دوں گی تو وہ گھڑی کے چھٹے اس میں یا ہے گردن پکڑ دھرائیں گے پھر میرے ہاتھ کچھ تھوڑی آجائے گا۔ بس آج کی رات اور۔ وہ تیرا سبھی باپ ہو" بے تاب ہوگئیں مگر پھول وتی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جس دودھ میں مکھی پڑ جانے کا شبہ ہو گیا اُسے اب کوئی کیسے پی لے۔ لاکھ اس کی ماں یقین دلائے۔ جہاں دیدہ محرم راز ماں نے ڈری ڈری بھری بھری نظروں سے بیٹی کا بستر و بچھا پایا اور لوری دیتے ہوئے انداز میں کہا" اور میں تو اپنی بیٹی کا بیاہ اس شرط پر کروں گی کہ گھر جمائی بنے وہ تو بڑا سیدھا رہتا ہے بالکل گزار جا ہیں جیسے رکھوالے تو یہ تیرا اور بابو کا لڑکپن تھا۔ یہ بیل منڈھے نہ چڑھتی یہ شہر تو شہر آسمان پر بھی تم دونوں چلے جاتے تو تیرا باپ دادا چین سے نہ بیٹھنے دیتا۔ جیسے میں بتاتی ہوں ایسے تو بابو بھی اپنی جنم بھوم پر بناٹے گا اور میری بیٹی میری آنکھوں کے سامنے جیسے کھیلتی چلی آرہی ہے کھیلتی رہے گی" مگر یہ سب کچھ پھول وتی کو بے معنی معلوم ہوا۔

تمام دن بھاگے گزرا اور پہر رات جا چکی تھی۔ مٹھوا چوکیدار پہرے پر ٹھہرا۔ پھول وتی کے کان اس مٹھارے زندگی کے بڑھتے میں آشنا سے تھے اور آج قبول اس کی ماں کے اس آواز میں ماضی کی شکست حال کی گرفت اور مستقبل کی اُمیدوں کا عجب مثبت منفی امتزاج سنائی دیا جیسے اس کی ماں کے قول پر ہر پہلو سے مٹھوا کی بھرپور آواز مہرِ ضمانت ثبت کر رہی تھی رات بھر اندر سے کہ باہر تک اور باہر سے اندر تک مٹھوا اور بھوجی ہی کی تو فرماں روائی رہتی تھی مگر اس کے باپ کے انکشاف کے آگے یہ سب ضمانت اور وعدے بے معنی تھے اس کی ماں نے سونے چاندی جیسی چمک چھوڑتی آنکھوں سے اس کے بستر پر غور کیا اور پھر منتر ا بدلا" اور میری بیٹی یہ ڈھائی سیر سونا اور دس سیر چاندی کیا میں اپنے سینے پر دھر کے چتا میں لے جاؤں گی۔ یہ سب کچھ تیرا ہی مال تو ہے اور بس آج کی رات ہے اگر تو نہیں گئی تو وہ لے کر چل دے گا اور پھر کبھی گاؤں میں منہ بھی نہ دکھائے گا"۔

آخری جملے پر پھول وتی کے دماغ میں جیسے اُجالا ہو گیا۔ دس سیر چاندی اور ڈھائی سیر سونے کی پوٹ اس کے اپنے کو چے کی بجی تو بابو کی تحویل میں ہے اور بابو تو یوں گیا اور یہ یوں جائے گا اس نے لڑکھڑاتی زبان سے پھر بے لگائے مڑتے انداز میں جواب دیا" تو ماتا جی! اب میں کیسے جاؤں بابو کے پاس۔

پتا جی تو لے بھائی بتاتے ہیں:

" ایسی تیسی تیرے پتا جی کی۔ پہلے آپ کو تیرے پتا جی تو بتائیں اس تو میں بتا چکی تجھے۔ وہ کیا جانیں یہ تو میں جانتی ہوں کون کس کا پتا جی ہے۔ کنورجی چاہے سارے گاؤں کے پتا جی ہو جائیں پر تیرے پتا جی نہیں ہو سکتے۔ جب کنورجی بابو جیا جن کے پتا جی ہو سکتے ہیں تو پھول وتی مٹھوا کی بیٹی کیوں نہیں ہو سکتی"۔

مگر پھول وتی ٹس سے مس نہ ہوئی اور سہمتی ہوئی بولی۔ " نا ہیں ماتا جی اب میں رات میں نہیں۔ اوں ہوں۔ ہوں ں نا ہیں"۔

" تو پھر بن جنگل کی جنی! ساری عمر کی جمع جوڑ یا بندی بھی گئی اور میری تو گئی ہی ہے۔ بھوئی پو تیری کا ٹھر میں بھی نہیں رہی" بھوجی نے غصے میں لال تال ہو کر کہا اور پھر بستر و بچھا پایا اور نرم لہجے میں کہا" آج کی رات اور دست برز سیتا ستی۔ کل کی رات تک نہ وہ تیرا کوئی اور نہ تو اس کی سگی ہوتی۔ آج کی رات اور نہ سہی بھائی بہن۔ اپنا مال نکال لاؤ اور کل سے چاہے بھائی بنیو یا باپ" بھوجی نے تاجرانہ تیور دل سے پھول وتی کو دیکھا۔ بات تو نہایت دکان دارانہ قسم کی تھی۔ آج کی رات اور سہی اب اُسے اپنا ڈھائی سیر سونا اور دس سیر چاندی یاد آئی۔ کبھی کبھی وہ چیز بھی روا کے طور پر نگلنا پڑتی ہے جس سے متلی ہوتی ہے ماں کی بتیاں دیکھ کر وہ اپنے سونے چاندی کی محبت میں بے تاب ہو گئی۔

سا بوجی کے مال میں تو مقناطیس کی کشش تھی۔ خوب سوچ سمجھ کر پھول وتی تیزی کے ساتھ زینے پر چڑھ گئی اور بھوجی کے ڈھائی سیر سونے اور دس سیر چاندی نے پھول وتی کے ڈھائی سیر سونے اور دس سیر چاندی کو بھی کھینچ لیا۔ سونے چاندی نے تو سا بوجی کے گھر میں آنے کے نہ معلوم کتنے سیدھے راستے دیکھے تھے اتنے کہ شاید سا بوجی کے اپنے علم میں بھی نہ تھے اور کل کی رات کا غم سے بھاند کر گیا ہوا سونا چاندی بابو سنا کے پاس سے پھول وتی کے اس سونے چاندی کو بھی کھینچ لایا جو مدتوں سے اس کے پاس امانت تھا اور نہایت سلامت روی کی چال زینے کی سیڑھیاں سیڑھیاں آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے اُترتا ہوا آ گیا۔

صبح صادق کے سینے میں جب آسمان سے چاندی کے آبشار پھوٹ رہے تھے اور مشرقی اُفق میں سنہری جھنڈیاں دکھا رہی تھیں۔ پھول وتی تمام رات کے تپائے ہوئے سونے کے مانند سچ کندنی دمکتی زینے سے برآمد ہوئی اور فتح مندانہ انداز میں ماں کی مٹھی جوں کی توں ہاتھ میں دے دی اور ساری رات کی منتظر ممتا کی ماری ماں نے پیار بھری نظروں سے بٹیا کے اندر جھانکتے ہوئے نرم نرم ہاتھوں سے بیٹی کی بلائیں لے لیں۔

پھول وتی اپنی پوٹلی بغل میں دبائے تیزی کے ساتھ اپنی کوٹھری کی طرف لپک گئی۔

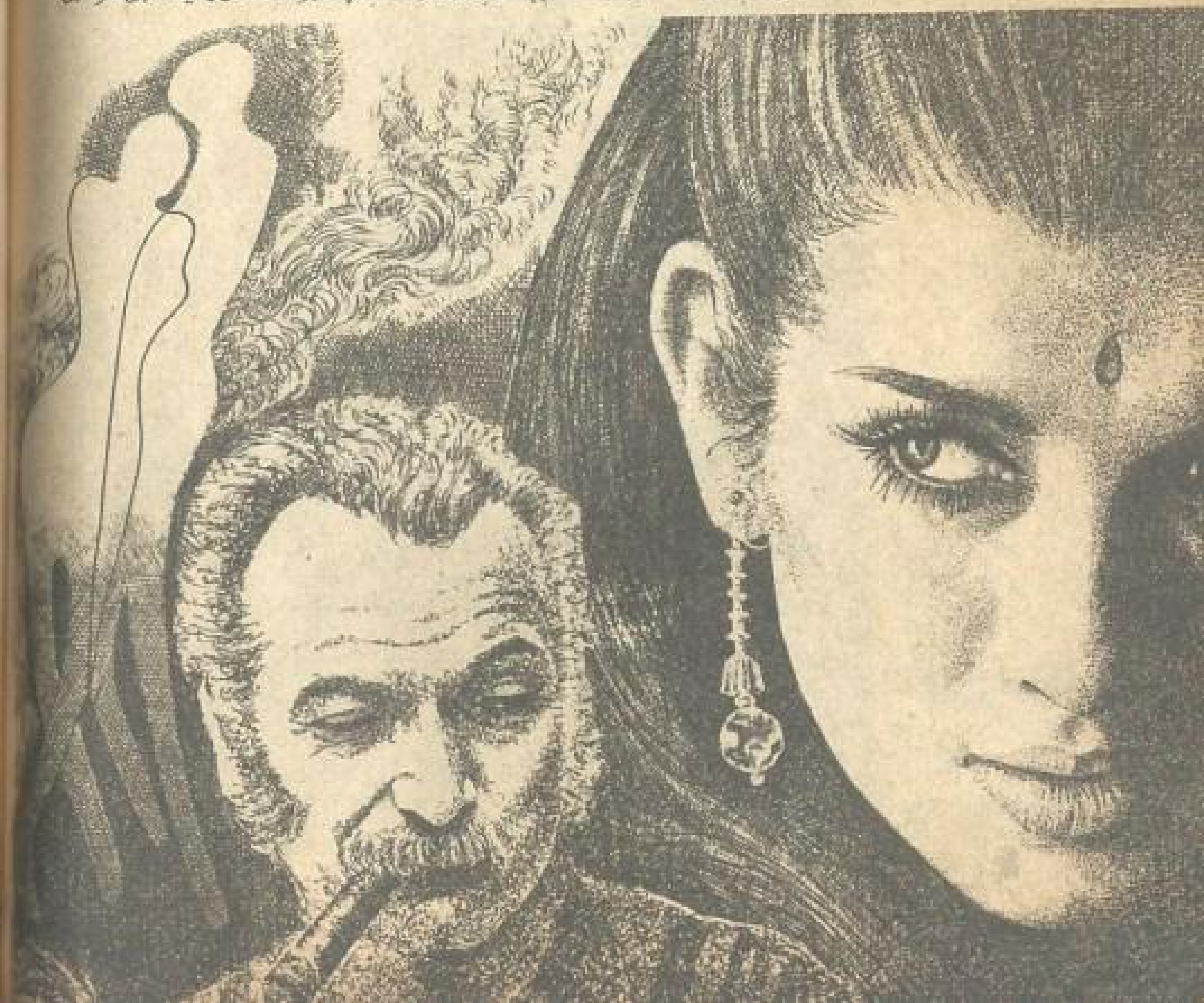


جو کچھ میر جمشید عالم پر گزری اگر وہ آپ پر گزرتی؟

سب رنگ کے پُراسرار سلسلے موضوع، دل کشی اور تاثر کے اعتبار سے سب سے منفرد ہوتے ہیں

میر جمشید عالم کی آپ بیتی

ایک رات مجھ پر عجیب جنونی کیفیت طاری ہوئی۔ اکثر مجھے جاگتے میں عجیب عجیب مشاہدات ہوتے تھے۔ میں گھر میں اپنے مشاہدات کا ذکر کرتا تو انھیں ایک دیوانے کا خواب سمجھ کے نظرانداز کر دیا جاتا۔ پھر اچانک میرے خواب حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ پہلے چچا میرے بھیانک خواب کی نذر ہوئے پھر دادی چل بسیں۔ اس دفعہ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کا تعلق میری پھوپھی زاد بہن یاسمن سے تھا۔ یاسمن کی منگنی ارشد نامی ایک نوجوان سے ہوئی تھی۔ میں نے اس منگنی کی پُرزور مخالفت کی لیکن میں اُن کا کون ہوتا تھا۔ میری کون سنتا۔ چنانچہ میں نے دل برداشتہ ہو کے گھر چھوڑ دیا اور [illegible] آ گیا۔ وہاں مجھے ملازمت کی تلاش تھی۔ ملازمت تو نہیں ملی البتہ [illegible] نام کا ایک شخص مل گیا جو ایک [illegible] تھا۔ وہ دنیا کو ٹھوکر پر [illegible] تھا۔ مجھے اس نے [illegible] میں رکھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے اور ایک ساتھ محنت مزدوری کرنے لگے۔ [illegible] مجھے ایک نئی دنیا دیکھنے کا موقع ملا۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]



[illegible]



[illegible]

[illegible] استانے کی غرض سے وُنیش کے ملاقاتی کمرے میں آ بیٹھا لیکن وُنیش مجھے پکڑ کے موسیقی کی محفل میں لے گیا [illegible]
شباب کی سرحدوں کو چھونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی مجھ پر بہت مہربان تھی [illegible] اس رات بھی [illegible]

مایوسی نے خوب صورتی سے اُسے نکال دیا اور سستانے کی غرض سے ایک اندھیرے مقام پر جا پہنچا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہاں [illegible] [illegible]

[illegible]

میں سوچتا ہوں کہ اُس رات کہاں تھا جو یہ تمام رات میرے ساتھ تھا [illegible]؟

"اُس رات میں اس کے ساتھ تھی۔" ریتا نے چیخ کر کہا۔ "سُن رہے ہو ڈیڈ؟" اُس نے اپنا بھیگا ہوا سرخ چہرہ میرے گالوں سے مَس کر دیا اور اس کے گرم آنسو میرے منہ میں جا گرے۔ "تم نے اس کا یہ کیا حال کر دیا؟" وہ سسک کے بولی اور وحشت میں میرے سینے سے اپنا سر ٹکرانے لگی۔

دنیش میرے قریب آ کے ٹھٹک گیا تھا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ ادھڑا ہوا دریدہ شکستہ آدمی موہن داس تو نہیں ہو سکتا۔ مگر لمحوں میں اُسے یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی۔ وہ مجھ پر جھپٹ پڑا اور اپنے بے داغ سفید لباس کی پروا کیے بغیر اُس نے مجھے ریتا سے چھین کر اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اٹھا کر کھینچتا ہوا کرنل کے مقابل رکھی ہوئی آرام کرسی تک لے آیا۔ اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور اس نے مجھے پوری طاقت سے جکڑ رکھا تھا کہ کہیں میں اُس کے ہاتھ سے نکل نہ جاؤں۔ مضطرب ریتا نے سہارا دے کے مجھے کرسی پر بٹھایا اور رومال سے میرا چہرہ صاف کرنے لگی۔ پھر وہ الماری کی طرف دوڑی اور اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بوتل میرے منہ میں لگا دی۔ برانڈی کا ایک گھونٹ چاقو کی طرح سینہ کاٹتا ہوا اندر اُتر گیا۔ جسم میں آگ لگ گئی۔ ریتا نے دوسرے گھونٹ کے لیے بوتل میرے منہ سے لگائی تو مجھے اس کی عجلت میں پھندا لگ گیا۔ دنیش نے میری پھٹی ہوئی قمیص چیر کر اتار دی۔ خون آلود بنیان بھی اس نے میرے جسم سے نوچ لی۔ ریتا بھاگ کر دوسرے کمرے سے بنیان اور گاؤن لے آئی اور بھیگی ہوئی تولیا سے میرے جسم کی گرد اور خون صاف کرنے لگی۔ نیلوں اور زخموں پر تولیا کی رگڑ سے میری کراہیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ ان دونوں نے کرسی پر ہی مجھے گاؤن پہنا دیا۔ وہ بار بار کرنل کی طرف دیکھ کے سسکتی تھی۔

کرنل اپنی نشست پر غیر متحرک بیٹھا تھا۔ صرف اس کی پتلیاں حرکت کرتی تھیں یا ماتھے پر شکنیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ برانڈی کے دو گھونٹوں نے تیزی سے اثر کیا تھا۔ میرے اعصاب سنسنانے لگے اور تکلیف میں کسی قدر کمی ہو گئی۔ "موہن!" دنیش نے میرا گال تھپکتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے جواب دینے کے لیے بمشکل تمام اپنے لب کھولے تو وہ بے تاب ہو کے مجھ سے لپٹ گیا۔ ریتا میری ہتھیلیاں سہلا رہی تھی اور بار بار انھیں چوم لیتی تھی۔ "اسے آرام کی ضرورت ہے۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ "راج کمار دنیش! تم اسے میرے کمرے میں لے چلو، میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔"

"نہیں، میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" دنیش نے میرے بال درست کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے اب کرنل کو اسے میرے سپرد کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں راج کمار دنیش!" ریتا نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "کاش میرے اختیار میں کچھ ہوتا۔ کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا تو اسے بچاتی۔ لے آئے ہیں اور یہ مجھ سے اس قدر قریب ہے۔ ڈیڈی نے مجھے اس کے بارے میں ایک بات بھی نہیں بتائی۔ تمھاری طرح میں بھی اندھیرے میں رہی ورنہ میں چھاؤنی میں جا کے چیخ چیخ کے اعلان کرتی کہ اس رات موہن میرے پاس تھا، میرے ساتھ تھا۔"

"ریتا!" دنیش نے اس کے دونوں شانے پکڑ لیے۔ "موہن تمھارے لیے جو کچھ تھا وہ کتنا سچ تھا، میں تمھارا بے حد ممنون ہوں، بے حد۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو راج کمار!" وہ آنسوؤں سے بھرائی آواز میں بولی۔ "تم مجھ سے اس اجنبیت کا اظہار کیوں کر رہے ہو؟ معلوم ہوتا ہے تمھیں موہن نے کچھ نہیں بتلایا۔"

"میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں۔" دنیش نے بے قراری سے کہا۔

"آہ راج کمار!" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کے پھوٹ پڑی۔ "میں ہندوستان شاید صرف موہن کو دریافت کرنے آئی تھی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اپنے گھر میں موہن کو اس حالت میں دیکھوں گی اور مجھے اس کے سامنے اس قدر ذلیل ہونا پڑے گا۔"

دنیش نے اسے اپنے سینے میں جذب کر لیا۔ ریتا نے اسے بھی پگھلا دیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح منہ بسورنے لگا۔ گرم گاؤن، آرام کرسی اور برانڈی سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کس عالم میں ایک سرد آہ میرے منہ سے نکلی تو وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو کے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ "کیسے ہو موہن؟" دنیش نے میرا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔ میں نے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھا۔ میرے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ چھا گئی۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں تھا موہن! میں تین دن سے تمھیں ادھر اُدھر تلاش کر رہا تھا۔ آج صبح سادھو دیال ناتھ نے مجھے بتایا کہ تمھیں چھاؤنی لے آئے ہیں۔ کرنل مجھ سے ملنے میں گریز کر رہا تھا۔ میں خود ہی یہاں چلا آیا۔" وہ تیزی سے بولا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میرا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ میرے گال تھپتھپانے لگا۔ "از راہِ کرم ریتا!" دنیش نے بے تابی سے کہا۔ "تم کرنل سے ایک رسمی اجازت لے لو کہ میں موہن کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اسے جلد از جلد علاج کی ضرورت ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں اب اس کی ضرورت نہیں۔ تم موہن کو لے جا سکتے ہو۔ میں ڈیڈی کو بھگت لوں گی لیکن..." وہ جھجک کے بولی۔ "کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ موہن چند دن یہیں رہے۔ میں بہت ناآسودہ رہوں گی۔"

"مجھے اندازہ ہے لیکن یہ وہاں زیادہ سکون محسوس کرے گا۔" دنیش نے سوگوار شائستگی سے کہا۔ "میں تمھیں اس کے حال سے مطلع کرتا رہوں گا۔ شہر کے حالات خراب ہیں۔ تمھارا پرکاش بھون میں فی الحال آنا ممکن نہیں ہوگا۔ تم اطمینان رکھو، میں تمھاری طرف سے موہن کی نگرانی کرتا رہوں گا۔"

"اور اگر میں تمھارے ساتھ چلوں؟"

"بسر و چشم، مگر یہ کوئی مناسب اقدام نہیں ہوگا۔"

"ہاں" وہ مایوسی سے بولی: "تمہارا خیال صحیح ہے۔"

"کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موہن کی روانگی سے کرنل کو مطلع کر دیا جائے۔" دنیش نے تذبذب سے کہا۔

"بہتر ہوگا کہ ہم اس رسمی اجازت سے گریز کریں۔" "مجھ میں ڈیڈی کا انکار سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں اس وقت ان کے پاس جانا نہیں چاہتی۔"

"لیکن ہم اسے درگزر بھی نہیں کر سکتے۔ تم موجودہ حالات کی سنگینی اور شدت کا اندازہ کرو۔ ہم ہندوستانیوں کو ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ کرنل اب اپنے تعلقِ خاطر کی وضع داری نبھانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ یقیناً اسے کہیں جواب دینا اور اپنا دامن بچانا ہے۔"

"مگر اس نے ایک غلط آدمی کو پکڑا ہے۔" ریتا نے بپھر کے کہا۔

"مگر وہ اس علاقے کا حاکم ہے اور اپنی زمینوں پر ہم مختار نہیں ہیں۔ موہن لال تمہارے سامنے موجود ہے۔"

"فرض کرو اس نے انکار کر دیا تو کیا تم اپنے دوست کو یہیں اس جہنم میں چھوڑ جاؤ گے؟" ریتا تلخی سے بولی۔ "کیا یہ عمل قرینِ مصلحت ہوگا؟"

"اس کے بعد ہم کسی اور صورت پر غور کریں گے۔" دنیش نے تحکم اور معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ "موہن کے آنے سے پہلے میں کرنل سے انھی صورتوں پر بات کر رہا تھا۔"

"اور اس وقت تک موہن ....." وہ کہتے کہتے بلک پڑی۔ "تم اسے فی الفور یہاں سے لے جاؤ راج کمار! میں کرنل ہارڈنگ سے بات کر لوں گی۔"

دنیش نے چند لمحوں تک توقف کیا۔ پہلے ریتا کی پھر میری جانب دیکھا۔ آتش دان کے اوپر ملکۂ برطانیہ وکٹوریہ کی قدِ آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ کچھ فیصلہ کر کے اس نے گردن جھٹکی اور مجھے کرسی سے اٹھایا۔ ریتا نے گھنٹی بجائی تو ایک باوردی ملازم چشم زدن میں حاضر ہوا اور کورنش بجا لایا۔ اسے دنیش کی گاڑی عقبی حصے میں لانے کا حکم صادر کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور میرے کندھے سے سر ٹکا کے بولی۔ "میں تمہاری طرف سے اچھی خبر کی منتظر رہوں گی۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ سب حالات عارضی ہیں۔ تم جلد ہی اچھے ہو جاؤ گے اور ریاست سے یہ گھٹائیں چھٹ جائیں گی۔ پھر بہت کچھ ہوگا۔ ہم پروگرام کے مطابق ریاست کے جنگلوں میں چلیں گے اور شکار کھیلیں گے اور راج کمار دنیش کے ساتھ سارے ہندوستان کا دورہ کریں گے۔" وہ مجھے مختلف کمروں سے گزارتی ہوئی کوٹھی کے عقبی حصے میں لے آئی جہاں دنیش کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس کے ڈرائیور اور سنتری نے دروازہ کھولا اور مجھے پچھلی نشست پر ڈھیر کر دیا گیا۔ ریتا نے میری گردن کے نیچے دو موٹے تکیے رکھ دیے تھے۔ سنتری کو واپس جانے کا اشارہ کر کے اس نے میرے لبوں کا ایک بوسہ لیا۔ میرے گالوں سے اپنے رخسار مسلے اور دروازہ بند کر دیا۔

دنیش کا ڈرائیور کن انکھیوں سے یہ منظر دیکھ رہا ہوگا۔ دنیش اگلی نشست پر اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چھاؤنی کے صدر دروازے پر گاڑی کوئی ایک دو منٹ کے لیے ٹھہری ہوگی مگر گیٹ عبور کرنے کے بعد پھر ٹھہر گئی۔ باہر اچانک شور مچنے لگا۔ بجتے ڈھول،

[illegible] باہر اتر گیا۔ پنڈتوں اور سادھوؤں نے گاڑی ہر طرف سے گھیر لی تھی۔ ان کی تعداد پندرہ سولہ سے کم نہیں ہوگی۔ سب سے پہلے مجھے پنڈت اشوری لال کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھول کے میرے پیر چھوئے اور زور زور سے اپنا کرچا بجایا۔ "مہاراج مہاراج!" اس نے تمتمائے ہوئے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ "دھنیہ ہو مہاراج۔"

ادھر سرہانے کی کھڑکی سے ایک نرم اور ناتواں ہاتھ میرے ماتھے پر دراز ہوا۔ "بالک!" سادھو دیوراج کی شفیق آواز پہچاننے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ وہ بڑبڑا رہا تھا "میں نے کہا تھا دیر کر رہا ہے، دیری سے کام بگڑ جائے گا۔"

دوسرے سادھو اور پنڈت اچک اچک کے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے دنیش کو گھیر رکھا تھا۔ دنیش ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ انھوں نے میری آزادی کے لیے چھاؤنی کے دروازے پر احتجاج کیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ میرے ساتھ سادھوؤں کا یہ التفات اس کی سمجھ میں یقیناً نہیں آیا ہوگا۔ خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب بے تاب تھے۔ پنڈت اشوک پرجوش تھے۔ پھر کسی سادھو نے اپنا خاک آلود ہاتھ میرے چہرے پر مل دیا۔ کسی نے میرے پیر کا انگوٹھا چوما اور کسی نے دستک دینے کے انداز میں اسے چھو کے کہا "ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں مہاراج!"

پنڈت اشوری لال کی پرجوش آواز ابھری: "ہم آ رہے ہیں مہاراج!"

سادھو دیوراج کی آواز پر وہ سب گاڑی سے دور ہٹ گئے۔ دنیش انھیں پرنام کرتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے سراسیمہ ہو کے ایک بار میری طرف دیکھا۔ گھبراہٹ میں اسے شاید خیال نہیں رہا، اس کے پاؤں گڑبڑا گئے ہوں گے۔ گاڑی نے زور کا ایک دھچکا کھایا۔ دنیش نے ناگواری سے اسے احتیاط کی تلقین کی۔ جلد ہی چھاؤنی اور شہر کے درمیان پیچیدہ پہاڑی راستوں کا سفر شروع ہو گیا۔ موڑ پر موڑ آنے لگے۔ بریک چیختے اور پہیے کلبلاتے رہے۔ گیٹ پر سادھوؤں کی تعداد دیکھ کے میرا خوابیدہ ذہن جاگنے لگا تھا۔ مجھے بے چین دیکھ کے دنیش نے میرے ہاتھ تھام لیے اور انھیں دبانا شروع کر دیا۔ اس کی نگاہ میں ہزاروں سوال تھے، ہزاروں شکوے، ہزاروں حسرتیں۔ شہر کی حدود میں آ کے وہ اپنی نشست پر سیدھا بیٹھ گیا۔ گاڑی کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ راستے میں کہیں کہیں کوئی فوجی ٹرک نظر آتے جن پر مسلح گورے سوار تھے۔ میں لیٹے لیٹے شہر کی عمارتوں کی برجیاں اور محرابیں دیکھ رہا تھا۔

پرکاش بھون میں عام دربانوں کے بجائے پولیس کے جوانوں نے دروازہ کھولا۔ وہاں بھی جبر کا عالم طاری تھا۔ کوئی آواز، کوئی چہکار نہیں تھی۔ جیسے ہی گاڑی رکی دنیش نے ڈرائیور سے کچھ کہا۔ اس نے پھرتی سے دروازہ کھولا۔ اس عرصے میں راہداری پر متعین دو بوڑھے ملازم اپنے راج کمار کی مدد کو دوڑے۔ ان سب نے مجھے گاڑی سے باہر نکالا۔ "آپ ہٹ جائیے سرکار!" ایک بوڑھے ملازم نے دنیش سے کہا۔ "ہم موہن بابو کو آرام سے پہنچا دیں گے۔"

"جلدی کرو۔" دنیش نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ دونوں سے میرے

پہلوؤں میں اپنے ہاتھ ڈالے۔ ایک بوڑھا شخص میری کرسی کے آگے بڑھا۔ میرا احساس اس قدر ضرور جاگ چکا تھا کہ میں ذہنی ہیئتِ کذائی پر خود سے نفرت کر سکوں۔ جی چاہتا تھا ان سب کو دھکا دے کے خود سے دور پھینک دوں جنھوں نے کیا مذاق بنا رکھا تھا لیکن جسم میں بے شمار شگاف پڑے ہوئے تھے اور میں اکھڑ رہی تھی۔ ٹانگوں میں جان نہیں تھی۔ چیخنے اور تڑپنے کا یارا بھی نہیں تھا۔ بہت زور سے چیخنے، تڑپنے اپنے آپ کو چیرنے پھاڑنے اور وہیں بکھر جانے کا سودا سر میں سمایا تھا۔ ان کے کروہ منتروں، سوئیوں اور ٹھوکروں نے اتنی قوت بھی باقی نہیں رہنے دی تھی کہ آگے بڑھ کے ستون سے سر پھوڑ لوں۔ ونیش کے کمرے میں پہنچ کے میرے سانسوں سے درد چھوٹنے لگا جیسے درد کا منہ کھل گیا ہو۔ اس وقت تک میں اپنے ذہن کے ساتھ رہا۔ جب ملازموں نے مجھے ونیش کی خواب گاہ سے ملحق بستر پر ڈالا۔ اس کے بعد چہار سو رات چھا گئی۔ میں کسی گہرے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

پھر کسی وقت مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میری کھال میں تنکے چبھو رہا ہے کوئی بہت زور سے مجھے پکار رہا ہے اور کانوں میں شور ٹھونس رہا ہے۔ دماغ کی خالی نسوں میں مختلف قسم کی آوازیں اور بوئیں ایسی تیزی سے اندر داخل ہوئیں کہ میں بے اختیار ہاتھ پیر مارنے لگا۔ کسی نے میرے ہاتھ پکڑ لیے کسی نے پیر گرفت میں لیے۔ میں نے اضطراری حالت میں آنکھیں کھول کے دیکھا تو سامنے دھندلی دھندلی نظر آئی۔ چہرے صاف پہچانے نہیں گئے لیکن آنکھوں سے یہ دھند ہٹی اور ذہن کا جالا صاف ہوا تو مجھے قرار آیا۔ میں قبر میں نہیں تھا۔ بستر کے اردگرد سفید پوش نرسیں مضطرب کھڑی تھیں اور ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کی چمکیلی نظریں میرے رگ و پے میں حیرت بوئی جا رہی تھیں۔ وہ اچانک سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس نے نرسوں کو اشارہ کیا۔ ایک نرس تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دوسری ایک گلاس لیے میرے سرہانے آئی اور اُس نے میرے خشک حلق میں تیز قسم کی دوا انڈیل دی۔ تھوڑی دیر میں ونیش لپکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے اُسے راستے میں روک لیا۔ "راج کمار!" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ان کی نیند ٹوٹ گئی ہے۔"

"اوہ ڈاکٹر! ڈاکٹر!" ونیش مسرت اور جوش سے بولا اور میری طرف منہ کھولے دوڑا۔

ڈاکٹر نے اس کا کاندھا پکڑ لیا۔ "آپ اسے بس دیکھیں گے۔" وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

ونیش نے بے چینی سے گردن ہلائی اور ڈاکٹر کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا میری مسہری پر جھک گیا۔ "موہن! موہن!" وہ میرے ماتھے کا بوسہ لیتا ہوا بولا۔ "تم نے اب کے ساری نیندوں کی کسر نکال دی۔ اُف تم نے کتنا ستایا۔ تم دو دن سے مسلسل سو رہے ہو۔ اب تم کیسے ہو؟ ہاں اب تم بالکل ٹھیک ہو۔"

میں نے اپنی توانائیاں سمیٹنے کی کوشش کی اور ہاتھ اٹھا کے ونیش کے بال پکڑنے چاہے۔ یہ دیکھ کے مجھ میں سنسنی ہونے لگی کہ اب میں اپنے اعضا کو جنبش دے سکتا تھا اور اسی وقت مجھے یہ پتہ چلا کہ میرے جسم کا بیشتر حصہ پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ "بس کچھ اور انتظار کی زحمت ہوگی۔" ڈاکٹر نے ونیش کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد آپ دونوں دنیا کے ہر مسئلے پر بے تکان بات کر سکیں گے۔"

"دیکھو۔ دیکھو ڈاکٹر! وہ کچھ بولنا چاہتا ہے۔" ونیش نے ڈاکٹر کی توجہ میرے ہونٹوں کی طرف مبذول کرنی چاہی اور اپنے کان میرے ہونٹوں سے مس کر دیے۔ "اوہ۔ اوہ موہن!" وہ مچل کے بولا۔ "میں سن رہا ہوں۔ سن رہا ہوں۔ تم اب بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے موہن! تم اب بھی ہم سب سے زیادہ توانا ہو۔"

ڈاکٹر نے اُسے میرے پاس سے کھینچ لیا اور نرس نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے مجھے چادر اڑھا دی۔ شام تک میں ڈاکٹر اور نرسوں کے درمیان کمرے میں اکیلا رہا۔ وہ میرے کولھوں اور کلائیوں میں انجکشن لگاتی اور حلق میں دوائیں ٹپکاتی رہیں۔ شام کو ڈاکٹر نے ایک نیا تماشا شروع کیا۔ پہلے ڈالی کمرے میں آئی اس کے ساتھ ترنم بھی تھی۔ دونوں کے چہرے کمھلائے ہوئے، آنکھیں ویران اور نقوش پریشان تھیں۔ غالباً ڈاکٹر نے انھیں سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ انھوں نے اپنے عہد کا پورا پاس کیا۔ ترنم دور پاس سے میری طرف نظریں کیے خاموش کھڑی رہیں۔ آنسو پہلے ہی کہیں بہہ کے آئی ہوں گی۔ پھر ڈالی سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی اور بلکنے لگی۔ نرس اُسے پکڑ کے دوسرے کمرے میں لے گئی اور دوا دینے پر وہ بپھر گئی۔ نرس کا حلقہ توڑ کے بے تحاشا میرے جسم پر آ پڑی۔ ترنم کسی بت کی طرح بے جان کھڑی تھی اگر ونیش چند منٹ آ نہ جاتا تو ڈالی اسی طرح سسکتی اور بکتی رہتی۔ "ہماری خطائیں معاف کر دیجیے راج کمار!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔ "ہمیں یہاں سے دھکے دے کے نکال دیجیے یا ہمیں ایک دن گولی مار دیجیے۔" ڈالی ونیش کے قدموں پر سر پٹخنے لگی۔

"ہمیں بھی اپنے ساتھ لیتی چلو۔ کیا ہمیں اکیلا چھوڑ جاؤ گی؟"

"آپ ہمارا کیوں مذاق اُڑاتے ہیں راج کمار!" وہ تڑپ کے بولی۔

ترنم نے ڈالی کو ونیش کے قدموں سے اٹھانے کی کوشش کی۔ "رہنے دیجیے ترنم! اسے کہنے دیجیے۔" ونیش نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ میرے ہاتھ میں پستول ہوتا تو میں بستر سے لیٹے لیٹے ڈالی کو نشانہ بناتا۔ وہ بد زبان ونیش چند سے نہ جانے کیا کیا بکتی رہی۔ ونیش خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر وہ خود ہی تھک گئی یا ونیش کی خاموشی سے پشیمان ہو گئی جیسے اُسے کچھ ہوش آ گیا۔ وہ اٹھ کر بگولے کی طرح ناچتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

ڈالی اور ترنم کے جانے کے بعد مہارانی، بابا، ویدی، رشی، رشیاں اور محلوں کے چند سرکردہ ملازم مجھے دیکھنے آئے اور تسلی کے دو لفظ کہہ کے رخصت ہو گئے۔ پھر پاروتی خزاں کا جلوہ دکھانے اور میرے زخموں کے حشر کا نظارہ کرنے آئی۔ وہ

سندھیا اپنا روایتی وقار بھول گئی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسوں کی موجودگی میں بلکنے لگی۔ آج اس نے اپنے لباس پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اپنی جامہ زیبی اور خوش پوشی کے لیے سارے علاقے بھر میں مشہور تھی اور اُسے خود پر قابو رکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ زرد، بے رونق کے اُس کے ہونٹ لرزنے اور بدن کانپنے لگا۔ آئینے پر گرد جم گئی تھی۔ میں نے ایک خفیف مسکراہٹ سے اُسے دیکھا تو وہ جھنجھنا سی گئی جیسے اس کے بدن کے تاروں پر کسی نے خنجر چلا دیا ہو۔ اُس کی نگاہوں میں اتنی بے ہنگم اور اتنے رنگ برنگے جذبے چھپے ہوئے تھے کہ مجھ میں اُسے دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ لیکن چھ دن میں اُس کا کیا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ چہرے کی سرخی کوئی اُڑا کے لے گیا تھا۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں دیکھا گیا۔ میں نے بے چارگی سے نظریں جھکا لیں۔ نہ جانے وہ کب تک اسی طرح سنسان کھڑی رہی اور کب چلی گئی۔

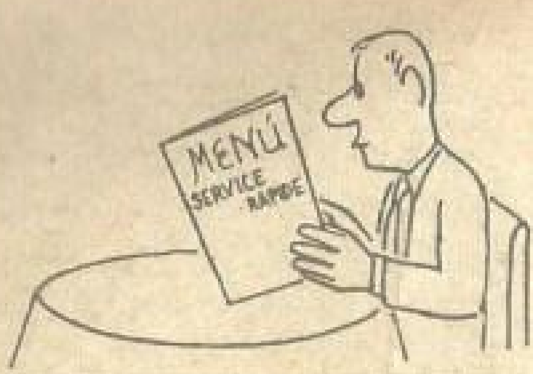
میری آنکھ دوبارہ لگ گئی تھی کہ کمرے میں اچانک چیخ پکار ہونے لگی۔ سندھیا اندر گھس آئی تھی۔ نرسیں اُسے معذرت خواہانہ لہجے میں دھیمی آواز میں بات کرنے کی تلقین کر رہی تھیں۔ وہ کسی صورت نہیں مانتی تھی اور مجھے دیکھنے پر مصر تھی۔ میں نے پوری طاقت صرف کر کے اُس کا نام لینے کی کوشش کی۔ کراہ میں لپٹی ہوئی سندھیا کے نام کی یہ صدا کمرے میں گونجی تو نرسوں نے اچانک پلٹ کے میری جانب دیکھا اور سندھیا نے ایک ہی جست میں میری مسہری پر آکے دم لیا اور میری آنکھوں میں وارفتگی سے جھانکنے لگی۔ اُس نے ایک ہی جھٹکے میں میرے جسم سے چادر کھینچ لی اور دہشت میں ایک سسکاری بھر کے پیچھے ہٹ گئی۔ "یہ کیا ہو گیا موہن؟" اُس کی خوف زدہ آواز اُبھری۔ میں نے اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ وہ گم صم ہو گئی پھر لرزیدہ آواز میں نرسوں سے پوچھنے لگی۔ "اسے کیا ہو گیا؟"

"اب یہ بالکل خیریت سے ہیں۔" نرس نے ناگوار نرمی سے جواب دیا۔

"تم کہاں تھے موہن اور اپنا یہ کیا حال کر کے لائے ہو؟" وہ آہستہ آہستہ دوبارہ میرے نزدیک آئی اور مسہری پر بیٹھ گئی۔ "تم بولتے کیوں نہیں؟"

"سندھیا جی!" نرس نے دخل دیا۔ "انھیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ ان سے بات کرنے کی کوشش نہ کیجیے ڈاکٹر کی سخت ہدایت ہے۔ آپ کو معلوم ہے راج کمار نے دو دن سے محل کے کسی فرد کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ آج شام جب یہ ہوش میں آئے تو اس شرط پر لوگوں کو اندر آنے دیا گیا کہ وہ صرف انھیں دیکھ کے چلے جائیں گے۔ گھبرائیے نہیں۔ تمام تر توجہ سے اُن کا علاج ہو رہا ہے اور اُن کی جلد صحت یابی کے لیے ضروری ہے کہ آپ انھیں پریشان نہ کریں۔ زیادہ سے زیادہ آرام کرنے دیں۔" ادھیڑ عمر نرس نے مشفقانہ انداز میں سندھیا کو سمجھایا۔

"مگر تم مجھے بتاؤ کہ یہ کہاں سے آ رہا ہے؟ اس کے جسم پر یہ پٹیاں کیسی بندھی ہوئی ہیں؟ یہ بولتا کیوں نہیں؟" وہ ایک ہی سانس میں بولی۔





"ہمیں کچھ نہیں معلوم جب انھیں راج کمار نے طلب کیا تو یہ بے ہوش تھے اور ان کے سارے جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ کوڑوں کے نشانات کئی جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی تھی۔" نرس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے بولی اور غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر وہ نرسوں کی پروا کیے بغیر وحشیانہ انداز میں میرے ہاتھ پاؤں ٹٹولنے لگی۔ تکلیف سے میری سسکیاں نکل گئیں۔ اُس نے فوراً اپنے ہاتھ اُٹھا لیے اور خفت سے میرے سرہانے بیٹھ گئی۔ "موہن!" اُس نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا "مجھے بتاؤ وہ کون لوگ تھے؟ میرے کان میں کہہ دو۔" جھکتے وقت اُس کے بال میرے چہرے پر بکھر گئے اور اُن کی سوندھی خوشبو سے دماغ معطر ہو گیا۔ اُس کی بکھری ہوئی زلفوں سے مجھے ایسا سکون ملا کہ اگر میری حالت ذرا بھی درست ہوتی تو میں انھیں کاٹ کے ہمیشہ کے لیے اپنے چہرے پر رکھ لیتا۔ "میرے کان میں کہہ دو۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "میں اب ہمیشہ اپنے پاس پستول رکھتی ہوں۔ کس سے بدلہ لینا ہے؟ بس تم مجھے اُس وحشی کا نام بتا دو، بتا دو نا۔" وہ تلملا کے بولی۔

"سندھیا!" میں نے سرد آہوں کے درمیان اُس کا نام لیا۔

نرسوں نے باہر جا کے ونیش چندر کو خبر کر دی تھی کہ سندھیا مجھے تنگ کر رہی ہے۔ ونیش نے آکے اُسے میرے سرہانے سے اُٹھایا۔ وہ گنگ سی ہو گئی۔ "چلو۔ باہر چلو۔" ونیش اُس کی پشت پر ہاتھ رکھے ہوئے اُسے باہر لے گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ صرف ایک مدھم قمقمے کے سوا باقی تمام روشنیاں بجھا دی گئیں۔ سب آئے مگر وہ نہیں آئی۔ شارد! نہیں آئی۔ میری آنکھیں اُسے دیکھنے کے لیے جل رہی تھیں۔ آہ جب

زخموں سے کبھی کا خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ نیک شخص میری مسلسل بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کے فکرمند لہجے میں کہتا تھا "سالا کریڈٹ مجھیں جاتا ہے کہ تم نے جینے کا حوصلہ برقرار رکھا۔ یہ حوصلہ نہ ہوتا تو کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔" ڈاکٹر طہور کو میرے بارے میں بڑی غلط فہمی تھی۔ زندگی کا یہ حوصلہ میری بے غیرتی اور بے حسی کی دلیل تھا اور ڈاکٹر کو کیا معلوم تھا کہ میں کتنی بار مر چکا ہوں۔ یہ جسم قرطین، زہریلی کرنوں اور گولیوں کا عادی ہو چکا ہے اور میرے کئی جیون کیسے کیسے ہیں۔ ایک غزالہ آتی ہے اور اپنی سنہری معطر زلفیں میرے چہرے پر بکھرا کے مجھے زندہ رہنے کی تلقین کر جاتی ہے۔ مجھے زنجیر پہنا جاتی ہے۔ کبھی کوئی پنڈت راستہ بدل کے ادھر متوجہ ہو جاتا ہے اور منتر پڑھ پڑھ کے پھونکتے ہوئے زندگی کی گرہ مضبوط کر جاتا ہے۔ کبھی ایک نحیف سادھو جنگلوں اور پہاڑوں سے کرشمہ کار خاک لا کے میرے زخموں میں بھر دیتا ہے اور جسم لمحوں میں استوار ہو جاتا ہے۔ کبھی ایک پُراسرار سایہ نمودار ہوتا ہے اور مجھے دائیں بائیں چلنے والے نشتروں سے خبردار کر جاتا ہے۔ مجھے طاقت بخشنے اور زہر بے اثر کرنے کی کوئی عطا کر جاتا ہے۔ گھڑیاں پھسلتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔

ہر زندگی حادثہ ہے اور خصوصاً میری زندگی تو مقروض زندگی ہے۔ قرض خواہ کسی دن طیش میں آ جائے گا یا پھر مجھے اس کے تقاضوں سے غیرت آ جائے گی۔ مفاہمت پر کب تک کام چلتا رہے گا۔ یہ حیلے بہانے ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ میرے پہرے داروں کی نظر کسی دن چوک جائے گی۔ یہ کھیل کب تک جاری رہے گا۔ ڈاکٹر طہور اپنا نفسیاتی تجزیہ کر رہا تھا کہ یقیناً میرے سامنے زندگی کا کوئی بہت بڑا مقصد موجود ہے۔ مقصد اور اپنے زندہ رہنے کا ارادہ۔ میں نے اس کی تردید نہیں کی۔ اس بحث کا کوئی حاصل نہیں تھا لیکن مجھے بہت ہنسی آئی۔ ہر آنسو کے لیے بہانا اور ہر مسکراہٹ کے لیے جواز لازم نہیں۔ کتنے آنسو اور مسکراہٹیں ہیں جو آدمی خود ہی جذب کر لیتا ہے، دوسروں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔

کمرے سے باہر کی دنیا کے متعلق مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ پانچویں رات دنیش چند دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ میں نے پہلی بار باہر کے حالات جاننے کے لیے اشتیاق ظاہر کیا۔ وہ اب مجھ سے بہت کم بات کرتا تھا۔ ہوں ہاں کر کے ٹالتا رہا۔ اُس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ باہر اب سکون ہی سکون ہے۔ ریاست میں چین کی بنسی بج رہی ہے۔ بیگم نے پیٹ بھی تو بھر لیا ہے اور انگریز بھی ہم کے جیب بھر گئے ہیں۔ میری بے ہوشی کے دوران میں دنیا گل و گلزار بن گئی ہے۔ اب وادی چین ہی چین لکھتا ہے۔ دوسرے لوگوں نے بھی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ڈاکٹر ترنم، پاروا، سندھیا بھون کے ملازم، نرسیں اور ڈاکٹر سب دنیش کے ہم راز تھے۔ دنیش نے شاید سب کو سختی سے حکم دے دیا تھا کہ وہ میرے سامنے پرکاش بھون اور شہر کی کسی کشمکش کا ذکر نہ کریں۔ پہلے دن کے تجربے کے بعد سے میرے پریشان حال کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔ کسی نے دوبارہ آنسو بہانے کی جرأت نہیں کی۔ وہ اپنے چہرے پر غازہ مل کے آتے تھے اور سمجھتے تھے کہ میں درد و کرب کی لکیریں ان سے نہیں دیکھ سکتا۔

حبش کا فیروز شاہ بنگال کے تخت پر قابض ہوا تو اس نے غریبوں کے لیے خزانے کے منہ کھول دیے۔
ایک دن اُس نے مستحقوں میں ایک لاکھ روپے بانٹنے کا حکم دیا۔ وزیروں نے اس کی یہ سخاوت ناپسند کی اور خیال کیا کہ چونکہ بادشاہ کو اتنا بڑا خزانہ کسی مشقت کے بغیر مل گیا ہے اس لیے وہ اسے بے دردی سے لٹا رہا ہے۔
انھوں نے بادشاہ کو اس اقدام سے روکنے کے لیے خزانے کے تمام جواہر اور سونا چاندی ایک فرش پر ڈھیر کر دیے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ اتنا مال و زر ایک جگہ دیکھ کے مال و زر کی محبت میں گرفتار ہو جائے گا مگر بادشاہ نے خزانہ فرش پر بکھرا ہوا دیکھا تو سخت متعجب ہوا۔ وزیروں نے کہا: "یہ وہ خزانہ ہے جسے آپ نے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا ہے۔"
بادشاہ نے کہا: "نہیں، یہ تو اس مقصد کے لیے بہت کم ہے، اس میں ایک لاکھ اشرفیاں اور ملا دو۔"

گماں ہوتا تھا کہ اس بار بھی ہوگی۔ نرسوں نے خواب آور سوئی لگا کے مجھے مطمئن کرنا چاہا مگر شاردا کا خیال دیر تک ذہن و دل کے دروازے کھلے رکھنے کے لیے دواؤں سے نبرد آزما رہا۔ رات گئے تک میری آنکھیں آہٹوں پر لگی رہیں، دروازہ کئی بار کھلا، کئی بار بند ہوا۔ دو مرتبہ دنیش اندر آیا، نرسوں کی گھنٹیاں بجیں، ڈاکٹر نے معائنہ کیا مگر وہ نہیں آئی۔

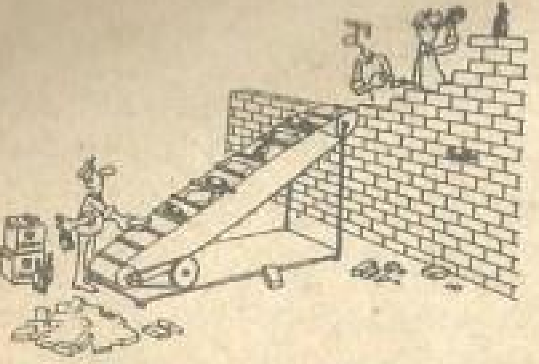
دوسرے دن صبح میری حالت نسبتاً بہتر ہو گئی تھی لیکن آنے جانے والوں پر ڈاکٹر سے زیادہ دنیش کی پابندی قائم رہی۔ شام کو کچھ لوگ دیکھنے آئے اور خاموشی سے میری بے بسی کا منظر دیکھ کے چلے گئے۔ میں دن بھر اُس کا انتظار کرتا رہا۔ ایک رات اور گزر گئی۔ زخم بھرنے لگے، جسم میں کچھ طاقت آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ لیٹے لیٹے طبیعت اُکتا گئی تھی۔ چوتھے دن ڈاکٹر نے کچھ پٹیاں کم کر دیں۔ میں اب اٹھ بیٹھ سکتا تھا اور نقاہت سے آہستہ آہستہ بات کر سکتا تھا۔ چار دن تک ڈاکٹر اور نرسیں چھاؤنی کے سنتریوں کی طرح صبح و شام میرے سامنے موجود رہیں۔ اُن کی ڈیوٹیاں بھی اُنھی کے مانند ہوتی رہیں۔ آدمی ہمیشہ سنتریوں کے درمیان رہتا ہے، کبھی اُن کے سینوں پر وردی ہوتی ہے، کبھی وہ بے وردی ہوتے ہیں۔ اعزا، دوست اور متعلقین دوسری قسم کے سنتری ہیں۔ بس تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک مقفل زنداں ہے، ایک کھلا زنداں۔ وہاں آدمی اپنی مرضی کے بغیر پابند رہتا ہے، یہاں کی زنجیریں دوسری ہوتی ہیں، مجبوریاں پابند رکھتی ہیں۔ ایک حقیقت ہے، ایک سراب۔ زنداں اور سنتری دونوں جگہ ہیں۔"

دنیش بار بار آ کے میرا حال پوچھ جاتا تھا۔ میں باہر کی دنیا کے حال سے بالکل بے خبر تھا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلنے لگی اور خون کی گردش میں توازن ہوا، مجھے اپنے افسانے یاد آنے لگے۔ بیرونی زخم بھرے تو اندرونی زخم رسنے لگے۔ جیسے جیسے باہر کی فضا میں سکون اور لطافت کا احساس ہوتا گیا، اندر کی فضا پراگندہ اور مکدر ہوتی گئی۔ ڈاکٹر طہور نے مجھے دوبارہ زندگی دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں مجھ جیسی برداشت اور تحمل کا آدمی نہیں دیکھا۔ اصولاً مجھے ان

ڈینش کی اُلجھی ہوئی گفتگو، یادو کا وحشت انگیز اظہارِ حسرت، سندھیا کی ناقابلِ
یقین خاموشی، ڈالی کی گرتی ہوئی آسودگی وہ سب متحد ہو کے مجھ سے جھوٹ بول
رہے تھے جیسے میں سچ پڑھنے کی صلاحیت کھو چکا ہوں۔ وہ مجھے نشتر لگا کے چلے
جاتے تھے، درد کا درماں کرنے آتے تھے، درد سوا کر جاتے تھے۔ کیا میں نے پہلے
ڈینش کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کیا میں نے بہت قریب پا کے بدن کی سیر نہیں
کی تھی۔ میں ان چیزوں کا محتاج تھا۔ جسم میں ناتوانی تھی لیکن اس سے ملنے کی راہیں
میں ناتوانی کہاں پیدا ہوتی ہے۔ اس ناتوانی میں تو راستی کچھ اور شدت سے ابھر
آتا ہے۔

میں اندر بیٹھے کے ولولوں کے پار کا نقشہ دیکھ سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے ڈینش کے ملاقات کرنے میں آنے جانے والوں کی خاصی کمی ہوگئی ہے
یا ڈینش نے میری وجہ سے کسی اور ایوان میں دربار لگانا شروع کردیا ہے۔ یہ عام دن
ہوتے تو ڈینش بیشتر وقت میرے پاس بیٹھا رہتا اور ملاقاتی کمرے سے بھانت
بھانت کی آوازیں آتیں لیکن ڈینش نہایت عجلت میں آتا تھا۔ پچھلے دن مجھے
کمرے میں چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ پنڈلیوں اور بازوؤں پر صرف چند
پٹیاں رہ گئی تھیں۔ نرسیں بھی کچھ بے پروا سی ہوگئی تھیں۔ میں نے بستر سے اترنے
کے بعد پہلی ہی بار کمرے سے باہر جانے کا ارادہ کیا مگر نرسیں شدت سے مزاحم ہو
گئیں۔ جب کوئی صورت نہ بنی تو میں نے ایک نرس سے عاجزانہ درخواست کی
کہ وہ مجھے شاردا کے حال سے مطلع کرے۔ اس کے ذکر پر سب کترانے لگتے تھے۔
میں کھلے عام سب کے سامنے اس کا حال جاننے کی شدید خواہش کا اظہار بھی نہیں
کرسکتا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ وہ ٹھیک ہے لیکن اگر وہ ٹھیک تھی تو اب تک اس
نے اس طرف کا رخ کیوں نہیں کیا تھا۔ ذہن میں بے شمار اندیشے سرایت کرگئے تھے۔

میں اس رات ساری رات جاگتا رہا۔ رات کو نرس نے خواب آور
انجکشن لگانے کا قصد کیا تو میں نے انکار کردیا اور کن انکھیوں سے اس کے سو
جانے کا منتظر رہا۔ میری خوابیدگی سے مطمئن ہو کے وہ بھی سو گئیں۔ جب وہ سو
گئیں تو میں چپکے سے بستر سے اٹھا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔
ویسے بھی فرش پر بچھے ہوئے قالین پر آواز پیدا ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔ جلد ہی ہاتھ میں
دبا کے میں نے چٹخنی کھولی۔ ملاقاتی کمرے میں پُراسرار سکوت چھایا ہوا تھا۔ ڈینش
کی خواب گاہ کا دروازہ بند تھا۔ احتیاطاً میں نے وہاں جھانک لینا
مناسب سمجھا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ کچھ خیال کرکے میں اندر چلا گیا اور خفیہ جگہ سے
سیف کی چابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ڈینش نے پہلے ہی اس اہم جگہ کی
نشان دہی کردی تھی جن دیواروں میں اسلحہ کی الماریاں نصب تھیں وہاں کوئی
تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے نہایت تیزی سے الماری دیوار سے برآمد
کرلی۔ وہاں ایسی کئی الماریاں نصب تھیں مگر بظاہر دیواریں تھیں۔ وہ گہری الماری
قدیم و جدید پستولوں، ریوالوروں، رائفلوں اور بندوقوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایسے
ایسے نادر ہتھیار بے کار پڑے تھے۔ ان میں سے دو ریوالور میری نظر کو بھا گئے۔



وہ سامنے ہی رکھے تھے۔ برطانیہ کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں لوڈ کرکے نہایت
عجلت سے گاؤن کی جیب میں ڈال لیا۔ الماری پھر دیوار کے اندر چھپ گئی۔ جلد ہی
پرکاش چند کے پُرکھے کی تصویر نے سب کچھ ڈھانپ لیا۔ چلتے چلتے میں نے
ڈینش کی سنہری کرسی کے عقب میں نصب شدہ سیف بھی احتیاطاً دیکھ لینا مناسب سمجھا۔
میرا اندازہ صحیح تھا۔ سیف بند تھا اور اس کی چابیاں یقیناً ڈینش کے پاس ہوں
گی۔ اس سیف میں فوری ضرورت کے لیے نقدی اور اسلحہ موجود رہتا تھا مگر اس
کی چابیاں عام آدمی استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ مہاراجا پرکاش چند نے انھیں زمانے
کے لیے خاص اہتمام کیا تھا۔ یہ سارا تکنیکی کام کسی ایک کاریگر نے نہیں کیا ہوگا۔
دیواروں میں ہر طرف راز نہاں تھے۔ اندھیرے تہہ خانے کی وحشت ناکی میں
نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ جشناگر کی لاش اب تو گل سڑ کے برابر ہوگئی ہوگی یا
کنوئیں کا پانی اندر کسی اور راستے سے اسے کہیں کا کہیں بہا لے گیا ہوگا۔ جشناگر ہی
کیا نہ جانے کتنے جشناگر وہاں موجود ہوں گے۔ تہہ خانے کی طرف جانے والے راستے
کے حصے پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے میرے پیروں میں لرزش ضرور آجاتی
تھی۔ میں نے عام راستے سے راہداری میں جانے کے بجائے اپنا پرانا راستہ اختیار
کیا۔ ممکن ہے ڈینش نے حفاظتی اقدام کے تحت اپنے خاص گرگے باہر دربان
تعینات کردیے ہوں۔ کوئی دس دن بعد میں محل کے کھلے میدان میں موجود تھا۔
ہر چیز نئی نئی معلوم ہورہی تھی۔ ہوا بند تھی اور تیز روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ محل
میں ادھر ادھر ایستادہ سفید مجسموں پر کمزور چاندنی ٹھٹھر رہی تھی۔ میں نے اندھیرے
کی آڑ میں چاروں اطراف نظریں دوڑائیں۔ دور دور تک کوئی ذی نفس موجود نہیں
تھا۔ کوارٹروں پر مردنی کے آثار غالب تھے جیسے سب کہیں اٹھ کے چلے گئے
ہوں۔ محل میں سنگین سے سنگین وقت میں بھی ایسا ہول نہیں چھایا تھا۔ میری
ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن کسی نہ کسی طرح میں اندھیرے میں پھسلتا ہوا آگے
بڑھتا گیا۔ کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی ساتھ
ہی محل کی تیز روشنی دیواروں اور درختوں پر لرزنے لگی۔ ”ہالٹ۔“ ایک کرخت
فوجی گونج سنائی دی۔ میں جہاں تھا وہیں زمین پر دراز ہوگیا اور زمین پر رینگتا
ہوا دم سادھے ایک محفوظ جگہ چھپ گیا پھر جیسے ہی جوتوں کی آواز دور
ہوئی میں اٹھ کر تیزی سے بھاگنے لگا۔ ڈاکٹر کا خیال صحیح تھا۔ مجھے ابھی بستر سے
نہیں اٹھنا چاہیے تھا۔ لمحوں میں میری سانس پھول گئی اور زخموں کے منہ پھر

سے گھل گئے۔ میں اتنی دور آگیا تھا کہ واپسی پر بھی آمادہ نہیں ہوا۔ آخر تھم تھم کر ادھر اُدھر سونگھتا ہوا اپنی منزل پر پہنچ ہی گیا۔ وہاں کھڑکی بند تھی۔ پوری عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف بیرونی قمقمہ روشن تھا۔ میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کبھی بیٹھتے کبھی جھک کے آخر وہ دروازہ جا لیا جہاں میری سانس اٹکی ہوئی تھی۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ عمارت بے اماں تھی پھر بھی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آہستہ آہستہ میں نے دروازے پر دستک سی گھنٹی بجائی۔ یہاں کوئی ایک کمرہ نہیں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا محل تھا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں عقبی حصے کی طرف دوڑا جو محل کی دوسری عمارتوں سے مل جاتا تھا۔ وہاں بھی فضا پر بے حسی مسلط تھی۔ میں نے دروازوں سے کان لگا کے سُن گُن لینے کی کوشش کی۔ خیال تھا ڈیش چند جب اپنی خواب گاہ میں موجود نہیں ہے تو یہاں ضرور ہوگا۔ اس کے سوا وہ اس نازک وقت میں اور کہاں جا سکتا تھا اور مجھے چھوڑ کے؟ شاردا کی حالت بہتر نہیں تھی۔ کسی نہ کسی کو تو اُس کی نگہبانی کے لیے جاگنا چاہیے تھا۔ شاردا کی حالت بہتر ہوتی تو وہ مجھ سے اس قدر نادم نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں ہر سمت ویرانی کے پرنے پڑے ہوئے تھے۔ اندھیرا اور گہرا نظر آنے لگا۔ دماغ میں پرچھائیں اُڑنے لگیں۔ پہلے ہی سانس اکھڑ گئی تھی اب دم بھی گھٹنے لگا۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا مگر دو قدم بھی نہیں چلا گیا۔ میرے جسم نے مجھے ستانا شروع کر دیا۔ دیواریں جلنے لگیں۔ میں اس کے دروازے سے ٹیک لگا کے بے سُدھ بیٹھ گیا۔ پولیس کے دستے اس طرف سے گزرتے تھے مگر میری آہٹ نہ پا سکے۔ آہٹ کے لیے حرکت لازم ہے اور حرکت کے لیے اُمید

میرا سر اس کی چوکھٹ پر لڑھکا ہوا تھا اور باقی جسم زمین پر بے ترتیب پھیلا پڑا تھا۔ دفعتاً ایک مضبوط ہاتھ نے میرا کندھا اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں سمجھا دستِ اجل ہے لیکن ذرا دیر ہی میں یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ ڈیش چند میرا کندھا پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔ "اٹھو" اُس نے گمبھیر لہجے میں کہا اور مجھے سہارا دے کے اٹھانے لگا۔ ذہن نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور کھینچ لیا۔ ڈیش سے اٹھایا نہیں گیا۔ "چلو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔" اُس نے سرد آہ بھر کے کہا۔ میں نے تحیر اور خوف سے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔ "تم اس طرح کیوں بہک گئے؟" وہ ترشی سے بولا۔ میں اسے گھورتا رہا۔ "آؤ۔ اٹھو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

"مجھے سچ سچ بتاؤ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے؟" میں نے تند و تیز لہجے میں پوچھا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ میں اسے کس انداز میں مخاطب کر رہا ہوں۔

"آؤ" اُس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

"پہلے مجھے یہ بتاؤ اس کا کیا حال ہے؟ مجھ سے چھپا کیوں رہے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ بتاؤ۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"وہ ٹھیک ہے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مگر وہ ہے کہاں؟ وہ ٹھیک ہے تو مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئی؟ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے چھپائی جا رہی ہے۔"

"موہن! موہن!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "تم ضد کیوں کرتے ہو۔ وہ مری نہیں ہے۔ ابھی زندہ ہے۔ یقین کرو ابھی زندہ ہے۔"

اس کے لہجے سے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میں دزدیدگی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات صاف نظر نہ آسکے۔ "وہ مر نہیں سکتی۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے معافی مانگنے کا ایک موقع فراہم کر دو۔ وہ ناراض ہو گئی ہے۔" میں نے فریاد کی۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر آہستگی سے بولا۔ "موہن! سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا تم اس کے پاس ایسی حالت میں جاؤ گے؟ اس بیماری میں تمہیں دیکھ کے اس پر کیا کچھ نہ گزر جائے گی۔ تم نہیں مانتے تو سنو۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "وہ بستر سے لگ گئی ہے۔ کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا ہے۔ تم ہوتے تو شاید وہ ٹھیک ہو جاتی مگر تم اپنے عذاب میں مبتلا تھے۔ میں اس حالت میں تمہیں اس کے سامنے نہیں لے جا سکتا تھا اور نہ اس کی شکل تمہیں دکھا سکتا تھا۔ کل رات سے اب تک اس کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔ آنکھیں کھولتی ہے تو پاگلوں کی طرح چھت کو گھورتی رہتی ہے۔ نہ کسی سے بات کرتی ہے نہ کسی کی بات سنتی ہے۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ ریاست کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بلایا جا چکا ہے۔ بمبئی سے بھی ایک ڈاکٹر بلایا گیا تھا۔ وہ اسے اچھا نہیں کر سکا مگر تمہیں صحت یاب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔" ڈیش بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ادھر تمہاری کوئی خبر نہیں تھی جبکہ یہاں تمہاری ضرورت تھی۔ مشتبہ ملازم گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ محل کا سارا انتظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ گورے حکام اور پولیس کے افسر فوقیت کے تعین کے بغیر تفتیش کے لیے آ دھمکتے ہیں۔ جہاں جانے انگریزوں کو اپنی تن دہی اور سنجیدگی دکھانے کے لیے باہر بھی خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں نایاب ہو گئی ہیں۔ جو ملازم رہ گئے ہیں وہ سڑکوں پر نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں انہیں گرفتار نہ کر لیا جائے۔ اب انگریز ہائی کمان کے تین اعلیٰ افسر تحقیقات کے لیے ہیڈ کوارٹر سے آئے ہیں۔ مجھے کئی بار طلب کیا جا چکا ہے۔ محل کے ایک ایک ملازم ایک ایک شخص سے … کی توہین آمیز تفصیل طلب کی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ریاستی پولیس اور گوروں پر جنون سوار ہو گیا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ تم خود زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک لمبی داستان ہے موہن! آؤ اٹھو۔ چلو۔ آرام سے بستر پر لیٹ جاؤ۔" وہ ٹوٹے ہوئے لفظوں میں کہتا رہا۔

مجھے فردِ جرم سنائی جا رہی تھی۔ ڈیش میں اتنی شکست خوردگی، اتنا کرب اور اتنا انتشار میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک بوڑھے آدمی کی طرح رک رک کے سانس لے کے باتیں کر رہا تھا۔ میرا درد نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ سب کچھ سُن ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ڈیش نے میرا مفلوج جسم جھنجھوڑ کے اٹھایا۔ مجھ سے کوئی مزاحمت نہیں ہو سکی۔ ڈیش کے سینے میں آگ سلگ رہی تھی۔ ریاست میں ہر طرف آگ لگی ہی تھی اور مجھ پر برف

رہی تھی میں اس کی انگلی پکڑے کسی معصوم کی طرح اس کے ساتھ چلتا رہا۔ "تم چپ کیوں ہو گئے؟" اس نے راستے میں مجھے ٹوکا۔ "میں اسی لیے تم سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ تمھیں یہ باتیں ابھی نہیں سننی چاہیے تھیں۔" اس نے کسی قدر مضبوط لہجے میں کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "اتنے الزامات سننے کے بعد کوئی مجرم جواب کیسے دے سکتا ہے"۔ "بہرحال، حالات ٹھیک ہی ہو جائیں گے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے شاید تمھیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔ پھر تم اپنے زخموں کے ساتھ اتنی سخاوت تو نہ برتتے۔ ذرا دل کو تسلی ہوئی تھی کہ تم تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہو۔ مجھے کچھ سستانے کا موقع مل جائے گا، میرا بوجھ کم ہو جائے گا مگر تم نے پھر زخموں کو ہوا دے دی۔"

"بس کیجیے۔ بس کیجیے ونیش بابو!" میں نے اس کے جسم کے ساتھ جھولتے ہوئے کہا۔ "اتنا کچھ مت کہیے۔ میں۔ میں۔" میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں اب بالکل صحت مند ہوں۔ دیکھیے بالکل ٹھیک ہوں۔ میں خوب دور تک کا نشانہ لے سکتا ہوں۔ اب آپ سو جائیے۔ آپ بہت تھک گئے ہوں گے آپ...... آپ کو میری قسم۔" یہ کہتے کہتے میرا گلا رندھنے لگا۔

"ارے موہن!" وہ دیوانگی سے مجھے دوبارہ میرے قدموں پر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ "بس تم کچھ تھوڑا سا آرام اور کرلو۔ پیارے ننھے سے بچے کی طرح میرا کہنا مانو۔ جاؤ بستر پر لیٹ جاؤ۔ تم جتنا زیادہ آرام کروگے، مجھے اتنا ہی سکون پہنچاؤ گے۔ اتنی ہی جلد مجھے کمر ٹکانے کا موقع نصیب ہوگا۔ بس اب میں ایک بات بھی نہیں سنوں گا۔"

"ونیش بابو! میں... میں آپ کی ہر بات مان لوں گا لیکن.... لیکن مجھے ایک بار شاردا کا چہرہ دکھا دیجیے۔ پھر آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔"

"میں اسے اس کے محل سے منتقل کرکے اپنے قریب اسی لیے لایا تھا کہ تم اس سے آسانی کے ساتھ مل سکو گے۔ وہ اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے جہاں دیا منظم تھی۔ یہ سب میں نے تم دونوں ہی کے لیے کیا تھا۔ کاش میں تمھیں بتا دیتا تو تمھیں اس حالت میں اتنی دور آنے کی اذیت نہ جھیلنی پڑتی۔ اس وقت نرسیں اور باندیاں جاگ رہی ہوں گی مگر تم اس سے کوئی بات نہیں کر سکتے اور وہ بات کرتی بھی کہاں ہے۔ اسے تو اپنا ہوش ہی نہیں ہے۔"

"میں اسے ایک نظر دیکھ کے چلا آؤں گا۔ اسے پریشان نہیں کروں گا۔"

ونیش کے محل میں داخل ہوتے ہی بے اختیار اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ پھر ہم دونوں ہلکی چالوں سے اس حصے کے نزدیک پہنچ گئے جو خاص مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ اندر جھلمل جھلمل روشنی ہو رہی تھی۔ ونیش کی ہلکی سی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ باندی کی آنکھوں سے اس وقت انتہائی حیرت ہویدا ہوئی جب اس نے ونیش چند کے پیچھے میرا چہرہ دیکھا۔ اس پرشکوہ ایوان کے اندر ہی سے خواب گاہ کو راستہ جاتا تھا۔ غنودہ نرسوں کو باندی نے چونکا دیا۔ "اندر کون ہے؟" ونیش نے پوچھا۔

"مالتی سرکار!" باندی نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"اسے باہر بلاؤ اور دیکھو وہ بے آرام نہ ہو۔" انتظار میں میرے پیر لرزنے

ایران

کے بادشاہ نصیر الدین نے ایک بار اپنے وزیر سے پوچھا کہ "ہم زیادہ عادل ہیں یا نوشیرواں زیادہ عادل تھے؟" وزیر بڑی کشمکش میں پڑ گئے۔ انھوں نے سوچا اگر نصیر الدین کو نوشیرواں پر ترجیح دی گئی تو اسے خوشامد تصور کیا جائے گا اور اگر اس کے برعکس جواب دیا گیا تو بادشاہ ناراض ہو جائے گا۔ اس لیے وہ خاموش رہے۔ نصیر الدین نے کچھ دیر تک ان کے جواب کا انتظار کیا پھر کہا "اچھا، ہم خود جواب دیتے ہیں۔ ہم نوشیرواں سے زیادہ عادل ہیں۔ اس کی وجہ سن لو۔ نوشیرواں کا وزیر بزرجمہر نہایت قابل اور نکتہ شناس شخص تھا۔ نوشیرواں ہر معاملے میں اس کی رائے پر چلتے تھے۔ جب بھی وہ راستے سے بھٹکتے، بزرجمہر انھیں صحیح راستے پر لے آتا مگر بدقسمتی سے ہمارے وزیر تمھاری طرح ہیں جو ہمیشہ ہمیں صحیح راستے سے ہٹانے کی بات کرتے ہیں۔"

گئے۔ باندی ڈگمگاتی ہوئی مالتی کو لے کے فوراً واپس آگئی۔ "کیسی ہے وہ؟" ونیش نے افسردگی سے پوچھا۔

مالتی نے گردن جھکا دی۔ ونیش مجھے لیے ہوئے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ وسیع و عریض کمرے کی دو ریشمیں پلنگوں کے درمیان مرصع مسہری پر شاردا بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ونیش نے قریب جاکے اسے دیکھا اور ہولے سے مجھے اشارہ کیا۔ اس ایک ہلکی سی آہٹ پر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی اور اس نے خوف زدہ انداز میں چونک کے دروازے کی طرف رخ کر لیا۔ میں جیسے ہی اس کی بے قرار نظروں کے احاطے میں پہنچا، وہ ساکت سی ہو گئی اور پاگلوں کی طرح ٹکٹکی باندھ کے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے توقف کیا مگر لمحوں پہ لمحے گزر گئے۔ اس کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس سے زیادہ اذیت میں نے جدائی میں بھی نہیں جھیلی تھی۔ ونیش نے کھنکار کے اسے متوجہ کیا اور سرگوشی میں کہا۔ "شاردا!... شاردا! موہن تمھارے سامنے ہے۔ یہ موت کے منہ سے بچ کے آیا ہے۔ اٹھو بڑھ کے اس کا استقبال کرو۔ دیکھتی نہیں ہو اس کا چہرہ کیسا زرد ہو گیا ہے۔"

میرے نام پر اتنا ضرور ہوا کہ اس کے بدن میں ارتعاش ہوا۔ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں اور اس کے لبوں پر حسرت آمیز لرزش ہوئی۔ تاہم اس نے پہلو نہیں بدلا۔ وہ اسی طرح ساکت اور منجمد رہی۔ پھر اسے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کے بستر پہ ڈھیر ہو گئی۔ ادھر سے ونیش ادھر سے میں لپکا۔ شاردا کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں بلکہ سارے بدن سے اس کا اختیار چھن گیا تھا۔ ونیش نے اس کا سر اپنے زانوؤں پہ رکھ لیا۔ "شاردا! شاردا!" وہ اسے کرب ناک آواز میں پکارنے لگا مگر شاردا تو کہیں گم ہو گئی تھی۔ اس نے کوئی آواز نہیں سنی۔ "اسے پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ بس اس کا بار بار یہی حال ہو جاتا ہے۔ پہروں تک کے ادھر ادھر دیکھتی ہے، بڑبڑاتی ہے اور ٹھہر جاتی ہے۔" ونیش نے رومال سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کسی دن یہ ختم ہو جائے گی۔"

میں نے مسہری پر جھکتے ہوئے بے تابی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "شاردا! شاردا!"

میرے سینے سے آواز نکل رہا تھا۔ جب کوئی اس قسم کی صدا لگاتا ہے تو پتھروں میں بھی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور اس قسم کی صدا کوشش سے نہیں لگائی جا سکتی، یہ خود بخود آ جاتی ہے۔ "میں آ گیا ہوں، کوئی اور نہیں، یہ میں ہوں، مونی! آنکھیں کھولو، کھولو آنکھیں اور مجھے غور سے دیکھو ورنہ میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لوں گا۔ اتنی تو ناراض مت ہو شارو!" میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "اتنی سی بات کا برا مان گئیں؟ تم تو کہتی تھیں کہ میرے ساتھ مشقت کرو گی، جھونپڑی میں رہو گی۔" میں نے اسے دنیش کے زانوؤں سے چھین کے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ دنیش اٹھ کے دروازہ بند کر آیا۔

میری آغوش کی گرمی سے اس میں کسی قدر حرارت پیدا ہوئی۔ "تمھیں کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔" میں نے اسے اپنے سینے میں جذب کر لیا۔ "کوئی بھی، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ تم نے غلط سمجھا شارو! اس وقت میں بہت پریشان تھا، مجھے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ اتنے بڑے امتحان میں مت ڈالو۔ تم تو میرا حوصلہ بنی ہوئی تھیں، تم روٹھ گئیں تو پھر میں کہاں کھڑا ہوں گا؟ بولو شارو!" میں نے اس کے رخسار چومتے ہوئے کہا۔ میری پے در پے فریادوں کا اس پر اتنا اثر یقیناً ہوا کہ اس نے اپنی پتھریلی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ میرے آنسو دیکھے اور میرا چہرہ دیکھا۔ "شارو! شارو!" میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ میں تماشا دیکھتا رہوں گا اور میرے سامنے تمھاری ڈولی اٹھ جائے گی؟ راجا ہاتھی پر سوار ہو کے تمھیں لے جائے گا؟ جس وقت میں نے تمھیں اس تنور کا اشارہ کیا تھا کہ تم راجا کی بات قبول کر لو، اس وقت میرے ذہن میں تمھارا ہی خیال تھا۔ مجھے اپنی تنگ دامنی کا شدید احساس تھا۔ تم تو ایک پھول ہو، میری خشک زمین میں اس کے کمھلا جانے کا ڈر تھا اور مجھے بہت سی باتوں کا خیال تھا۔ تم نے غلط سمجھا۔ کچھ غور ہی نہیں کیا کہ میرے منہ سے ایسی بات کیوں نکل گئی۔ پھر تم نے اتنی کڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھ پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ تم نے صرف اپنا خیال کیا۔ شکایت تو مجھے تم سے ہونی چاہیے تھی۔ تم نے خود دیکھا تھا، میرے کپڑے خون سے بھرے اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ تمھی نے تو میرا لباس تبدیل کیا تھا۔ میرے ہتھیار چھپا کے رکھے تھے۔ تمھی نے تو میری کہنیاں چھلی ہوئی دیکھی تھیں۔ تمھیں معلوم تھا کہ میں کسی اچھی جگہ سے نہیں آ رہا ہوں۔ میرا خیال رکھنے کے لیے تمھیں ہوش میں رہنا چاہیے تھا۔ اتنا اثر لے لیا اور کچھ نہیں سوچا؟ جب کہ تم تمام واقعات کی شاہد تھیں اور دیکھ رہی تھیں کہ میں کن بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں کسی بھی وقت تمھارے ساتھ فرار ہو سکتا تھا لیکن کیا دنیش کو ہم بھیڑیوں کے حوالے کر جاتے؟ تم جانتی تھیں کہ دنیش بہادر ہے لیکن ہمیشہ چوکنا نہیں ہے۔ جب تمھیں بھی یہ خبر ملتی کہ تمھارے عزیز بھائی کی پشت میں کسی نے خنجر گھونپ دیا ہے، اس وقت تمھاری کیا حالت ہوتی اور میں نے اپنے بارے میں تو تمھیں کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ میں کن بے شمار مجبوریوں کے سبب فرار نہیں ہو سکتا۔ مجھے ایک اچھے وقت کا انتظار ہے۔ کیا میں نے تمھیں بار بار یقین نہیں دلایا تھا کہ وہ وقت ضرور آئے گا؟ تم نے تو بہت جلدی کر دی شارو! بے ہوش ہو جانا، اپنے

آپ سے بے خبر ہو جانا، خود کو ختم کر دینا تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ آدمی زندہ رہ کے برداشت کرے تو بات ہے۔" میں کہتا رہا۔ اب اس کی آنکھیں پٹ پٹانے لگی تھیں اور ان میں آنسو چھلکنے لگے تھے۔ میں اس کی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے اندر آندھیاں چل رہی تھیں اور زلزلہ آیا ہوا تھا۔ سارا کرب اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ وہ تھرتھرانے لگی تھی۔ دنیش مذبذب اور متحیر میری باتیں سن رہا تھا۔ مجھے اس کی موجودگی کا اس وقت خیال آیا جب اس نے میری پشت پر ٹھوکا مارا اور اشارہ کیا کہ مجھے اپنا بیان جاری رکھنا چاہیے۔

بیان؟ اعترافات؟ اپنی محرومیوں کے اعترافات، اپنی کم مائیگی کے اعترافات، اپنی تشنہ کامیوں کا اقرار، اپنی ندامتوں کا اظہار، اپنی شوریدگی کا احوال۔ سینے سے نکلتا ہوا دھواں فراوانی سے، رات گزرتی رہی اور میں اسے اپنے نہاں خانے کے جہنم کی سیر کراتا رہا۔ "تم تو راج کماری ہی نکلیں۔" میری آواز آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ "تم نے تو اپنا ہی خیال کیا، ہمارے بارے میں نہیں سوچا، یہ دیکھو۔" میں نے ایک جھٹکے سے اپنے گاؤن کے بٹن توڑ دیے۔۔۔ زخموں پر سرخی آئی ہوئی تھی۔ یہ زخمی لکیریں دیکھ کے اس کے خوابیدہ ہونٹ بے قرار ہو گئے۔ "شارو! مجھے خوف زدہ مت کرو۔ بتاؤ، میں تمھاری بات نہ ماننے کی جو لغزش ہوئی، اس کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ جواب دو، کیا تم اندر سے اتنی تنگ آ گئی تھیں؟ پھر کیوں اس مشکل کام کا ارادہ کیا تھا؟" میں نے اس کے بازو پکڑ کے وحشت میں اتنی زور سے ہلائے کہ وہ ٹوٹ پڑی اور جو آنسو اس کی آنکھوں میں قید تھے، انھوں نے اپنی زنجیریں توڑ دیں اور اس نے اپنے آپ کو جس محبس میں بند کر لیا تھا، اس کی دیواریں منہدم ہونے لگیں۔ اس کا بادہ چھلک پڑا۔ آنسوؤں کا دریا آیا تو تھمے نہ تھمتا۔

لفظ ایک فضول چیز ہیں۔ اصل چیز تو لہجہ ہے اور لوگ لہجہ اختیار کرنے کے فن میں بھی طاق ہو گئے ہیں، چنانچہ اصل چیز تو وہ بجلی ہے جو لفظوں اور لہجے کے تاروں پر دوڑتی ہے اور جہاں یہ تار نہیں ہوتے وہاں بھی چمک اٹھتی ہے۔ یہ بجلی عام بجلی سے زیادہ تیز اور کاری ہوتی ہے۔ وہیں گرتی ہے جہاں آرزوؤں کے آشیانے بنے ہوتے ہیں۔ میری زبان نے وہ اثر نہیں کیا جو ان چنگاریوں نے کیا جو میری آنکھوں اور میرے جسم سے اٹھ رہی تھیں۔ ان سے مجھے جلنا تھا، کوئی جلا، پتھر میں آگ نہیں لگتی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے حبس خانے میں ایک روزن ایسا ضرور ہوگا جہاں شعلے لپک پڑیں گے۔ دھوپ میں مینہ برس رہا تھا۔ وہ جل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آبشار جاری ہو گیا تھا۔ آدمی میں اس آبشار کی گنجائش نہ ہوتی تو آدمی بہت بنجر ہوتا۔

رات بھر دنیش یوں ہی بیٹھا رہا۔ اپنی بہن کا گریہ دیکھ کے اسے بھی تعجب ہوگا کہ اس میں کتنے سمندر چھپے تھے جو نظر ہی نہیں آتے تھے۔ صبح کے قریب اس نے مجھے بیدار کیا اور ہم دونوں کو پھلوں کا رس پیش کیا۔ دنیش کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ گلاس اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ میں نے سسکیوں کے درمیان اپنے ہاتھ سے شارو کو رس پلایا۔ آدھا گلاس باقی رہ گیا تو میں نے اپنے منہ میں ڈال

محبت کا اتنا اثر نہیں ہوگا جتنا شارد کے ہونٹوں کا تھا۔ وہ عطا آتشہ مشروب بن گیا میرے جسم و جاں میں صبح کی نرم اور لطیف ہوا کے جھونکے در آئے اور میں نے محسوس کیا جیسے میں ایک صبح جیسی تر و تازہ اور شاداب جیسے میرے جسم پر ایک سر موجود نہ ہو۔

جب ہم دونوں ملاقاتی کمرے میں پہنچے تو دن طلوع ہو رہا تھا۔ موہن مجھے اپنے کمرہ خاص میں لے گیا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ ہی بستر پر دراز کر لیا۔ دیر تک ہم دونوں کے درمیان سکوت کا پردہ حائل رہا۔ ایک عجیب اسرار آمیز سکوت۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ کیا بات کرے اور کہاں سے ابتدا کرے۔ میں اس کے ذہن میں اٹھنے والے بے شمار سوالوں سے آگاہ تھا۔ میں نے ہی ابتدا کی اور اسے چند گھنٹے نیند لینے کی بے معنی تلقین کی۔ میں اٹھنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ "بیٹھو موہن۔ ابھی مت جاؤ۔" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس رہو۔ میں ان دنوں بہت تنہا رہا ہوں۔"

"جو لمحے سکون کے ملے ہیں انھیں غنیمت سمجھئے۔ سو جائیے۔ بزرگوں نے کہا ہے آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کے سوئیے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بیداری میں سکون بہت نایاب چیز ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔" وہ کروٹ لے کے بولا۔ "تم کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔"

میں اپنے آپ کو بہت عجیب سا محسوس کر رہا ہوں۔"

"تم ایک سوچا عجائب گھر ہو۔ ... آشنا ہونے کے باوجود راستہ بھٹک جاتا ہوں۔"

"مجھے خود بھی اپنے بارے میں نہیں معلوم۔ راستہ ہی بنا لے ...

جد و جہد تھی، تمہارا ان مرحلوں سے گھبرا گئی۔"

"موہن! کبھی کبھی تو میں تم سے حسد کرنے لگتا ہوں۔"

"کبھی کبھی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اصل میں، میں بھی آپ سے بعض اوقات حسد کرتا ہوں۔ آپ کا دل مجھ سے بہت بڑا ہے۔"

"لیکن موہن!" وہ بے چینی سے بولا۔ "ایک بات تو بتاؤ۔"

"اب آپ مجھے پریشان کرنے کے موڈ میں ہیں۔" میں نے اس کے تیور دیکھ کر کہا۔ "دیکھیے! رات آپ خود اصرار کر رہے تھے کہ مجھے آرام کرنا چاہیے۔"

"صرف چند باتیں، ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔" میں چپ ہو گیا تو اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا۔ "ایک طرف تم نے مجھے کرنل ہارنگ اور مہاراجہ سے دوستی کی پینگیں بڑھانے بھیجا اور دوسری طرف...." وہ معنی خیز انداز میں مجھے گھورنے لگا۔

"ہاں۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "مجھے یقین تھا آپ یہ سوال ضرور کریں گے۔ بات ہی ایسی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا ایک جیکسن کے ختم ہو جانے سے مہاراجہ اور کرنل اور آپ کے درمیان جو رابطہ قائم ہو رہا ہے وہ متاثر نہیں ہوگا۔"

"مگر کیوں؟ آخر تمھیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کاش تم مجھ سے اس کا تذکرہ کر دیتے۔" وہ ناراض ہونے کے انداز میں بولا۔

"اس کا موقع کہاں ملا۔ دوسرے دن جب آپ شاردا کے سلسلے میں سخت پریشان تھے، مجھے آپ سے جدا کر دیا گیا۔ جیکسن کو مجھ پر شبہ ہو گیا تھا کہ میں نے میجر رابرٹ کو قتل کیا ہے اور معافی دینے کے لیے اس نے یہ شرط عائد کی تھی کہ سکھ بھون کے راز ہائے درون سے انگریزوں کو باخبر رکھا کروں۔ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی اور صبح و شام آ کے اپنا چہرہ دکھا جاتا تھا۔"

"مگر کیسے؟" وہ مضطرب سا بولا۔ "تم نے اسے کیسے ختم کیا؟"

میں نے بے دلی کے ساتھ سرسری انداز میں اسے تمام واقعہ بتایا۔ "بد قسمتی سے بات جیکسن تک محدود نہ رہی ورنہ میجر رابرٹ کی طرح اس کی موت پر انگریز ادھر اُدھر پھرتی دکھا کے خاموش ہو جاتے۔ مجھی سے ایک چوک ہو گئی۔ باقی آدمیوں کے قتل کا ذمے دار تو جیکسن ہے کہ اس نے میری عاجلانہ لمحوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کے چھاؤنی فون کر دیا کہ وہ کھنڈروں کی طرف جا رہا ہے۔ میں واپس ہی آ رہا تھا کہ وہ راستے کا پتھر بن گئے اور مجھے مجبوراً ......" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ایک اکیلے تم سب سے؟" وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

"میں ان کے مقابلے میں نسبتاً بہتر پوزیشن میں تھا۔" میں نے مختصر مبہم سے کہا۔

"مگر ... مگر وہاں تو موقع واردات کے نزدیک جگ ڈیپ کی حویلی کی گاڑی اس کے مسلح آدمیوں سمیت پائی گئی؟" وہ تذبذب سے بولا۔ "انگریزوں نے اس بھون کا جو حال کیا ہے وہی حال بڑی حویلی کا ہے۔ وہاں بھی خاک اُڑ رہی ہے۔"

"اس کا انتظام بھی میں نے ہی کیا تھا۔" سوال سے سوال ابھر رہا تھا۔ اب کون سی بات چھپی رہ گئی تھی۔ میں نے اس کا تجسس دور کرنے کے لیے بھون میں واپسی، شاردا سے ملاقات اور انیتا کو معزول رکھنے، جگ ڈیپ کو فون کرنے کی باقی داستان بھی سنا دی۔ ونیش کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اور ... اور انھوں نے تمھیں اتنے وثوق سے کیسے گرفتار کر لیا؟"

"اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ کرنل ہارڈنگ اور چھاؤنی کے دوسرے لوگ اس حقیقت کا بچشم خود مشاہدہ کر چکے تھے کہ میرا نشانہ کیسا ہے۔ کھنڈر میں کوئی دوسری لاش پڑی ہوئی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ایسا نشان تھا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہاں سے کوئی لاش ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند روز پہلے بھون میں جو گولی چلنے کے واقعے میں جیکسن میرے ہمراہ تھا۔ کوئی بھی نکتہ داں آسانی سے اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ جیکسن سے میرے مراسم خصوصی نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ بھون اور جگ ڈیپ کی حویلی اور ریاست میں ہونے والے خون ریز پُراسرار واقعات، پروفیسر تابدی اور موہن داس کی شخصیت کا تضاد، میری آپ کی دوستی، میری گرفتاری کے کتنے جواز ان کے پیش نظر ہوں گے اور کنور جگ ڈیپ نے کس کس مؤثر انداز سے ان کی توجہ میری جانب مبذول کرائی ہوگی۔ ممکن ہے کرنل مجھ سے اپنی بیٹی کا بڑھتا ہوا التفات بھانپ گیا ہو اور اس کے ذہن میں اسا میں پہلے ہی

مرحلے پر رینا کے سامنے مجھے عریاں کر دینے کا سودا سما گیا ہو۔"

"مگر موہن تمھاری غیر موجودگی میں جو وہ سادھو اور انگریز مارے گئے؟"

"اگر وہ قتل آپ نے نہیں کیے تو یقیناً میرا کوئی شدید ہمدرد ہوگا۔"

"وہ کون ہو سکتا ہے؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔

"کوئی بھی۔ مجھے خود اس کا علم نہیں ہے۔"

"سادھو!" وہ تیزی سے بولا۔ "تم سے اُن کی دلچسپی ناقابلِ فہم ہے۔ بڑے بڑے سادھو اور پنڈت جن کا ریاست میں ڈنکا بجتا ہے، چھاؤنی کے دروازے پر تمھارے لیے احتجاج کر سکتے ہیں۔ وہ تمھیں مہاراج کہتے ہیں اور تمھارے چرن چھوتے ہیں۔ یہ کتنا حیرت انگیز ہے۔ یہ سب کچھ حواس باختہ کر دیتا ہے۔ تم سے اُن کی دلچسپی بے سبب تو نہیں ہو سکتی اور خود تم ... میں تم سے اعتراف کروں کہ میں چھاؤنی سے واپس آتے وقت راستے بھر یہ گتھی سلجھاتا رہا مگر مجھے کوئی سرا سجھائی نہیں دیا۔"

"یہ سرا مجھے بھی نہیں ملتا۔ میں خود حواس باختہ ہو جاتا ہوں۔"

"مگر تم نے بارہا اس پر غور کیا ہوگا اور کسی نہ کسی طرح اپنے ذہن کو ضرور تسلی دی ہوگی۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ میں تمھیں خود سے ایک مختلف شخص کی حیثیت سے تسلیم کروں۔ مجھے ان سب باتوں پر یقین نہیں آتا مگر تم خود بھی تو سوچتے ہو گے۔ مجھے بتاؤ تم اپنے آپ کو کس طرح سمجھاتے ہو؟"

"میں نے اپنے آپ کو سمجھانا ترک کر دیا ہے۔ کیا آپ اس کائنات کی کوئی توجیہ کر سکتے ہیں؟ نہیں کر سکتے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "آپ نے ان سوالوں پر غور کرنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ ان سے ذہن اور اُلجھ جاتا ہے۔ جو موجود ہے، بس ہو رہا ہے۔ کیوں اور کیسے پر توجہ دیجیے گا تو پوری زندگی اسی اُدھیڑ بن میں گزر جائے گی۔ اب ہر شخص زمین کے ایک محدود حصے کے مسائل کے بارے میں سنجیدہ ہوتا ہے یعنی جہاں تک اس کے متعلقین اور اس کی گزر بسر کا تعلق ہے۔ وہ آسمان، تاروں، سیاروں، شمسی نظام وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کے بارے میں کہاں سوچتا ہے۔ یہ غور و فکر تو صرف چند لوگ کرتے ہیں حالانکہ ہم سب کا اس کائنات سے تعلق ہے۔ ان سب کو اس عجیب و غریب نظامِ حیات پر سوچنا چاہیے۔"

"تم کائنات کی بات کرنے لگے۔" وہ اُکتا کے بولا۔ "ہم سادھوؤں اور پنڈتوں کی بے پناہ توجہ نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ وہ زمین کے اسی محدود حصے کے مسائل ہیں جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔ مجھے یاد ہے ابھی کچھ دن پہلے تم نے بتایا تھا کہ وہ تم سے کہیں ملتے اور خود کو پہچاننے کی تلقین کرتے ہیں۔ انھیں تمھارے اندر ایک دھرماتما کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی بات تم نے کہی تھی؟"

"ہاں، وہ یہی کہتے ہیں۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ میں نے سوچا اسے کچھ کے بارے میں بھی بتا دوں کہ وہ اس کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور وہ جس ہستی کا تذکرہ کرتے ہیں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ دیوی دیوتا، مافوق الفطرت، اس سے یہ ذکر کرتے ہوئے جھجک ہوتی تھی۔ ونیش نے گزشتہ دن جس جان کنی اور وحشت میں گزارے ہوں گے اس کا تصور کرتے ہوئے ہول آ رہا تھا۔ اس کی جگہ

کوئی دوسرا ہوتا تو جنون میں نہ جانے کیا کچھ کر جاتا مگر وہ طرح ہوتا تو وہ وحشی ہوتا ہی کیوں؟ وہ پرکاش چندر یا ہیش چندر ہوتا جس کی بہن یا بیٹی شاردا جیسی کیفیت سے دوچار ہوتی تو وہ ایک لمحے بھی بغیر آگے بڑھ جاتا۔ میں وحشی سے کچھ کا ذکر کرکے اسے اور الجھن میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ اب باتیں بند کرکے سو جائے اور میں اس کا سر دباتا رہوں اس کی ٹانگیں دباتا رہوں۔ وہ بہت تھک گیا تھا تھکن اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے زیادہ سخت وقت گزارا اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کی بہن پر اچانک یہ کیا افتاد آپڑی ہے اور اسے پتہ نہیں تھا کہ کھنڈروں میں کئی انگریزوں کے حادثۂ قتل پر میں کہاں کھو گیا ہوں۔ وہ بڑی تنہائی محسوس کرتا ہوگا۔ اس نے کرنل ہارڈنگ اور ریتا کی بابت اور ریاست کی موجودہ صورتِ حال پر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے ان معاملات میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ دن کی روشنی خاصی پھیل گئی تھی۔ ڈاکٹر ملہوترا مسلسل خواب گاہ کی گھنٹی بجا رہا تھا کہ اس کا مریض اس نادانی میں کدھر روپوش ہوگیا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سرزنش کرتا ہوا مجھے پھر کمرے میں اٹھا لے گیا اور اس نے میرا گاؤن کھول کے دیکھا تو سخت برہم ہونے لگا۔ "میں تمہارے پیروں میں زنجیر ڈال دوں گا۔" وہ تنبیہی انداز میں بولا۔ "اب تم نے اگر میری اجازت کے بغیر باہر نکلنے کی جرأت کی تو میں تمہارے علاج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔" اس نے مجھے دھمکی دی اور میرے زخم خود مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کر کے لائے ہو۔ رات بھر تم انھیں کہاں لیے پھرتے رہے؟" میں نے خاموشی سے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا۔ ٹیسیں پھر اُٹھنے لگی تھیں۔ وہ سچ کہتا تھا جسم پر جمی ہوئی کھرنڈوں اور پٹیوں کی لکیریں جلنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر نے میرے گوشت میں سوئی چبھو دی اور اس طرح مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔

لیکن جیسے ہی خواب آور دوا کا نشہ ٹوٹا، مجھ سے بستر پر نہیں لیٹا گیا۔ مجھے یہ آرام بے وقت لگا۔ گو بھون میں مہاراجا کی اسپیشل پولیس اور چھاؤنی کے مسلح گارڈ پہرا دے رہے تھے اس لیے باہر سے کوئی بلا نازل ہونے کا امکان نہیں تھا۔ پھر کیا اتنے مستعد اور فرض شناس جوان آنگنوں کو چین کی نیند سلانا چاہیے۔ یہی ایک وقت آرام کا تھا۔ جگ ڈیپ کی شعلہ مزاج بہن اندرا اسی دن بھون سے رخصت ہوگئی تھی جس دن ریتا نے چھاؤنی واپسی کے لیے رختِ سفر باندھا تھا۔ ان نازک اور کمزور حالات میں کنور جگ ڈیپ یا بھون میں موجود کسی شخص سے کسی قسم کی ملاقات متوقع نہیں تھی۔ جگ ڈیپ کو تو اپنی صفائی پیش کرنے ہی سے فرصت نہ ہوگی۔ اس کا بیان محض عذرِ لنگ سمجھا گیا ہوگا کہ کسی نامعلوم شخص نے فون پر اس کی بہن کو اغوا کرنے کا دعویٰ کیا تھا اور وہ دعوے دار کی مطلوبہ رقم سمیت اپنے مسلح آدمیوں کو کھنڈر بھیجنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اوّل تو جگ ڈیپ اپنی بہن کو اس قسم کے معاملے میں ملوث کرنا مناسب نہیں سمجھتا ہوگا۔ اس نے مجسٹریٹ میں پہلے جو بیان دے دیا ہوگا اسی پر جما رہا ہوگا ہر چند اسے منحرف کرنے کی چنداں

[illegible] رات میں اور [illegible] کیوں پڑتی۔ گو میں نے [illegible] کتنے ایسے باظرف ہوں گے جنھوں نے [illegible]

مجھے انگریزوں کو کچھ دھول نہیں [illegible]

"تاڑ لینے سے کم نہ ہوگی کہ بھون میں میری صحیح و سلامت واپسی [illegible] بھون کے دربانوں نے مار کھانے کے باوجود جھوٹ [illegible] واقعے کی رات انھوں نے مجھے صدر دروازے سے باہر نکلتے اور واپس آتے [illegible] گو میں نے پھر بھی مقدور بھر کوشش کی۔ اب اُن کی الجھنیں شباب پر ہوں گی کہ زنداں میں میری موجودگی کے وقت کسی زندہ دل نے اُن کے وہم کو گرم کرکے اُن کی پریشانیوں میں مہمیز لگا دی تھی اور جگ ڈیپ کے علم میں قطعاً یہ حقیقت نہیں ہوگی کہ چھاؤنی کے سربراہ کرنل کی بیٹی نے اس رات بھون میں میری موجودگی کی تصدیق کر دی ہے۔ ہاں ممکن ہے اس کے کانوں تک یہ خبر پہنچ گئی ہو کہ ریاست کے سادھو اور پنڈت از راہِ ہمدردی میری نجات کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنے چھاؤنی پہنچ گئے تھے۔ یہ خبریں سن کے جگ ڈیپ کو بہت سے پچھلے واقعات یاد آگئے ہوں گے۔ مثلاً اپنا گھوڑے سے گرنا، چھاؤنی سے میری واپسی پر اپنے دس زرخرید آدمیوں کا حشر، اپنیا کی ناکامی۔

پہلے کی بات اور تھی۔ اسے تو جگ ڈیپ کی غیر معمولی شخصی خوبیاں ہی کہنا چاہیے کہ وہ ہر بار پہلے سے زیادہ متشدد ہو جاتا تھا۔ پہلے تو ہم اپنی عقل کے مطابق اس کے زرخیز دماغ کی معرکہ آرائیوں کا جواب دینے پر اکتفا کرتے تھے اس کے بعد جب ہم نے گرہ لگانی شروع کی تب بھی جگ ڈیپ نے خاطر خواہ ردِعمل کا اظہار کیا۔ جواب اُسے میرے بارے میں کسی اور انداز سے سوچنے پر مجبور ہونا چاہیے۔ حالانکہ بات معمولی تھی سادھو اور پنڈت کسی موہوم اور مبہم اُمید پر مجھ سے یک گونہ رفاقت کا اظہار کر رہے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں کسی نامعلوم منزل پر اُن کے [illegible] جس طرح جھگڑا بھی کیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ توقعات وابستہ رکھتے تھے۔ میں اُن کی توقعات کا عرصہ طویل کر سکتا تھا لیکن ریاست جلے یا رہے کے اثر خاندانوں میں پنڈتوں اور سادھو سنتوں کو جو منزلت حاصل تھی اسے دیکھتے ہوئے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ جگ ڈیپ کہیں وہم و گمان کا شکار ہو گیا ہو اور ان کسی طور بھی بنے مگر جگ ڈیپ کے مزاج میں علم، بردباری اور متانت پیدا ہو جائے۔ چاہے ریاست کا زرنگار تاج اسی کے سر پر سجے جگ ڈیپ نے بھی انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وحشی کی طرح وہ بھی اس وہم و گمان پر شک سے آمادہ ہوگا۔ ترغیبات بہرحال بڑی چیز ہیں۔ ترغیبوں سے افراد کیا قومیں بہک جاتی ہیں۔ پریت اور اندرا نے اسے بار بار یہ ترغیب دلائی ہوگی کہ جوں ہی اس کے کندھوں پر سادھو دیوراج بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیتا ہے، بغیر [illegible] طرح

طرح کی باتیں اُس کے کانوں میں پہنچتی رہی ہوں گی۔ وہ بھی آدمی ہی کے تخم سے بنے سلسلے تو ضرور ملائے گا اور کیا عجب کہ کوئی ترغیب اس پر اثر کر جائے۔ اسے خوں ریزی میں کیسے مزہ آتا ہے۔ انسان کا خون کوئی قابلِ دید اور خوش ذائقہ چیز بھی نہیں ہوتا۔ اب جگ دیپ اور اس کے حواریوں کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ اس اندھا دھند بھاگ دوڑ میں کسی بھی کھائی میں گر جانے کا اندیشہ تھا۔ میں جگ دیپ کے مصاحبوں میں ہوتا تو اسے یہی گراں قدر مشورہ دیتا۔

اُدھر راجا کے ذی وقار مہاراجا رامپور پر بھی نزع کا عالم طاری ہو گا۔ انھوں نے اس بار اپنی تن دہی، مستعدی اور سنجیدگی کا حیرت ناک مظاہرہ کیا تھا۔ اُن کے حکم سے ریاست کے ہزاروں افراد جیل میں تھے۔ وہ ایک طرف اپنی رعایا کو یہ باور کرانے کے لیے سارا زور صرف کر رہے تھے کہ انگریز کا خون کتنا جنگجو ہوتا ہے دوسری طرف بقول دنیش انگریزوں کے اپنے اخلاص کے اظہار میں انھوں نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک غیر جانب دار شخص ہیں اور ان کی نظر میں سب برابر ہیں۔ وہ دنیش کے بھون جگ دیپ کی حویلی اور امرائے رامپور کے خاندانوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھوں نے سب دست راز و رست کے ملازمین گرفتار کر لیے تھے گوروں کی دسترس سے جو ملازم بچ گئے تھے، وہ ان کی جیلوں میں قید تھے۔ انھوں نے سر دست یہ بات بھی فراموش کر دی تھی کہ دنیش نے کرنل ہارڈنگ سے اُن کا رابطہ مضبوط بنانے کے لیے خود دھوپ کی تھی۔ مہاراجا کو دنیش کی ناسپاسی اطاعت ناگزیر سے شدید صدمہ پہنچا ہو گا جب اس نے جیکسن کی قتل کی اطلاع پر اُن کی طلبی درخورِ اعتنا نہیں سمجھی تھی اور اپنی بہن شاردا کی علالت کا عذر پیش کر دیا تھا اگرچہ مہاراجا نے بڑی وضع داری کے ساتھ کنول کو ارسال کر کے یا خود کنول نے اپنی ایما پر دوسرے دن شاردا کی عیادت کر کے دنیش کے عذر کی تصدیق کر لی تھی مگر ایک کانٹا مہاراجا کے دل میں ضرور چبھ گیا ہو گا۔ ایک چانس کہ کرنل ہارڈنگ سے تعلق کی کار دنیش کے مراسم اتنے گہرے کیوں ہیں اور دنیش کو ان کی طلبی پر لازماً آنا چاہیے تھا۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جاتی۔ شروع شروع میں مہاراجا شاید کسی نتیجے پر پہنچے ہوں مگر دنیش کی بے نیازی، میری گرفتاری، شاردا کی ایما بلکہ ہماری بھون سے دنیا کی واپسی اور کرنل ہارڈنگ کی بے توجہی سے انھوں نے اپنے فیصلوں میں ترمیم کی ہو گی۔

میرے ذہن میں ساری ریاست سمائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ملہوترا کی تاکید تھی کہ مجھے تمام تفکرات سے بے نیاز بستر سے چپکے رہنا چاہیے اور یہ موقع بھی مناسب تھا کہ اسی عالم میں خاموش رہنے میں عافیت تھی مگر شاردا کی حالت اور دنیش کی مایوسی دیکھ کے اس طرح چپ چاپ آرام کرتے رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ انگریز اور راجا ایک دن ہیبت پھیلاتے پھیلاتے تھک جائیں گے اور اس شخص کو تلاش کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے جو ان ہیبت ناکیوں کا سبب بنا تھا۔ واقعات پر وقت کی گرد پڑتی جائے گی۔ ذہن کے نقشے وقت کی دھوپ کے زرد پڑنے لگیں گے۔ بھون سے پولیس اور گورے ہٹا لیے جائیں گے ریاست کے بازاروں کی رونق دوبارہ بحال ہو جائے گی اور امرا کی [illegible] ڈھلتے ہی پھر سے قمقمے روشن کیے جائیں گے گھنگرو چھنکیں گے، پازیبیں [illegible] کروں میں دوبارہ شطرنج کی بازی جمے گی اور وہ آدمی دوبارہ وزیر [illegible] گے جو زر کے بدلے خون کا سودا کرتے ہیں۔ یہ ہنگامہ سرد ہو جائے گا کب تک [illegible] پھر سے گولیاں چلیں گی، چاقو لہرائیں گے، مجھے گلیوں میں چھپ کے [illegible] پیچھے سے جایا جائے گا اور میرا جسم میرے خون سے رنگا جاتا ہے کہ [illegible] بھارت کے قتل کی سزا کیسے ادا ہو گی بھگتنی پڑ رہی تھی اتنے [illegible] جانے والے رو مارے ہو چکے تھے کہ اب ذہن میں تو بیگم اور بھارت کی شکلیں دھندلا گئی تھیں۔ اُس وقت میرے ناپختہ ذہن نے زیادہ ہی اندیشہ محسوس کیا تھا ہندوستان بہت بڑا ہے۔ اس بڑی زمین میں کوئی کہاں تک تعاقب کر سکتا ہے۔ ریاست کی پولیس اور گورے تو سراغ رسی میں مہارتِ تامہ کے باوجود امتی کا حال جاننے میں ناکام ہو گئے تھے۔ یقیناً کرنل اور مہاراجا نے اپنے اہل کاروں کو مجھ پر خصوصی توجہ دینے کی ہدایت کی ہو گی۔ اُن کے سوالوں میں سب سے زیادہ زور اس نکتے پر دیا جاتا تھا کہ میں کہاں سے چل کے ریاست میں وارد ہوا ہوں؟ کرنل اور مہاراجا کو امتی کے بارے میں میرے بیان پر یقین نہیں آیا ہو گا تاہم انھیں پروفیسر زاہدی کی دلچسپ اور تیکھی گفتگوئیں یاد آتی ہوں گی اُن کے کارندوں نے بیدوں، سوٹیوں اور کیلوں سے مجھے بار بار کریدا۔ اُن کی جارحانہ روشنیاں بھی میری شناخت نہ کر سکیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اب وہ میری جانب سے غافل ہو جائیں گے۔ اقتدار اُن کا تھا، اختیار اُن کا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے۔

میرے اندر طوفانی تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ وقت کی بڑی تنگی محسوس ہو رہی تھی جیسے مجھے دیر ہو رہی ہو۔ مہاراجا اور گورے اس موقع پر غافل ہو سکتے ہیں تو کیا مجھے اور دنیش کو بستر پر دراز ہو کے بیٹھے ہوئے حالات کا تماشا دیکھتے رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر نے مزید ایک دن مجھے مجبور کیے رکھا لیکن دوسرے دن میں ملاقاتی کمرے میں چل آیا۔ سب سے پہلے میں نے زیبا کو فون کیا۔ میری آواز پر اس کا اداس لہجہ مسرت سے کانپنے لگا مگر چند ہی لمحوں بعد وہ اداس ہو گئی اور اس نے دل گیر انداز میں بتایا کہ کرنل کو آفیسران کمانڈ کے عہدے سے معطل کیا جا چکا ہے اور اسے تاحکمِ ثانی رامپور میں ٹھہرنے کا حکم ملا ہے۔ ہائی کمان کے تین اعلا افسروں نے چھاؤنی کی کمان سنبھال لی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب اور اپنی نظر بندی سے پریشان تھی۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ یہ کالے بادل بہت جلد چھٹ جائیں گے۔ اس نے اشاروں اشاروں میں ابھی مجھے محتاط رہنے کی تلقین کی۔ فون پر وہ اتنا ہی کہہ سکتی تھی۔ اس گفتگو سے کم از کم یہ تشفی تو ہو گئی کہ کرنل اپنی بیٹی کو اپنی ناراضی کی حد تک منتقل نہیں کر سکا۔ وہ اب بھی اتنی ہی وارفتہ تھی بلکہ پہلے سے زیادہ۔

میں نے اپنا لباس تبدیل کیا اور ملاقاتی کمرے کا دروازہ کھول دیا

میں رخصت کر دی گئیں۔ ڈاکٹر ملہوترا نے مجھے اس حالت میں حرکت کرنے کے نتائج سے آگاہ کر کے مہمان خانے میں جا بسا۔ میری سرگرمی پر دنیش بھی ہو گیا۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ شاید لوگ اسی انتظار میں تھے کہ کے کا دروازہ کھلے اور وہ ریاست کی تازہ ترین صورتِ حال جاننے ادھر ٹوٹ پڑیں۔ میں نے آج پہلی بار صوفے سے اٹھ کے ان کی پذیرائی کی۔ دنیش نے بھی یہ بات محسوس کی اور اس نے آنے والے لوگوں کی نظروں اٹھتے ہوئے سوالوں کا جواب ان کے سامنے مجھ سے اپنی رفاقت ہوا کر کے اور درمیان میں نہایت بے تکلفی سے اہم موضوعات پر مجھے مخاطب کرتا مہمانوں کے کھانوں کے لیے دنیش کی اپنے ملازم موہن داس سے کرنی کوئی انوکھی بات نہیں تھی جب مجھ پر گولی چلی تھی، وہ میری نسبت اپنے کا برملا اظہار کر چکا تھا۔ اس کے اس اعلان کے باوجود لوگوں کے سامنے آقا اور ملازم کا حجاب میں نے برقرار رکھا تھا۔ مہارانی مایا دیوی کے سوا کسی کے لیے میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ کسی نے انگریزی میں دنیش سے ملتے ہوئے میرے یہاں ناروا نشست اور گستاخانہ تیور کا شکوہ کیا تو دنیش نے صفائی سے یہ کہہ کے ٹال دیا "موہن داس کوئی غیر شخص نہیں ہے ہم اسے ملازم نہیں سمجھتے اور ہم جانتے ہیں کہ اسے ملازم کیوں نہیں سمجھنا چاہیے۔" اس نے کسی قدر بلند آواز میں کہا تاکہ سب سن لیں اور سند رہے۔ ادھر مہاراج گل سندھیا نے اشارتاً ہی کورٹ کے گیٹ آنا کے محل میں ایک طرح یہ منادی کرا دی تھی کہ میری مخالفت کتنی ضرر رساں ہو سکتی ہے پھر بھی میری موجودگی یا موجودگی تو خیر پہلے بھی ہوتی تھی، میری نشست و برخاست کے سبب ان کی جھجک قائم رہی تھی۔ نئی بات تھی۔ عادی ہونے میں وقت لگتا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب مجھے پارو کا چہرہ دیکھنے سے ہوا۔ اب تک اس کی انا سے میری تفصیلی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی سندر آنکھوں میں صحراؤں کی ویرانی تھی اور اس کا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ — پہلی بار مجھے یہاں اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھ کے اس کے زرد چہرے کا رنگ بدلا۔ دنیش نے اس کا ذکر مجھ سے پیار اور احترام سے کیا تھا کہ وہ شاردا کی تیمارداری میں سب سے زیادہ منہمک رہی ہے۔ پارو میں ہونے والی تبدیلیوں پر دنیش کو حیرت تھی۔ ان دنوں جب دنیش میری اور شاردا کی فکر کے سوا تمام دنیا سے کٹ گیا تھا اس کے لیے ریاست کے دھنک رنگ حالات سے باخبری کا وہی ایک ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو پارو کا رنگ نچوڑ رہی تھی۔ کوئی ایسا کیڑا اس کے بدن سے چمٹ گیا تھا جس نے چند ہی دنوں میں اس کے شباب کا رس چوس لیا تھا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے لیے پریشان رہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اسے کوئی دکھ تھا اور میں وہ دکھ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اپنے اس چہرے کے سبب وہ مجھے بہت اجنبی لگ رہی تھی۔ اس میں نہ وہ تیزی تھی نہ طراری۔ بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا۔ میں اسے اٹھنے کا اشارہ کر کے اس کے محل میں جا سکتا تھا لیکن یہ زمانہ پارو جیسی فعال



"قرار سے بیٹھو گے کہ نہیں؟"

اور سرگرم لڑکی سے رشتہ جتانے کا نہیں تھا۔ راہداری گارڈوں اور پولیس کے سنتریوں کے تعرض سے آزاد تھی مگر کوئی بھی مجھے پارو کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں اسے اشارہ کر کے راہداری میں آ گیا اور یونہی بے ارادہ ٹہلتا رہا جیسے میں فرش، دیواروں اور فانوس کا معائنہ کر رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد پارو ملاقاتی کمرے سے نکلی۔ راستے میں اس کی میری مڈبھیڑ ہوئی اور اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے کہا "میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"باندیوں کو باہر ہی رکھنا۔ میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔" میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ وہ آگے چلی گئی اور میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا اس کے محل کے قریب ہوتا رہا۔ وقت خراب تھا ورنہ اس حجت کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد میں پارو کے خصوصی کمرے میں تھا۔ چٹخنی لگانے کے بعد وہ دیوانہ وار میرے پہلو میں آ گری۔ میں نے دونوں بازو پھیلا کے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ جب بدن کسی جسم کے احاطے میں پہنچتے ہیں تو کیفیت اور ہوتی ہے اور جب بدن کسی جسم کے احاطے میں آ کے نڈھال ہو جاتے ہیں تو اور کیفیت ہوتی ہے۔ پارو کی کیفیت دوسری تھی۔ اس کے بدن کا ذرہ ذرہ میرے احاطے میں آ کے بکھر گیا تھا اور میں انہیں سمیٹ سمیٹ کے پارو کو قائم رکھنے کی فکر میں پڑ گیا تھا۔ میں نے اسے تھپکیاں دیں، اسے پیار کیا۔ میں نے اسے اپنے رگ و ریشہ میں جذب کر لیا۔ اس سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ وہ پیاسا بدن اور مرجھایا ہوا گلاب بدن میں نے اسے اپنے سینے سے نکلتے ہوئے آنسوؤں کا پانی دیا۔ پھر میں اسے اپنی گود میں اٹھا کے بستر پہ لے آیا اور میں نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کے پوچھا "تمہارا حوصلہ جب میں تنزل دیکھتا ہوں تو میرا جسم لرزنے لگتا ہے۔ پارو! کیا بات ہے تمہیں کیا ہو گیا

ہے؟" وہ پھوٹ پڑی۔ میں نے اُسے جھڑک کے برا کیا۔ "بتاؤ نا۔ اب تو میں واپس آگیا ہوں اور زندہ بھی ہوں۔" میں نے آستین سے اُس کے رخسار خشک کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو تمہیں پہلے کی طرح شاداب اور توانا ہو جانا چاہیے۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے اُسے چپ رہنے دیا لیکن یہ وقت پارو کے ساتھ طویل گھڑیاں گزارنے کا نہیں تھا۔ اس بار میں نے داستان اپنے ساتھ زنداں میں پیش آنے والی اذیتوں کی کہانی اُسے سنانی شروع کی۔ یہ طریقہ سودمند ثابت ہوا۔ وہ میری قمیص میں ہاتھ ڈال کے کراہ دینے ٹٹولنے لگی۔ کوڑوں کی لکیروں میں ابھی تک ورم ابھرا ہوا تھا۔ اُس کی نازک انگلیاں مَس ہوئیں تو سسکیاں نکل گئیں۔ وہ اپنا دکھ بھول گئی اور مجھے سرزنش کرنے لگی کہ میں اتنی جلد کیوں بستر سے اٹھ آیا ہوں۔ میں نے کہا۔ "یہی وقت تو اُٹھنے کا تھا۔"

وہ سراسیمگی سے مجھے دیکھنے لگی۔ "موہن! اب کوئی اور قدم مت اٹھانا۔" وہ میری غیر حاضری میں گزرنے والے لمحوں کی سرگزشت سنانے لگی۔ وِنش کی طرح اُسے بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اچانک کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ تین دن تو وہ ایک پل کے لیے نہ سو سکی۔ پھر جب اُسے معلوم ہوا کہ میں چھاؤنی میں موجود ہوں تو اُسے کہیں قرار آیا۔

میں اُس کی انگلیاں چومتا رہا۔ "پارو!" میں نے معنی خیز انداز میں اُسے مخاطب کیا۔ "تم نے کمال کر دیا مگر تم نے ان حالات میں کیسے یہ جرأت کر لی؟ تم بھون سے باہر کیسے نکلیں؟"

"کیا؟۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"میں جانتا ہوں تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟ یقیناً تم پر اس کا اثر ہے۔ کیا کوئی چوک ہو گئی؟"

اس نے ایک گہری سانس لے کے مجھے دیکھا۔ "ہاں موہن!" وہ ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاید چوک ہی ہو گئی۔ اتنی وحشت تھی کہ کچھ بے احتیاطی ہو گئی۔" وہ میرے پہلو میں کسمسانے لگی۔

"کیا؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ تم کیسے گئیں اور کیا ہوا؟"

"تم جانتے ہو میں نے تم سے پچھلی ملاقات میں ایک اینگلو انڈین پولیس افسر کا تذکرہ کیا تھا۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "وہ میرا بہت خیال کرتا ہے میں اس کا... ہمیش چندر کے زمانے سے وہ اپنا آدمی رہا ہے۔ اُس کی ڈیوٹی بھون میں لگی ہوئی تھی۔ مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ تیسرے دن اُس نے مجھے بتایا کہ تم چھاؤنی میں موجود ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم کسی طور اپنے آپ کو منکشف نہیں کرو گے چاہے تمہیں کتنی ہی سخت سزا کیوں نہ دی جائے۔ کھنڈر میں ہونے والی واردات کا تمام حال تمہاری زبانی میں پہلے ہی سن چکی تھی۔ وہ ایک مکمل اور جامع واردات تھی اس طرف سے مجھے بے فکری تھی۔ پھر کچھ خبریں مجھے پولیس افسر نے بتائیں اور کہا کہ ابھی تک وہ اصل مجرم کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تب مجھے احساس تھا کہ بھون کا مخالف گروہ چھاؤنی والوں کو بار بار یہ تلقین کر رہا ہو گا کہ تم ہی اصل مجرم ہو اور تم اپنی زندگی کی سب سے شدید سزائیں بھگت رہے ہو گے۔ اس وقت یہاں سے میں تمہارے حق میں کوئی دلیل دے سکتی تھی تو وہ یہی تھی۔"

"مگر۔ مگر پارو! تم نے یہ سب کیسے کر لیا؟" میری بے چینی بڑھ گئی تھی۔

"میں نے اپنے اینگلو انڈین پولیس افسر کی مدد لی۔ اُس کا نام ٹیلر ہے۔" وہ اٹک اٹک کے بولی۔ "میں نے ٹیلر سے کہا تھا کہ وہ اپنی سرکاری گاڑی میں مجھے چھپا کے بھون سے باہر لے جائے۔ دس بجے رات کو اس نے میوزک ہال کے پچھلے حصے میں گاڑی کھڑی کر دی اور مجھے سنتریوں کی نظروں سے چھپا کے باہر لے گیا۔ سرکاری گاڑی ہونے کے سبب راستے پر روکی بھی نہیں گئی۔ کھنڈروں سے کچھ دور اس نے مجھے اتار دیا۔ میں اندھیرے میں سفر کرتی ہوئی کھنڈر کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں ٹیلر کی اطلاع کے مطابق بابا کمان کے حکم کے تحت گورے مسلسل پہرے دے رہے تھے۔ بابا کمان سے چھاؤنی کو یہ حکم ملا ہو گا کہ جائے واردات جوں کی توں رہنے دینے کے لیے وہاں پہرا لگا دیا جائے۔ اس سے اُن کا مقصد یہ ہو گا کہ ہندوستان بھر کے اپنے سراغ رسوں کو ریاست میں بلا کے واردات کی جگہ کی تحقیق کرائیں۔ شاید کوئی نشان کوئی سراغ ایسا مل جائے جس سے وہ مجرم کی گردن تک پہنچ سکیں۔ یہ لوگ اب اپنا کام کر چکے ہیں۔ اب باقی داستان بہت تفصیل طلب ہے۔"

میں کھچی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اس کے حسین رخساروں پر موتی لرز رہے تھے۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ سارا واقعہ تفصیل سے سنائے۔

"مجھے خاصی دیر تک اندھیرے میں انتظار کرنا پڑا۔" وہ سرد آواز میں بولی۔ "گوروں کی بھاری جمعیت تو وہاں موجود نہیں تھی۔ ہوتی تو میں ادھر کا رخ کیوں کرتی۔ دس بارہ آدمیوں کا دستہ تھا۔ اس طرف سے میں نے پہلے ہی اطمینان کر لیا تھا۔ میرے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے صرف جرابیں تھیں اور میں نے ایسا لباس پہن لیا تھا جس کی سرسراہٹ بھی کھنڈروں میں گونج نہ سکے اور جو تاریکی کا ایک حصہ معلوم ہو۔ میرے اندازے کے مطابق گورے کسی ایک جگہ موجود نہیں تھے۔ بکھرے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے کھنڈروں میں صرف ایک جگہ اُن کے جمع ہونے کی توقع نہیں تھی۔ احتیاطاً میں نے ایک خنجر اور کئی پستول اپنے پاس رکھ لیے تھے نہ جانے وہاں کیا صورت پیش آ جائے۔ کھنڈر میں ایک تاریک جگہ کھڑے کھڑے میرے پیر دکھ گئے۔ کوئی اُدھر نہیں آیا۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ میں زیادہ وقت خرچ کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی اس لیے مجھے مجبوراً جگہ بدلنی پڑی۔ یہ جگہ پہلے کی نسبت کارگر ثابت ہوئی۔ گشت کرتے ہوئے دو گوروں کی جب اُدھر سے گزرنے کی چاپ سنائی دی تو میں نے اپنی سانس روک لی۔ مجھے احساس تھا کہ حملہ اتنا بھرپور اور اچانک ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی حرکت نہ کر سکیں۔ گو میں چاہتی تھی کہ میں تم سے زیادہ خبر حاصل کروں لیکن وہ ٹہلتے ہوئے آئے۔ جیسے ہی وہ اس تاریک گزرگاہ میں آئے وحشت میں مجھ سے ایک معمولی غلطی ہو گئی۔ میرے ایک ہاتھ میں خنجر تھا دوسرے میں پستول۔ باقی دو پستول میں نے اپنی پیٹی میں اٹکا لیے تھے۔ اُن کی نظروں سے بچتے بچاتے مجھے تاریکی میں کچھ اور پیچھے ہٹنا پڑا۔ کھنڈر کی ایک مبہم دیوار سے میرے الٹے قدم ٹکرا گئے اور سنبھلنے کی کشمکش میں ایک پستول زمین پر گر گیا۔ کھٹکے کی آواز سے وہ چونکے اور فوراً ہی بے تحاشا پھرتی

ٹارچ کی روشنی اندر کی طرف جھینکی اور جیسے ہی روشنی میں انھیں میرا چہرہ اور ہاتھ میں تنا ہوا پستول نظر آیا وہ بے ساختہ پیچھے ہٹے۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگنے، چیخنے یا حملہ کرنے کی حماقت کرتے میں نے اپنا بے آواز پستول چلا دیا۔ پستول انگریزوں ہی کا عطا کردہ تھا۔ دو جھٹکے کھاکر پستول سے ہوئے اور دو ادھوری گھٹی ہوئی سسکیاں ان کے منہ سے نکلیں پھر مجھ میں اتنی کھلبلی مچی کہ میں نے ان کی موت کی تصدیق کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

مجھے فوراً ٹیلر کا خیال آیا۔ وہ اتنی دیر تک گاڑی کی خرابی کا بہانہ کرکے اسے سڑک پر نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ بھی نہیں کیا تھا اور اس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے کون سی بات بتانی چاہیے کون سی نہیں۔ ہمیں جنرل نے اسی طرح اس کی تربیت کی تھی۔ واپسی کے وقت البتہ مجھے اتنا ہوش رہا کہ میں زمین پر گرا ہوا پستول اٹھالوں پھر میں کھنڈر کے اندھیرے راستوں میں اپنے آپ کو چھپاتی، ٹھٹکتی اور تیزی سے لپکتی ہوئی ان گھنے درختوں کے سائے میں آگئی جو سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹیلر کی گاڑی اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ میرے اوسان جانے لگے۔ سوائے انتظار کے سوا جھوں میں واپسی کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ بہرحال فیصلہ کرنے کے لیے میرے پاس پستول اور خنجر موجود تھا اور تمھاری یاد تھی۔" اس نے نظریں اٹھا کے مجھے دیکھا اور کہنے لگی۔ "بس تم سے نہ ملنے کا دکھ تھا۔ صبح ہونے تک میرے پاس بہت وقت تھا۔ ٹیلر سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ مجھے اس طرح چھوڑ کے خوف سے روپوش ہو جائے گا۔ میں اس کے انتظار میں متعین جگہ کے اردگرد چھپی رہی۔ سارا دارومدار ٹیلر پر تھا کہ وہ واپس آتا ہے یا نہیں۔ میں درخت کے سائے میں گم سم سی بیٹھی رہی۔ مجھے ایک اطمینان ضرور تھا کہ میں نے اپنا کام کر دیا ہے اور تم جب واپس آؤ گے تو...." میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ میرے بازوؤں نے اتنی شدت سے اسے دبوچا کہ وہ چیخنے اور چہرہ مارنے لگی۔

پھر ایک گاڑی مقررہ جگہ آکے رکی۔ وہ ٹیلر ہی تھا۔ دوسرے دن صبح ریاست میں خوف و ہراس پھیل گیا اور وہاں با خبر ٹیلر کے پاس پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا آیا۔ صبح ہوتے ہی اتنا تو اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ رات کو کھنڈروں کی طرف میری پراسرار روانگی سے دو گوروں کے قتل کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ٹیلر بہت خوف زدہ تھا۔ حالانکہ وہ پولیس کی گڈ لسٹ میں ہے اور اینگلو انڈین ہونے کی وجہ سے گورے بھی اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں مگر ٹیلر کے خوف کی وجہ دوسری تھی۔"

"وہ کیا؟" میں نے اضطراری حالت میں پوچھا۔

"بے صبری میں میرا وہ سر شانہ ذرا اونچا پڑ گیا تھا۔ دوسرے گورے کو ٹھیک سے گولی نہیں لگی۔ ٹیلر نے مجھے بتایا کہ وہ بے ہوشی کی حالت میں انگریزوں کے مخصوص اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے اور ڈاکٹر اسے بچانے کے لیے سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔"

"تو کیا وہ ہوش میں آگیا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"میں نے ارادہ کیا کہ کسی طور اسے اسپتال ہی میں خاموش کر دیا جائے لیکن اسپتال پر سخت پہرا لگ گیا تھا۔ یہ واقعہ اس دن کا ہے جب ہم چھاؤنی سے واپس

قہقہے

[illegible]

بہن: مجسم انتظار
بیٹی: فیشن اور فرمائشیں
بھائی: جائیداد کا بٹوارا
بیٹا: لاڈلی کا جھٹ
بیوی: یکم تاریخ

شفق الزہرہ، [illegible]

محبوب/محبوبہ: دل چسپ جاسوسی ناول۔
ٹیلی وژن: معاشقے کا سرکاری مدرسہ۔
سینما: تماشائی کم، ایکٹریسوں کے عاشق زیادہ۔

آئے تھے۔ ایک تو یہی پریشانی تھی پھر تمھاری حالت دیکھ کے رہی سہی جرأت بھی ختم ہوگئی۔ میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی، احتیاطاً ٹیلر نے آمدورفت ختم کر دی تھی۔ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہا کہ زخمی گورا کیا بیان دیتا ہے۔ تمھاری واپسی کے بعد مجھے اس کے بیان کی اور فکر ہوگئی تھی۔ تم واپس آگئے تھے اور اب زندہ رہنے کو جی چاہتا تھا۔ تیسرے دن ٹیلر میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ گورا زیادہ خون نکل جانے کے سبب مر چکا ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرنے سے پہلے اس نے کوئی بیان دیا ہے یا نہیں۔ اس نے عالم نزع میں جو بیان دیا ہوگا وہ تم جان سکتے ہو۔ ممکن ہے اس نے مجھے چھاؤنی میں کبھی دیکھا ہو یا نہیں اور بہرحال ٹارچ کی روشنی میں اس نے میرا چہرہ پوری طرح دیکھا تھا۔ اس وقت میری صورت اس کی نظر میں بیٹھ گئی ہوگی اور اس کے لیے میرا حلیہ بیان کرنا مشکل نہیں ہوگا۔"

مجھ پر سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں تک تو میں گم سم رہا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر پوچھا۔ "تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس نے جو بیان دیا ہوگا وہ انگریزوں کے تم تک پہنچنے کے لیے کافی ہوگا۔ ممکن ہے وہ تمھیں پہچانتا ہو اور پہچانتا ہو تو تمھارا نام اسے معلوم نہ ہو۔ ایسی حالت میں وہ ایک واضح اور مکمل بیان دینے کے قابل نہیں ہوگا۔ راجے پور میں تم جیسی حسین لڑکیاں بلاشبہ گنتی کی ہوں گی۔ مگر...." میری آواز میں خود کپکپاہٹ تھی۔ "اس وحشت ناک وقت میں اسے تمھارا چہرہ اس قدر وضاحت سے کیسے یاد رہا ہوگا؟"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔" وہ شکستہ آواز میں بولی۔ "اس کی موت کے دوسرے دن ٹیلر نے آکے مجھے بتایا کہ اس نے ہائی کمان کے افسروں کے سامنے کوئی بیان ضرور دیا ہے۔ اس وقت اسپتال کے ڈاکٹر اور نرسوں کو کمرے سے باہر کر دیا گیا تھا اور ہائی کمان کے تین افسروں کے سوا چھاؤنی کا کوئی انگریز موجود نہیں تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ہائی کمان کے افسروں نے تفتیش شروع کر دی۔ ان کی تفتیش ابھی جاری ہے۔ وہ محلوں میں بھی آئے تھے۔ انھوں نے یہاں کی ایک نوجوان لڑکی

سے ملاقات بھی کی تھی۔ یہ ملاقات بظاہر غیر رسمی انداز کی تھی۔ ظاہر ہے وہ کھلے عام تفتیش کر کے مجرموں کو چوکنا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ میرے کمرے میں آئے اور میرے بارے میں پوچھتے رہے کہ میں نے انگلستان میں کتنا وقت گزارا ہے۔ بھون میں سب سے زیادہ وقت انھوں نے مجھ سے بات کرنے میں صرف کیا۔ میں نے ان کی نشتر نگاہیں اپنے دل پر محسوس کی ہیں۔ ان کے لہجے میں میٹھا زہر بھرا ہوا تھا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا مگر کل پھر ان کا ایک افسر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ دیر تک ریاست میں ہونے والی خوں ریزیوں کے متعلق تبادلۂ خیال کرتا رہا۔ میں نے بہت محتاط گفتگو کی لیکن وہ مجھے ٹٹولنے آیا تھا۔ وہ بھون میں کسی اور سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اس نے اشاروں اشاروں میں یہاں تک کہا کہ ہائی کمان نے سختی سے حکم دے دیا ہے کہ کسی کو بھی بے امتیاز تفتیش کا ہدف بنایا جا سکتا ہے چاہے وہ ریاست کا کوئی ذی اثر شخص ہی کیوں نہ ہو۔ انھیں مجھ پر ضرور شبہ ہو گیا ہے موہن! اگر اُس نے مرتے مرتے زہر بھر دیا ہے۔ اُس نے یقیناً ایک واضح بیان دیا ہے۔ درمیان کی کوئی کڑی انھیں نہیں مل رہی ہے اس لیے وہ محتاط انداز میں کام کر رہے ہیں۔ بھون کے ہر شخص کی ایک خفیہ رپورٹ ان کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے۔ ٹیلر کا کہنا ہے کہ ہائی کمان کے یہ افسر چھاؤنی کے افسروں سے بھی رابطہ قائم نہیں کر رہے ہیں۔ وہ انھیں اُسی وقت طلب کرتے ہیں جب انھیں کسی مسئلے کے بارے میں کوئی الجھن پیش آتی ہے۔ کرنل ہارڈنگ اپنی کوٹھی میں تقریباً نظر بند ہے۔ پھر چھاؤنی کے دوسرے ماتحت افسروں کا کیا حال ہو گا۔ دیکھ لینا وہ مجرم کو ایک دم پکڑیں گے تاکہ اُسے فرار کی کوئی راہ نہ مل سکے مگر اس سے پہلے اچھی طرح تصدیق کر لیں گے۔"

"پارو! پارو!" میں نے اس کی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔ "میری جان! یہ تمھاری ذہانت ہے جس نے شبہوں کی فصل اُگائی ہے۔ ذرا سوچو تمھیں صدر دروازے سے کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ تم پر اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ تم ہمکاش چند کی رانی رہ چکی ہو اور تم سے ان کے خاص روابط بھی قائم تھے۔ وہ تم پر شبہ کرتے ہوئے ہزار بار سوچیں گے۔ تم نے اتنا حوصلہ کیوں کھو دیا؟ میرا خیال ہے تم کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہو۔" میں نے اسے تسلی دے دی تھی لیکن میرے لفظوں میں جان نہیں تھی۔ پارو جس طرح کے واقعات بتا رہی تھی اور انگریزوں کی جو گفتگو بیان کر رہی تھی اُسے سن کے کسی بھی ہوش مند شخص کا ذہن کھنڈر میں بدل جاتا۔ وہ اپنی باتوں سے مجھے مسلسل ہلاک کر رہی تھی تاہم میں نے اُسے اس کی ذات کا اعتماد بخشنے کا عمل جاری رکھا۔ اس موقع پر اس سے یہ کہنا بے وقوفی تھا کہ اس نے آخر اتنا بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ چھاؤنی میں میری آزادی کے لیے دنیش بپھرا ہوا گیا تھا، سادھو بھی گئے تھے۔ خود میں نے کوئی بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی بہت تھا مگر دنیش کے چھاؤنی جانے، سادھوؤں کے احتجاج کرنے، اپنے باپ کے سامنے رتنا کے فریاد کرنے اور میرے انکار کرنے سے زیادہ تیز اور موثر طریقہ پارو نے اختیار کیا تھا۔ اس نے انگریزوں کی فکر کا رخ موڑ دیا تھا۔ اس نے ان کی سوچیں منتشر کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ وہ اپنی داستان کا آخری حصہ سنا سکے مجھے سختی سے دو چار نہ کرتی تو میں اس کی انگلیاں کاٹ کے رکھ دیتا۔ اس کے تلوے چاٹتا۔ جن تلووں سے وہ کھنڈروں کی طرف گئی تھی کتنے کانٹے چبھ گئے ہیں۔ پارو کو اس عالم میں کوئی دیکھ لیتا تو یقین نہ کرتا۔ وہ شہزادی جس اتنی گرد! اس پر مچلتے ہوئے ریشم اس کے بدن پر سجنے کی آرزو کرتے۔ اُسے ریشم کی ضرورت نہ زیور کی۔ وہ خود ہی ریشم خود ہی زیور۔ اس کا بدن [illegible] وہ اندھیری رات میں ایک آوارہ شخص کے لیے کتنی دور چلی گئی۔

"تم کیا سمجھتے ہو؟ مجھے تم دیکھ کے" وہ لرزاں آواز میں بولی۔

"نہیں۔ میں اب اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہوں اور اپنے دماغ سے سوچ سکتا ہوں۔" میں نے وارفتگی سے کہا۔ "پارو تم اپنا اعتماد بحال رکھنا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو فکر مت کرنا۔ تم اکیلی نہیں جاؤ گی۔ ہم تماشا کرتے ہوئے جائیں گے۔ شانے چھوڑتے ہوئے جائیں گے۔ ممکن ہے وہ ابھی تم پر قطعی الزام عائد کرنے میں دیر لگائیں۔ اس وقت تو ہمیں اپنے دل کی تمام حسرتیں نکال لینی چاہئیں۔ ایک دن تمھیں بھی مرنا ہے مجھے بھی۔ آگے پیچھے کی بات ہے۔ پارو! موت سے مت ڈرو۔ تم اکیلی نہیں جاؤ گی پارو!"

"اوہ موہن!" اس کے گالوں پر خون جھلک پڑا۔ "مجھے یہی فکر تھی۔ یقین کرو یہی فکر تھی کہ تم یہ سُن کے نہ جانے کیا کہو گے۔ کس تاثر کا اظہار کرو گے۔ تمھاری باتیں میرے کانوں میں رس ٹپکا رہی ہیں۔ میں یہی سننے کے لیے مضطرب تھی۔ مجھے اپنا انعام مل گیا۔ میں اب نہیں ڈرتی۔ میں فکر نہیں کرتی۔ تمھارے بازو میری فصیل ہیں۔ تمھارا جسم" وہ میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ "تمھارا جسم میرا قلعہ ہے۔"

"سنو پارو! کل نہ جانے کیا وقت آ جائے۔" میں نے گرم لہجے میں کہا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں جس نتیجے پر پہنچا تھا تمھاری روداد سننے کے بعد اسے مزید تائید حاصل ہو گئی ہے۔ میرے دل میں تمھارے بدن پر بے شمار لمحے ثبت کرنے کی آرزو محفوظ ہے۔ تم اسے قرض سمجھنا۔"

"موہن! تمھارا یہ عہد قرض کی واپسی ہے۔" وہ سرشاری سے بولی۔ "مگر تم کس نتیجے پر پہنچے تھے؟ میں سننے کے لیے بے تاب ہوں۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارے اینگلو انڈین پولیس افسر ٹیلر پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟" میرے لہجے کی گمبھیرتا سے وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

"غلاموں کی حد تک۔ اُسے پولیس میں ہمیش چند نے بھرتی کرایا تھا تاکہ وہ بھون کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ اینگلو انڈین بھی وہ محض نام کا ہے ویسے وہ گوالیار کے ایک غریب اور اچھے خاندان کا فرد ہے۔ اس کے خاندان پر ہمیش چند کے بے پناہ احسانات ہیں مگر اس کے اور ہمیش کے تعلق کی خبر میرے سوا کسی کو نہیں ہے۔ پولیس افسری سے پہلے ہم نے احتیاط کے طور پر اس سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ اب وہ صرف اہم باتوں کے لیے رابطہ قائم کرتا ہے۔ ہمیش چند کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں نے اس پر اس سے زیادہ مہربانیاں کی ہیں۔ اسی لیے اس کی موت کے بعد اب بھی وہ مجھ سے متعلق ہے۔"

"تم نے ایک بار کہا تھا کہ وہ تمھارا احترام کرتا ہے گو تم سے اس کے

مراسم نیازمندی سے زیادہ نہیں ہیں۔ اگر وہ نوجوان ہے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تم سے قربت کے بہانے تلاش کرتا ہوگا۔ اس کے دل میں تمہارے متعلق کسی اور طرح سوچنے کا کوئی گوشہ ضرور ہوگا۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"میں برنائے مصلحت تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم وہ گوشہ اُجاگر کرنے کی کوشش کرو پھر اس کی غلامی میں ایک اور جذبہ بھی شامل ہو جائے گا۔"

"تمہارا خیال صحیح ہے۔ وہ اپنے فرو مایہ ماضی اور میری آقایانہ حیثیت کے باعث کبھی اظہار کی جرأت نہیں کر سکا لیکن وہ بہر حال ایک نوجوان آدمی ہے۔ باتیں کرتے ہوئے فوراً اُس کے چہرے پر رنگ آ جاتے ہیں، لہجہ اٹکنے لگتا ہے اور وہ ایثار پر آمادہ رہتا ہے۔ مگر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں اس پر ایک نہایت اہم ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں۔ وہ گولی چلاتے اور خون بہاتے ہوئے جھجکتا تو نہیں ہے؟"

"جمیش چند ایسے آدمیوں کو اپنے گرد نہیں پھٹکنے دیتا تھا جو جھجکتے ہوں لیکن وہ ایک پولیس افسر ہے اور ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم اُسے پولیس کی ملازمت میں برقرار رکھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کی برقراری پر کوئی حرف نہیں آئے گا بشرطیکہ اس نے جرأت اور ذہانت کا ثبوت دیا۔ اگر وہ جھجکتا ہے تو تم اپنے رویے سے اس کا گریز دور کر سکتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ڈیوٹی بڑی حویلی میں تبدیل کرا لے۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔ "ویسے یہ مشکل نہیں ہے۔ پولیس کے جو نئے دار افسران یہاں تعینات ہیں، انھیں بڑی حویلی جانے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ ٹیلر معائنے کے لیے وہاں بھی جاتا رہتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو اور اچھی بات ہے۔ پھر اُسے اپنا زیادہ وقت وہاں گزارنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "تم اُسے اپنی شہ ذاتیت کے معاوضے کے علاوہ فی آدمی دس ہزار روپے کی پیش کش کر سکتی ہو۔"

"تم پہیلیاں کیوں بجھواتے ہو؟" وہ تشویش سے بولی۔

"دیکھو پارو!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تمام وارداتوں کا الزام مہاراجا کے نظم و نسق پر عائد ہوتا ہے اسی لیے وہ انگریزوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلانے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں آزما رہے ہیں۔ وہ اپنے روٹھے ہوئے ستاروں کو منانے کے لیے ضروری نہیں کہ ہر فیصلہ درست ہی کریں۔ یہ انتشار بھی ہو سکتا ہے، ایک دن انگریز مہاراجا سے بے رخی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اُس وقت انتخاب کا مسئلہ آئے گا اور انتخاب کسی شخص کا ہوگا جو انگریزوں کی نظروں میں کتے کی خصلت رکھتا ہو۔ جگت دیپ میں یہ خصلت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بڑی حویلی میں جگت دیپ کے بعد اس کے چھوٹے بھائی اور دوسرے افراد انتخاب کے وقت موزوں یا قطعاً نہیں سمجھے جا سکتے۔ جگت دیپ دنیش کو ہم سے دور کرنے کے لیے متعدد کوششیں کر چکا ہے۔ تم خود اس کی گواہ ہو۔ ہمیں ٹیلر کو آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ جگت دیپ کو ختم کر دے۔ چاہے وہ ایک لاکھ روپے انعام میں لے یا اس سے زیادہ۔ چاہے تمہیں ایک آدھ بار اپنی مرضی کے



خلاف اس سے لگاوٹ کا اظہار کرنا پڑے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہاری خوشبو سونگھنے کے لیے آمادہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے آنے والے دنوں میں تمہاری قربت کا تصور بہت نشہ انگیز ہوگا۔ میں کوئی اور بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں صرف نتیجے کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے لیے تمہارا مثبت رویہ ہی بہت زہریلا ہوگا۔"

"اور اگر ٹیلر اس پر آمادہ نہ ہوا؟"

"گویا تم ٹیلر کے بارے میں اپنے اعتماد کی نفی کر رہی ہو؟"

"میں اُسے آمادہ کرنے کی کوشش کروں گی۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"یہ تمہارا کام ہے۔ اس سے کہنا اگر جگت دیپ اس کے نشانے پر آ رہا ہو تو بڑی حویلی کے دوسرے افراد کا نشانہ لینے سے نہ چوکے۔ میں سمجھتا ہوں اس میں ذرا سی بھی جرأت اور عقل موجود ہے تو وہ یہ کام آسانی سے کر لے گا۔"

"بڑی حویلی کے دوسرے لوگوں کے خون سے کیا حاصل ہوگا؟"

"بہت کچھ۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "بہت کچھ۔ بنیادی مسئلہ جگت دیپ کو ختم کرنا نہیں ہے، اُسے اس کے ارادوں سے باز رکھنا مسئلہ ہے۔ ایک پریشان حواس باختہ متزلزل متذبذب غم زدہ خوف زدہ جگت دیپ بے اثر ہوگا۔ اب تم بچوں کی طرح مجھ سے تشریح مت چاہو۔ ذہن پر زور ڈالو۔"

بات پارو کی سمجھ میں آ گئی پھر اس نے مجھ سے مزید شرح و تعبیر نہیں چاہی۔ راہداری میں نکلنے سے پہلے اس نے دروازے سے جھانک کے اطمینان کر لیا کہ کوئی موجود تو نہیں ہے۔ میں جلدی میں وداعی رسم بھی انجام نہیں دے سکا۔

دنیش کے ارد گرد مجمع کے تمام لوگ موجود تھے۔ ان میں پریت بھی تھی۔ عجیب بات ہے کہ سب سے پہلے اسی پر میری نظر گئی۔ میرے داخل ہوتے ہی ان کے درمیان ہونے والی زور و شور کی گفتگو پر چند ثانیوں کے لیے سکوت کی مہر لگ گئی۔ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں جیسے میرے آنے سے اچانک ان کا موضوع بدل گیا ہو اور شک سے وہ مجھے گھورنے لگے ہوں۔ میں نے اسے اپنے لیے نیک فال سمجھا۔ کسی ملازم کی پذیرائی کچھ کم بات نہیں تھی البتہ پریت نے منہ پھیر لیا لیکن اس کی آنکھوں سے اٹھنے والی چنگاریاں اس کے باوجود میرے جسم میں چبھتی رہیں۔ وہاں بیٹھنے کے بجائے میں اس کمرے میں آ گیا جس کی دیواریں مجھے خوب پہچان گئی تھیں۔ ابھی مجھے کمرے میں آئے ہوئے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ مرشنا چند مجذوبانہ انداز میں مجھے پکارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں نے اُسے رسمی تعظیم دی۔ "مہاراج! ہم تمہیں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتے پھرے۔ اب تو تم ٹھیک ہو نا؟" وہ تیز

لہجے میں بولا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے؟" وہ زیرِ لب مسکرا کے بولا۔

"کون سا وعدہ؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بھول گئے؟" وہ ناگواری سے بولا۔ "ہم نے تم سے اپنی بے چینی کا اظہار کیا تھا اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم ہماری مدد کرو گے۔" میں نے پھر بھی یہ ظاہر کیا کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ وہ مچل گیا۔ "ہم آج کل بہت پریشان ہیں۔ تمھاری بیماری کے دوران میں بھی ہم نے اسے کئی بار طلب کیا، وہ نہیں مانی تو ایک بار خود بھی گئے۔ اس نے توجہ نہیں کی۔ اب تم ہی کچھ کرو موہن!"

"آپ ترنم کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں اسی کی اور کس کی۔ اسی قاتل کی، اسی ظالم کی موہن! جتنا وہ انکار کرتی جاتی ہے ہمارا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ ہم نے تم سے کہا تھا کہ ہم اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ تم اس تک ہمارا اضطراب، ہمارے جذبات، ہماری پیشکش منتقل کرو گے۔ خیر تمھیں اس عرصے میں اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ ہم تمھارے تندرست ہونے کے منتظر تھے۔ تمھارے سوا ہمیں امید کی اور کوئی کرن نظر نہیں آتی۔"

"راج کمار رشیش چندر!" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "آپ اس کا خیال چھوڑ دیجیے۔ بہتر ہے کہ کسی اور سے دل لگائیے۔"

وہ میرے اس تخاطب پر جز بز ہوا لیکن پھر فوراً سنبھل کے بولا۔ "کیا تم نے اس سے بات کی تھی؟ اس نے کیا جواب دیا؟"

"اس نے انکار کر دیا۔" میں نے بے لوچ آواز میں کہا۔ "اور کہا کہ وہ کسی اور کی طلب گار ہے۔ اس نے کسی اور سے عہد کر رکھا ہے۔ راج کمار رشیش سے کہیے کہ وہ ہمیں نادم نہ کریں۔"

"کسی اور کی طلب گار ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔ "وہ ایک طوائف ہے۔ کیا وہ یہاں عہد و پیمان نبھانے آئی ہے۔ وہ اپنا پیشہ، اپنا کام بھول گئی۔"

"وہ ایک مختلف لڑکی ہے راج کمار! اس نے اپنا ماضی ترک کر دیا ہے۔ طوائفوں طوائفوں میں بھی تو فرق ہوتا ہے جس طرح آدمیوں آدمیوں میں۔ آپ میں اور مجھ میں، آپ میں اور راج کمار دنیش میں کتنا فرق ہے۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ بھڑک اٹھا۔

"راج کمار رشیش چندر!" میں نے ترشی سے اسے مخاطب کیا۔ "حیرت ہے آپ کو اس نازک وقت میں یہ شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔ ریاست میں غدر بپا ہوئی ہے۔ بھون کی حرمت تک معرضِ خطرے میں ہے۔ اس چار دیواری میں مسلح پولیس اور گورے موجود ہیں۔ آپ کا بھائی دنیش اس بھون کی آبرو بچانے کے لیے کوشاں ہے اور آپ اس کا سہارا بننے کے بجائے راگ رنگ میں مبتلا ہیں۔ آپ کی یہ عمر کچھ سیکھنے اور سمجھنے کی ہے۔ کل آپ کے کاندھوں پر بھاری ذمے داری پڑ سکتی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ ترنم ایک دوسرے انداز کی لڑکی ہے۔ آپ کو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تم... تم! ہم سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" اس کی آواز شدتِ غضب میں لرزنے لگی۔ "دنیش چندر نے تمھیں ہماری دل جوئی کرنے کے لیے ملازم رکھا ہے۔ ہم ہم تمھیں اس گستاخی کی سزا دیں گے۔ تم ہمیں مشورے دے رہے ہو؟ ہم اس لڑکی کو ضرور حاصل کریں گے۔"

"آپ غلطی کریں گے۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔

"ہم راج کمار دنیش چندر کے سامنے جائیں گے۔ اس بھون پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے۔ ہم اس لڑکی کو کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔"

"میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ آپ کی ایسی کوئی حرکت بدترین نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔ آپ بہت بڑی غلطی کریں گے راج کمار رشیش چندر! بہتر ہے کہ آپ بڑے پن کا ثبوت دیں۔ خود کو کانٹوں میں مت گھسیٹیے۔"

"تم۔ تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو؟"

"میں آپ کو متنبہ کر رہا ہوں، اسے دھمکی مت سمجھیے، حقیقت سمجھیے۔ آپ مہاراجا پرکاش چندر اور ریاست رام پور کے ایک معزز خاندان کے فرزند ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ریاست میں بسنے والے غریب لوگوں پر اپنے فیصلے، اپنی خواہشیں ٹھونسیں، آپ انھیں کتوں کے آگے ڈال دیں۔ آپ جو چاہیں سیاہ و سفید کرتے پھریں۔ اس طوائف نے توبہ کر لی ہے اور خود کو کسی ایک شخص سے متعلق کر دیا ہے۔ وہ آپ سے درخواست کر چکی ہے۔ میں آپ سے درخواست کر چکا ہوں مگر آپ کو اپنے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے۔ آپ مجھے ایک شرم ناک کام کا معاوضہ دے رہے تھے اور یہ بھول گئے تھے کہ میرے بازوؤں میں طاقت، منہ میں زبان اور رگوں میں خون موجود ہے۔"

"زبان بند رکھو حرام زادے! ہم تمھیں ابھی نکال دیں گے۔ جاؤ۔ ہم کہتے ہیں ہم دوبارہ تمھاری صورت یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہاں جو آتا ہے اسے یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اس کا سب کچھ ہم نے خرید لیا ہے۔ یہ ہماری شرط ہے۔ یہ شرط منظور نہیں ہے تو جاؤ، سڑکوں پر بھیک مانگو۔" اس نے طیش میں اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔

میں نے اس کی کلائی درمیان ہی میں پکڑ لی۔ "راج کمار رشیش چندر! اپنے آپ کو قابو میں رکھیے۔" اس کا ہاتھ جھٹک کے میں نے غصے سے کہا۔ "آپ کی عزت مجھے خود سے زیادہ عزیز ہے۔"

"ہم تمھیں شوٹ کر دیں گے۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا اور اس نے پستول نکال لیا۔ "اس سے پہلے کہ ہم تمھارے گندے خون سے یہ فرش خراب کریں، ہم تمھیں حکم دیتے ہیں کہ ابھی اور اسی وقت یہ بھون چھوڑ دو۔"

"صرف فرش ہی خراب نہیں ہوگا راج کمار! اور بھی بہت سی چیزیں خراب ہو جائیں گی۔ پستول جیب میں رکھ لیجیے اور غصے پر قابو پانے کا سلیقہ سیکھیے۔"

"ہمیں گولی چلانا آتا ہے موہن داس! نکل جاؤ۔" وہ چیخ کے بولا۔ "نکل

سے نکل جاؤ، تمہیں پھر موقع نہیں ملے گا۔"

"اور نہیں گرو! کہنا آتا ہے راج کمار!" میں نے سکون سے جواب دیا۔ "آپ کو بھی پھر موقع نہیں ملے گا۔ جائیے، واپس جائیے اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔" وہ لرزنے لگا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنے آبا کی طرح موقع کی نزاکت دیکھ کے چپ چاپ چلا جائے گا مگر لے غلام بستے کے طور نہیں آتے تھے۔ موٹا پختہ تھا۔ اس نے تمنچہ تان لیا اور اس وقت بھی مجھے ایک بار اور نکل جانے کی رعایت دی۔ میں نے اس کے تیور پہچان لیے تھے۔ اس کے گھوڑا دبانے سے پہلے میں تیزی سے دو قدم بڑھ کے اس کے نزدیک ہو گیا۔

"چلائیے گولی!" میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ وہ میری اس پیش قدمی پر گڑبڑا گیا۔ پستول میرے سینے پر لگا ہوا تھا اور میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔ اس کی نظریں زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکیں۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ یہی لمحہ تھا جب میں اپنے بائیں ہاتھ کو جنبش دے کے پستول اس کے ہاتھ سے چھین سکتا تھا۔ میرا ہاتھ ٹھیک اس کے پہنچے پر پڑا۔ اس نے گھبرا کے گھوڑا دبا دیا۔ گولی چل گئی اور دیوار میں سوراخ کر گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا پستول فرش پر پڑا تھا۔ باہر ایک شور اٹھا۔ دنیش ایک لمحے کی مدت میں بھاگتا ہوا اندر آیا۔ یہ نظارہ دیکھ کے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پستول نریش چندر کے پیروں کے نزدیک پڑا ہوا تھا۔ اسے اٹھانے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ میں نے ہی یہ جرأت کی۔ اسی اثنا میں دنیش چندر ہم دونوں کے درمیان آ گیا تھا۔ میں نے پستول واپس کرنے کے لیے نریش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اسے پھرتی سے اچک لیا اور دوبارہ تان لینے کا ارادہ کیا مگر دنیش نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ "ہم اسے گولی مار دیں گے۔ یہ گستاخ ہماری توہین کرتا ہے۔ اسے برطرف کرو دنیش چندر! ہم اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ کمینہ ہمارے منہ آنے لگا ہے۔ حرام کا بچہ۔ حرام کا پلا۔" وہ پھر مجھ سے بولا۔

مہارانی مایا دیوی نے آگے بڑھ کے نریش کو پکڑا اور اس کا کاندھا جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "نوکروں سے اس طرح بات کرتے ہیں؟"

"رانی ماں! آپ ہٹ جائیے۔ کیا یہ رہے گا بھون میں یا ہم۔" وہ مایا دیوی کو دھکا دیتے ہوئے بولا لیکن مایا دیوی لڑکھڑا کے دوبارہ اس کے پاس پہنچ گئی۔

"پاگل ہو گئے ہو؟" وہ برہمی سے کہنے لگی۔ "نوکر پہ ہتھیار اٹھاؤ گے؟ کیچڑ منہ کو لگ جائے گی۔ کچھ خیال کرنا چاہیے۔"

"یہ نوکر نہیں ہے۔ یہ ہمارا آقا ہے۔ ہمیں شرم آتی ہے۔ یہ ہمارے سر پہ بیٹھا ہوا ہے اور یہ سب آپ کے چہیتے دنیش چندر کی وجہ سے ہے۔ اب یہاں تک ہو گا کہ نوکر ہمیں بات کرنے کی تمیز سکھائیں گے۔"

"کیا بات ہے نریش؟" دنیش نے تحمل سے کہا۔ "ہمیں پوری بات تو بتاؤ۔" اس نے اپنے چھوٹے بھائی کی گردن میں بے تکلفی سے ہاتھ ڈال دیا۔ "اتنا غصہ نہیں کرتے۔"

اس شخص کی زندگی فضول ہے جو دنیا میں صرف کچھ حاصل کرنے کے لیے جیتا ہے۔ دوسروں کو کچھ دینے کے لیے بھی جیو۔

✱

اچھا بیٹا وہ ہے جو اپنے والدین کو خوش رکھے۔ اچھی بیوی وہ ہے جو ہر حالت میں اپنے خاوند کا بھلا چاہے۔ سچا دوست وہ ہے جو دکھ اور سکھ دونوں میں شریک رہے۔

✱

فنون، سائنس، تجارت اور صنعت کے میدانوں میں جو لوگ بلندی پر پہنچے ہیں وہ اپنی ناکامیوں سے سبق حاصل کر کے وہاں پہنچے ہیں۔ انھوں نے اپنی ناکامی کو کامیابی کی سیڑھی بنالی۔

"اب ہمیں بات بھی بتانی پڑے گی؟" وہ اشتعال میں بولا۔ "سن لیجیے راج کمار دنیش! اسے ہماری توہین پہ انعام و اکرام دے کے رخصت کر دیجیے۔ ہم کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ ہمارا مطالبہ ہے۔"

"نریش!" دنیش نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم تمہارا مطالبہ تسلیم کر لیں گے مگر ذرا صبر! ایک ذرا سکون قائم رکھو۔"

"آپ کے اس وفادار کتے کی موجودگی میں ہمیں صبر نہیں آ سکتا۔ یہ گستاخ آدمی دیکھیے بغیر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔" وہ طنز اور نفرت سے بولا۔ "آپ اسے فوراً نکل جانے کا حکم دیجیے۔"

دنیش نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ بھون کے وہ تمام لوگ جو ملاقاتی کمرے میں موجود تھے اب حلقہ بنا کے ہمارے گرد کھڑے ہو گئے تھے اور سبھی نریش کو صبر و ضبط کی تلقین کر رہے تھے مگر نریش اور بگڑتا جا رہا تھا۔ درمیان میں کماریاں بھی بول پڑیں۔ "نوکر کی بات پہ اتنا غصہ؟" کیرت نے رنگ کے کہا۔ "بس اب من بھی جاؤ۔"

میں نے وہ حلقہ توڑ کے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ کماریاں میرا ارادہ بھانپ کے نفرت زدہ انداز میں مجھے راستہ دینے کے لیے پیچھے ہٹ گئیں۔ دروازے کے قریب دنیش کی بلند آواز نے میرے قدم پکڑ لیے۔ "ٹھیرو منی رام! ابھی نہیں جاؤ گے۔"

دنیش کی آواز سے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ "نریش اور دوسرے لوگ چلے جائیں۔" خود دنیش ہی نے یہ سکوت توڑا مگر نریش اب بے لگام ہو گیا تھا۔ مہارانی مایا دیوی اور راج کماریوں کو شاید اب صورت حال سنگین ہونے کا شدت سے احساس ہوا۔ نریش اپنے بڑے بھائی اور بھون کے سربراہ دنیش کو نہایت نازیبا لہجے میں مخاطب کر رہا تھا۔ کسی میں بھی دنیش کے برابر کا حوصلہ نہ تھا کہ جھک سکتا تھا۔ پھر ایک ساتھ کئی آوازوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ باہر چلے۔ وہ پیر پٹختا اور گڑگڑاتا رہا مگر وہ اسے کھینچ تان کے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں ایک پیالے کے ساتھ چپ کا گھرا رہا۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ سب غلط ہوا ہے یا صحیح۔ ملاقاتی کمرے سے دھیمے شور کی آوازیں ادھر آ رہی تھیں۔ نریش نے بھی نامناسب باتیں کہہ دی تھیں۔ میں آئی کہ سب کو ترک کر کے چلوں لیکن دنیش

بیچارہ وہ اسے پر کھڑا نظر آیا۔ جیسے وہ شکایت کر رہا ہو تم نے بھی سریش کی تقلید کی۔ کاش میں کچھ دیر اور پیارے کے پاس ٹھہر جاتا۔ مگر یہ واقعہ تو کسی وقت بھی رونما ہو سکتا تھا۔ آدمی ہر وقت موہن داس تو نہیں ہوتا۔ کبھی شودا آدمی بھی بن جاتا ہے۔ میرے منہ میں کڑواہٹ سی گھلنے لگی اور مجھے یہ افسوس ہوا کہ جو ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا نہیں ہوا؟ میں اس میں تفریق نہیں کر سکتا تھا۔ بس کسی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک خلش دل میں باقی رہ گئی تھی۔

میں دنیش کا منتظر تھا۔ اس وقت تو کچھ محسوس نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ بے شمار خیالوں نے مجھ پر یورش کر دی۔ ہم سب ایک سرایا میں رہتے تھے۔ میں نے خود کو ٹٹولا کیا پچھتاوا ہو رہا ہے؟ نہیں کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ سریش چند کو اس عمر میں ایسے رویوں کا تجربہ ہونا چاہیے۔ زمانہ گزر گیا ہے آنے والا زمانہ اور بھی تلخ ہوگا۔ ضروری ہے کہ پہلے سے گنجائش پیدا کر لی جائے ورنہ بعد میں بڑی تکلیف ہوگی۔ سارا تماشا یہ ہے کہ لوگ توقعات کچھ اور کرتے ہیں، ہو کچھ اور جاتا ہے۔ توقع کی تکمیل اور نا تکمیل ہی میں ساری خوبی، ساری خرابی مضمر ہے۔ اب جو ہو چکا تھا اس کے بعد مزید کچھ ہونے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ سریش سے بلند آواز میں بات کرنے کی جسارت بے سبب نہیں کی گئی تھی۔ وہ لوگ اب بھی موجود تھے جو گفتگو کا موضوع بنتے تھے۔ ایک بار انھیں سائبان میں کھڑا کر کے دوبارہ دھوپ میں نہیں دھکیلا جا سکتا تھا۔

دنیش چند کو آنے میں وقت لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ سریش نے کچھ زیادہ ضد اختیار کر لی تھی۔ پھر مجھے دنیش کو کمرے میں موجود پا کے خوشی ہوئی۔ "مجھے ڈر تھا۔" وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم کہیں مجھے پریشان نہ کرو۔" میں نے سر جھکا لیا۔ "وہ سنبھلا نہیں۔" دنیش تاسف سے بولا۔ "وہ چلا گیا۔"

"چلا گیا؟ کہاں چلا گیا؟" میں نے اچھل کے کہا۔

"اس نے شرط عائد کر دی تھی کہ یا تو تم بھون میں رہو گے یا وہ۔ میں نے اُسے سمجھانے کی امکانی کوشش کی۔ پھر خاموشی اختیار کر لی اور وہ چلا گیا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس موقع پر کیا کہوں۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "مجھے یقین ہے اُس نے تمھیں خاصا برہم کر دیا ہوگا۔ تمھیں میں اس سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"ہاں۔" میں نے اداسی سے کہا۔ "مجھے اس کی بات بہت بے وقعت لگی۔ اس نے خیال ہی نہیں کیا کہ کس سے کیا بات کرنی چاہیے لیکن یہ برا ہوا۔ وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

"اب جانے دو۔" وہ اکتا کے بولا۔ "یہ اچھا ہی ہوا۔ میں نے آج اس کے عجب تیور دیکھے۔ ساتھ ہی اور بھی بہت سے لوگوں کے چہرے نظر آ گئے۔ چھٹائی ہو ہی جانی ہے موہن!"

"مگر بھون میں آپ کا یہ عمل ناپسندیدہ قرار دیا جائے گا اور ریاست میں بڑی رسوائی ہوگی۔" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

اس نے منہ بنایا۔ "ہوا کرے۔ مجھے اپنے فیصلے پر خوشی ہے۔ بھون میں سریش

اس کی قسم کے لوگ نہیں رہتے تھے اور میں یہاں کے معاملات اس سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس نے یہاں سے جانے کے کم سے کم یہ ضرور جتا دیا کہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہو سکتا ہے۔ یعنی اُن سب کے لیے ہے کہ جو میرے فیصلوں پر ناخوش ہو وہ یا تو خاموش رہے یا کہیں اور چلا جائے۔ سوال کیا گیا تو جواب دینا پڑے گا موہن!"

"میں اس واقعے سے پہلے خود آپ سے یہی کہنے والا تھا۔ ہم بھون میں یا ریاست کی موجودہ صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کے کچھ اصلاح کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے کہنے والا تھا کہ ہمیں کم سے کم ایک طرف سے ضرور مطمئن ہونا چاہیے۔ بھون کے ان سانپوں سے مطمئن ہونا چاہیے جو ہماری آستینوں میں پلے ہوئے ہیں۔ میں نے طے کیا تھا آج آپ کو اختیارات سختی سے استعمال کرنے کی رائے دوں گا اور اگر آپ نے نرمی کی تو میں آپ سے اپنے تعلق کے استحکام میں خود پیش قدمی کروں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اتفاق کر کے ان لوگوں کے سامنے ایک مختلف رویے کا اظہار کیا اور سریش سے نسبتاً اونچی آواز میں بات کر لی۔ وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکا۔ بات بگڑنی تھی، بڑھ بہت گئی۔"

"او موہن جانے دو۔ مجھے آج تمھارا یہ انداز بہت دل کش لگا۔ میں تو تم سے پہلے ہی کہتا تھا کہ بھون میں تمھارا باقاعدہ منصب مقرر کر دیا جائے اور منصب کی کیا ضرورت ہے۔ دوستی خود ایک منصب ہے۔ تم نے نوکروں کا روپ اختیار کیے رکھا اور اپنی توہین کرتے رہے۔ اپنے آپ کو چھپاتے رہے۔ نہ جانے اس میں تمھیں کیا مزہ آتا تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اس وقت حالات ہی ایسے تھے۔"

"وہ کیا حالات تھے یہ میں آج تک نہیں جان سکا۔ تم نے کچھ نہیں بتایا۔ پتہ نہیں وہ کون سے اسباب ہیں جو تمھاری زبان پر تالا لگائے ہوئے ہیں اور تم مجھے بھی نہیں بتا سکتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو مجھے ایک محرومی سی ہوتی ہے۔ کم تری کا ایک احساس۔"

"ایسے نہیں نہیں دنیش بابو!" میں نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ "میں آپ کو بتاؤں میرا ماضی کوئی ایسا قابلِ ذکر نہیں ہے اور میں اسے بھولنا بھی چاہتا ہوں۔ میں نے وہ دروازہ ہی بند کر دیا ہے جو پیچھے کی طرف کھلتا تھا۔ اب اسے نہ ہی کھولیں تو بہتر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ آپ کو یہ تسلیم کرنے میں کیا اعتراض ہے؟ ورق الٹ دیا ہے۔ سامنے کے صفحے پر سب کچھ نظر آ رہا ہے تو پچھلا ورق لوٹنے کی زحمت کیوں کی جائے۔ کیا آپ مجھے بہ تمام و کمال نہیں سمجھ رہے ہیں؟ کیا میری زبان میری ترجمانی نہیں کر رہی ہے؟ میں تو آسان زبان میں کہہ رہا ہوں۔"

"کچھ اور نہیں تو تمھاری تقریریں بہت آسان اور دل کش ہوتی ہیں۔" وہ مسکرانے لگا۔ "یہ بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟"

"بے حد اچھی۔" میں نے اکڑ کے کہا۔

"آرام کرو لالا۔ اتنا مت اکڑو۔"

"آپ کتنے کمال آدمی ہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔

...ں چند ریاست میں اپنے کسی عزیز کے ہاں نہیں گیا وہ بڑی حویلی پنجک دیپ کے ہاں چلا گیا۔ اس طرح اُس نے بھون کے اُن لوگوں میں دنیش کو سرِ گروہ کیا جو اُس کے خاموش فیصلے پر جز بز نظر آتے تھے تمام ہی کو یہ خبر مل گئی میں دنیش کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ دنیش کا ردِ عمل جاننے کے لیے ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ دنیش نے کوئی تبصرہ نہیں کیا وہ دوسرے موضوعات پر باتیں کرتا رہا اور اُس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”کیوں موہن! تمھارے خیال میں بھون میں کتنے دنوں تک مستعد سپاہیوں کا پہرا رہے گا؟“

میں اس اچانک تخاطب کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان لوگوں کے سامنے والے بیٹھتے ہوئے شرم سی آئی۔ ”میرا خیال ہے، یہ مدت طویل ہو سکتی ہے خاصی طویل۔“ میں نے کچھ جھجک کے ساتھ سنجیدگی سے کہا۔ ”میں آپ کے توسط سے بھون کے معززین سے درخواست کروں گا کہ یہ ان دنوں نہایت محتاط رہیں۔“

”بے شک بے شک۔“ دنیش نے سر ہلا کے تائید کی۔

”اور بہتر ہے ان دنوں بھون سے باہر جانے سے گریز کیا جائے اور اگر کوئی مجبوری ہی پیش آ جائے تو باہر جاتے وقت آپ کو مطلع کر دیا جائے۔“ میں نے سنبھل سنبھل کے کہا۔

”یوں کہو کہ بھون کے مفاد کے پیشِ نظر اسے بھون کے سربراہ کا حکم سمجھا جائے۔“ دنیش نے لقمہ دیا۔ ”حکم عدولی کی صورت میں بھون کے سربراہ کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے۔“

”باہر خطرے کی بھنک ہے ہمیں بلا کدورت آپس میں اتحاد کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ متحد ہو کے ہم یہ بُرا وقت ٹال سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

میری اس لے نے ذرا اور دنیش کا بدلا ہوا انداز بیان لوگوں کے لیے اجنبی ضرور ہوگا۔ یہ دنیش چندر کے بڑے بھائی ہمیش چندر کا لہجہ تھا جس سے اُن کے کان آشنا ہو گئے تھے۔ بھنوؤں پر شکنیں پڑ گئیں۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو طنز کی نظر سے دیکھا۔

”ہم اس سے پہلے بھی بھون میں یہ اعلان کر چکے ہیں کہ موہن داس ہمارا نوکر نہیں، دوست ہے نہ یہ ہمارا نائب ہے اور نہ کوئی عہدیدار ویسے اسے نیابت کا تمام تر حق حاصل ہے اور اسے تمام عہدے ملے ہوئے ہیں۔ یوں سمجھا جائے کہ یہ ترقی کرتے کرتے اس عہدے پر پہنچا ہے اور ہم نے اسے بھون کے مفاد میں سب سے مخلص آدمی پایا ہے۔ لہٰذا اس کی زبان سے کہے جانے والے الفاظ ہماری ترجمانی سمجھے جائیں اس سلسلے میں جنھیں ہم سے اختلاف ہے ہم اُن سے افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ انھیں ہم سے تعاون کرنا چاہیے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم دوست دشمن کی شناخت نہیں کرتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ کون یہاں ہم پر معترض ہے اور کون ہمارے دشمنوں سے دوستی رکھتا ہے۔ ہم نے بارہا انھیں اپنے کردار میں ترمیم کا موقع دیا ہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مجبوراً ہمیں اس لہجے میں بات کرنی پڑ رہی ہے۔ جو یہاں ہم سے مخلص ہیں انھیں ہمارے فیصلوں پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور جو نہیں ہیں اُن کی ہم پروا نہیں کرتے۔ ہمیں نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہماری خواب گاہ میں زہریلا دودھ رکھا گیا۔ ہمارے بستر میں سانپ چھوڑا گیا۔ ہمارے دوست پر متعدد بار گولی چلائی گئی۔ ہمارے بھائی ہمیش چندر کو قتل کر دیا گیا۔ رانی پیارا رانی آشا اور کتنے ہی لوگ بے موت مارے گئے۔ اب ہم یہ خوں ریزیاں مزید برداشت نہیں کریں گے۔ ہم نام نہیں لیتے لیکن سب جانتے ہیں کہ کون کیا چاہتا ہے۔“

”بس دنیش بس۔“ مہارانی مایا دیوی نے تندی سے کہا۔

”جو لوگ یہاں موجود نہیں ہیں ہماری درخواست ہے اُن کی خدمت میں یہ پیغام پہنچا دیا جائے۔ ہم مدت سے یہ سوچ رہے تھے کہ اپنے لوگوں کو بٹھا کے اپنی مجبوریاں بیان کریں اور اُن سے تعاون کی درخواست کریں۔ سریش کے جانے کے بعد اب یہ گفتگو ضروری ہو گئی تھی۔“

”وہ بچہ ہے واپس آ جائے گا۔“ مایا دیوی شفقت سے بولی۔ ”بچے اسی طرح ناراض ہو جایا کرتے ہیں۔ تم نے تو بہت اثر لے لیا۔“

”بچے تو اب تک ہم تھے رانی ماں!“ دنیش کی آواز سرد تھی۔

”تم جو کچھ کہتے ہو اُس سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے۔“ مایا دیوی لوگوں کو تائید طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”ہمارے لیے اس جاگیر کے عزیز اور مکھیا تمھی ہو۔ تمھی کو اب چلے باہر سے آنے والی گولیاں اپنے سینے پر روکنی ہوں گی اور تمھی ہماری حفاظت کے لیے جواب دہ ہو۔ ہم تمھاری ہر بات تسلیم کرتے ہیں۔ رہا موہن کا معاملہ تو تمھاری ہدایت پر ہم وہ بھی قبول کرتے ہیں۔ جس طرح ہم ہمارا لعل اور ہمیش چندر کے خاص آدمیوں کو قبول کرتے رہے ہیں لیکن موہن صرف تمھارا دوست ہو سکتا ہے تم اسے جبراً سب کا دوست نہیں بنا سکتے۔ موہن داس کو خود ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ہماری دوستی کس طرح حاصل کرے۔“

”وہ ثابت کر چکا ہے رانی ماں! آپ کو کچھ نہیں معلوم۔“ دنیش تنک کر بولا۔ ”ہم نے موہن داس کے پاس یہ جاگیر رہن نہیں رکھ دی ہے۔ یہ ہم پر اور ہرے سے مسلط نہیں کیا گیا ہے۔ اس نے ایک ادنا ملازم کا جو روپ اختیار کیا تھا وہ ایک فریب تھا۔ اس کی صلاحیتیں بتدریج اُبھر کے سامنے آئیں کیونکہ دوستیاں اور دشمنیاں چھپی نہیں رہتیں۔ اچھے بُرے وقت میں وہ ضرور نمایاں ہوتی ہیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے تا دیر بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ انھیں میرے بارے میں کچھ ایسی باتیں کرنی چاہئیں جن کا اظہار وہ میرے سامنے کرنے سے کترا رہی ہیں۔ پریت کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ یہ اپنا تاثر چھپانے کا سب سے عمدہ طریقہ ہے۔ مجھے کچھ کچھ یہ گمان تھا کہ پریت اور بنگ جیسے دوسرے قریبی لوگوں کو سریش کی شب سے تعلق پسند نہیں آئی۔ سریش اتنا پختہ نہیں تھا کہ وہ اُن کے دور رس مفادات کے منصوبوں میں با قاعدہ شامل ہو۔ بس وہ ایک آلۂ کار ہوگا۔ بھون میں دنیش کو ناپسند کرنے والے لوگوں نے اسے ترغیب دے کے گنتی بڑھانے کی کوشش کی ہوگی۔

اندرا کے فون پر میری نظر پڑی۔ میں نے کچھ سوچ کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔ جلد ہی میرا رابطہ راج کماری کنول سے قائم ہو گیا۔ اس نے پچھلے کے بغیر ترنم کیا۔ ”یہاں ہیں آپ؟“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”غلام کو پروفیسر راجو کہتے ہیں۔“

”اوہ موہن!“ اس کی مضطرب آواز اُبھری۔ ”تم کہاں ہو؟“

”ٹیلی فون پر۔“ میں نے شوخی سے کہا۔ ”بتائیے مجھے اور کہاں ہونا چاہیے

تھا؟" وہ ہنسنے لگی۔ میں نے کہا "آپ سے بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا"۔
"کہاں؟" اس کی آواز نے پہلو بدلا۔ "تم کہاں ملتے ہو؟"
"جیلوں میں" میں نے تیزی سے کہا۔
"ہم سب ایک طرح کی جیل ہی میں رہتے ہیں" وہ غنودگی میں بولی۔ "بس سلاخوں کا فرق ہے۔ موہن! تمھیں معلوم ہے یہاں کیا ہو رہا ہے؟"
"آپ اپنی بات کیجیے کیسی ہیں؟" میں شگفتگی سے بولا۔
"تم اپنی بتاؤ، ہم نے تمھارے بارے میں عجیب عجیب باتیں سنی ہیں"۔
"میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟"
"بُرے لگتے ہو" وہ آہستگی سے بولی۔
"چلیے فیصلہ ہو گیا۔ میں اپنے متعلق بڑی خوش فہمی میں مبتلا تھا"۔
"اب تم کیا کرو گے؟"
"میں سو جانے کی کوشش کروں گا کیونکہ سونا سب سے بڑی نعمت ہے آدمی برائیوں سے بچا رہتا ہے۔ میں گہری نیند سو جاؤں گا"۔
"ہم تمھیں جگا دیں گے بلکہ تمھیں سونے ہی کیوں دیں گے پھر زمانے سے برائیاں اُٹھ جائیں گی اور برائیاں اُٹھ جائیں گی تو کسی کا دل زندگی میں نہیں لگے گا"۔
"سوچ لیجیے۔ پھر آپ کو ہی شکایت ہو جائے گی"۔
"ہمارا جی چاہتا ہے ہم خود کو تنگ کریں، ہم بہت آرام کی زندگی گزار رہے ہیں" وہ جذباتی ہو کے بولی۔ "تم نے وعدہ کیا تھا کہ اِدھر آؤ گے؟"
"کیا تھا مگر آپ دیکھو یہی ہیں راستے میں سانپ بیٹھے ہیں۔ ہمارا جلسہ کہہ کے تمھیں بتائے کہ کچھ دنوں میں لوگ گھر سے باہر نکلنا بند کر دیں گے اور شہر پر سناٹا طاری ہو جائے گا"۔
"تمھیں کوئی سانپ نہیں کاٹے گا تم آنے کا ارادہ تو کرو"۔
"مجھے ڈر لگتا ہے ایک تو راستے پھر آپ اتنی اونچی اونچی دیواروں میں رہتی ہیں، خیال کیجیے تو ملاقات کتنے مرحلوں سے گزر کے آپ کے پاس پہنچنا پڑے گا اور پھر آپ کو دیکھ کے آپ سے بات بھی نہیں ہو سکے گی"۔
"ایک بار آ کے دیکھو۔ سنا ہے تم تو بہت جرأت مند ہو"۔
"مگر نہ جانے کیوں" میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ "آپ سے بات کر کے ساری جرأتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں"۔
"اور ہمیں یہ ایوان، یہ ریشم، یہ اطلس حقیر معلوم ہوتا ہے"۔
"تو پھر ایک دن آنا ہی پڑے گا۔ آمادگی میں البتہ دیر لگے گی"۔
"آمادگی کس امر کی؟" اس کی پُرتجسس آواز اُبھری۔
"خوف دُور ہونے کی" میں نے برجستہ کہا۔
"کاش تمھارا خوف دُور کرنے ہم خود آ سکتے"۔
"مجھے اندازہ ہے آپ کا آنا آسان نہیں ہے۔ میں روز آپ سے بات کر کے آمادگی استوار کرتا رہوں گا"۔
"دیکھو" وہ گہری سانس لے کے بولی۔ "تم پھر کسی جنگل میں گم ہو جاؤ گے"۔



"اب تم آیا یا نہ ہو"۔
"اب کیا بات ہے؟"
مجھے جواب دینا پڑا۔ "اب کچھ اور بات ہے"۔
"ہمیں نہیں بتاؤ گے؟" اس کی آواز نے چھنک لی۔
"پھر کبھی بتاؤں گا"۔
"سوچ کے جواب دو گے؟"
"جواب آپ جانتی ہیں" میں نے جرأت کی اور فون بند کر دیا۔ گری آرہا تھا۔ ریسیور میرے ہاتھوں میں جھولتا رہا۔ وہ فرنیچر صاف کرنے والی باندی تھی۔ میں نے سوچا اگر دنیش چند آجاتا تو کیا ہوتا۔ وہ میرے ہاتھ میں ریسیور دیکھ کے ضرور پوچھتا اور میں کہتا کہ راج کماری کنول کا فون ہے بلکہ خود میں نے اُسے فون کیا تھا تو اُس کا ردِعمل کیا ہوتا۔ اچھا ہوا وہ نہیں آیا ورنہ مجھے اور اپنے آپ کو آزمائش میں ڈال دیتا۔ میں نے دنیش اور اس سے متعلق بہت سے امور سامنے رکھتے ہوئے یہ سلسلہ ملایا تھا۔ میں اندازے سے حالات بدل رہے تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ میں کوئی ایسا سلسلہ جنبانی کروں۔ ان معاملات میں آدمی کو ایسے اقدام کرنے ہی پڑتے ہیں۔ وہ ریاست کی راج کماری تھی۔ حسن و شباب کی خوبیاں الگ ہیں۔ ریاست کی راج کماری دنیش کے گریز، انا اور حجاب کی وجہ تک منتقل نہیں ہو سکتی تھی اور نمائش سے اس طرح دست بردار ہوا جا سکتا تھا۔

دو دن تک محل میں غیر معمولی خاموشی رہی۔ ہائی کمان کا ایک افسر بمبئی سے بازپرس کرنے آیا تھا۔ پولیس اور چھاؤنی کے گروں نے کسی گرفتار ملزم کو رہا نہیں کیا۔ دو دن میں شاردا کی حالت میں خاصا افاقہ ہوا تھا مگر وہ ابھی اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے قابل نہیں تھی البتہ اس کا رنگ لوٹ آیا تھا۔ میں صبح و شام دنیش کے ہمراہ اسے دیکھنے جاتا تھا اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ آتا تھا۔ کچھ دنیش محل کے کسی شخص سے ملنا، ان دنوں میں باہر جانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ دنیش کے محل سے باہر نہیں نکلا تھا۔ وہاں خود آ کے مجھے دیکھ جاتی تھی اور اس کا کام تھا۔ اب وہ کبھی نہیں بولتی تھی۔ اب اس کی آنکھوں سے جبری لگی رہتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شب و روز برسات ہوتی رہتی ہے۔

چوتھے ہی دن کی بات ہے۔ ریاست ایک اور سنسنی خیز حادثے سے دوچار ہوئی۔ جگ دیپ کے دو جوان سال چھوٹے بھائی تین نوجوان جنہیں ان بھائی کے ہمراہ چرچ کی رانی کا نشانہ و غلام اور ایک باندی کسی نامعلوم شخص کی ہوا کی نذر چڑھ گئے۔ خبر کا یہ حصہ اتنا دہشت انگیز نہیں تھا جتنا یہ کہ سرخ چہرہ بھی ان کے

ساتھ ملا گیا۔ وہ سب لوگ بڑی حویلی کے ایک بڑے کمرے میں جمع تھے جہاں
کی بین رنگ پ ستار بجا رہی تھی۔ اس تقریب میں واردات کے وقت آئی جی مہتا
اور ریاست کے دوسرے پولیس افسر دنیش کے علاوہ اس کمرے میں موجود تھے۔ اس
نشست کا اہتمام میں نے ہی کیا تھا۔ پارس نے مجھے ٹیلر کی آمدگی کی اطلاع دے دی
تھی اور کہا تھا کہ آج رات کسی وقت کوئی بھی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ میں نے
حفظِ ماتقدم کے تحت دنیش سے فون کروا کے آئی جی مہتا کو بلا لیا تھا۔ بات چیت
کا موضوع واضح تھا۔ بھون کے ملازموں کی ہلاکت۔ یہ تیسری رات کا ذکر ہے۔ چوتھے
دن علی الصباح بڑی حویلی سے یہ خبر جاری ہوئی اور آگ کی طرح شہر بھر میں پھیل
گئی۔ واردات کا وقت گزشتہ رات کوئی گیارہ بجے کا تھا۔ آئی جی مہتا ساڑھے
بارہ بجے رات کو بھون سے رخصت ہوا اور ایک بجے صدر دروازہ بند کر دیا گیا تھا
کیونکہ اب کسی گشتی پولیس افسر کے آنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ ایک ہی رات
میں دس آدمیوں کا قتل؟ ریاست میں کس پیرے کے یہ واردات سُنی گئی ہوگی۔

پارس نے ایک دن قبل مجھے بتایا تھا کہ اُسے ٹیلر کو راضی کرنے میں خاصی
مشکل پیش آئی۔ اس نے انعام میں دی جانے والی رقم میں اپنی طرف سے اضافہ
کر دیا مگر ٹیلر زیادہ پارو کی نگاہِ التفات، زلفِ گرہ گیر اور جمالِ دل فروز کا
اسیر ہوا۔ پارو کہتی تھی کہ میرا قیاس انتہائی درست تھا۔ اس نے ٹیلر سے رغبت
کا صرف خفی اظہار کیا تھا کہ وہ جھٹ پٹا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں جانتا تھا کہ
ایک نوجوان آدمی پارو جیسی ماہ جمال لڑکی کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتا ہوگا۔
اس کی راتیں اس کے تصور سے آباد ہوں گی اور اسے جرأت نہیں ہوتی
ہوگی کہ وہ اس کے سامنے عرضِ مدعا کرے۔ دونوں دولتیں مل رہی تھیں مگر وہ
دیوانہ ہوگیا۔ میرا خیال ہے اس نے جگ جیب کرنے کا عزم کیا ہوگا۔ ماند ستارہ رنج
رہا تھا۔ ایک کو روشن ہوگا۔ ٹیلر نے پارو کی نظر میں اپنا درجہ بلند کرنے کے لیے
بے تحاشا گولیاں چلائی ہوں گی۔ عمدہ قسم کے آٹو میٹک ریوالور اور پستول میں نے ہی پارو کو
فراہم کیے تھے۔ بدقسمتی سے وہاں سریش موجود تھا۔ ٹیلر پر جنون سوار ہوگا بلکہ وہ
ہاتھ نہیں آیا تو اس نے ناکام واپس جانے کے بجائے پارو کی ہدایت کے مطابق جو بھی
سامنے آیا اُس پر بارود اگل دی۔ میں یہاں بیٹھا واردات کی قیاس آرائیاں ہی کر
سکتا تھا۔ پتہ نہیں ٹیلر کے ساتھ کیا حادثہ رونما ہوا۔ ایک پولیس افسر کے لیے بڑی
حویلی تا مختی عمارت میں داخلہ اور وہاں سے واپسی مشکل بات نہیں ہوگی خصوصاً
رات کے وقت۔ ٹیلر کو اپنے کام کی بہت عجلت ہوگی۔ یہ سارا معاملہ ہی ہولناکی
اور وحشت کا معلوم ہوتا تھا۔ ٹیلر نے رات کو بھون میں واپس آ کے پارو کو اطلاع
نہیں دی۔ یقیناً وہ صبح تک نہیں رہا ہوگا یا چلا گیا ہوگا یا اُس نے اس موقع پر
بھون آنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ وہ اب تک غائب تھا۔

تین دن پہلے سریش چند اپنے بھائی دنیش سے ناراض ہو کے بڑی حویلی
میں منتقل ہوگیا تھا۔ بڑی حویلی اور پرکاش بھون ایک ہی خاندان کی دو شاخیں تھیں جو
برسوں پہلے جدا ہوگئی تھیں اور اب ایک دوسرے کو نابود کرنے کے لیے معرکہ آرا
تھیں۔ سریش کے جانے کے تین دن بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ
جب وہ بدمست ٹیلر وہاں وارد ہوگا تو سریش چندر بھی موجود ہوگا۔ پارو کے چہرے
پر خاک اُڑنے لگی تھی۔ ایک تو رائی کمان کے افسروں نے اُسے مہمان کر رکھا تھا دوسرے
ٹیلر نے اس کے سبب سے اوسان چھین لیے۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی اور میں اُسے
موہوم دلاسا دے کے چلا آیا۔ نہ میں خود مطمئن ہو سکا، نہ اُسے تسلی دے سکا۔ اگر ٹیلر زندہ
تھا تو ریاست کے سراغ رسی کے ادارے بھی حرکت میں آگئے تھے لیکن یہ میری غرض
پھر ان کی نظر بھی ہو مگر آئی جی مہتا بہ نفسِ نفیس بھون میں موجود تھا اور میں اس
کے روبرو بیٹھا اس کی نکتہ آفرین باتیں سن رہا تھا۔ انگریزوں نے اس معاملے میں
زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ یہ ریاستی پولیس ہی تمام معاملے کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ انگریز
تو شاداں و فرحاں ہوگا کہ ہندوستانیوں میں آٹھ دس کی اور کمی ہوگئی۔ آپس کے یہ
اختلافات یہ بڑھ گئے۔ یہ دھوم دھڑکا ہے۔ تماشا ہی تماشا ہیں انگریزوں کے لیے یہ بڑا
دلچسپ نظارہ ہوگا۔ ٹیلر زندہ تھا اور میں نے پارو سے کہہ رکھا تھا کہ وہ جب بھی چھپتا
چھپاتا اُس سے فراغِ تحسین وصول کرنے آئے مجھے خبر دی جائے۔ میں بھی اس کا
انتظار کرتا رہا۔ پارو بھی ہلکان ہوتی رہی۔ میں نے سوچا تھا اُس مہم جو کو دنیش کی
خواب گاہ سے ملحق تہہ خانے کی ضرور سیر کراؤں گا مگر وہ نہیں آیا۔ میں یہ سوچ کے
دل تھام میں کر لیا تھا کہ وہ تو تفتیش میں سرگرم ہوگا۔ بڑی حویلی میں ایک دو پولیس
افسر تھوڑی موجود ہوں گے۔ پولیس کا ایک دستہ گیا ہے اور دوسرے افسر بھی موجود
ہوں گے۔ کیا ضروری ہے کہ ٹیلر ہی پر نگاہ جائے۔ ٹیلر اتنا بے وقوف نہیں ہوگا۔ وہ دیکھ
بھال کے اندر گیا ہوگا اور دیکھ بھال کے واپس آیا ہوگا۔

اب مجھ سے دنیش کا سامنا بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ دنیش یوں بھی مصروف
ہوگیا۔ بڑی حویلی سے سریش چند کی لاش بھون میں لائی گئی۔ خوب شور و غوغا ہوا۔
فلک شگاف چیخیں بلند ہوئیں اور اسے عزت و احترام سے نذرِ آتش کر دیا گیا۔ دنیش
سے بات نہیں کی جاتی تھی۔ مجھ سے اس کا حال نہیں دیکھا گیا۔ جس دن سریش کا
کریا کرم ہوا، میں اس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ میرا منتظر تھا۔ وہ ہر اس شخص کا
منتظر ہوگا جس کے گلے لگ کے روئے۔ میں نے اس کا سر اپنے شانوں پر رکھ لیا۔ میرے
کپڑے بھیگ گئے تھے کہ دن میں نے اس سے اصرار کر کے مہاراجا کو فون کرایا۔ مہاراجا
اور کرنل رتی پرشاد کچھ کے لیے بھون آئے تھے۔ اس دن دنیش کو ہوش ہی نہیں
تھا۔ فون پر دنیش نے مہاراجا سے درخواست کی کہ جن ملازموں پر پولیس مسلسل سختی کر
چکی ہے اور نتیجے میں اسے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے انہیں واپس کر دیا جائے تو عین عنایت
ہوگی۔ مہاراجا نے ازراہِ بندہ پروری وعدہ کیا کہ وہ متعلقہ پولیس چیف سے اس
مسئلے پر بات کریں گے۔ دوسرے دن بھون میں جو ملازم آئے وہ کام کرنے سے
معذور تھے۔ ان کے جسم لہولہان تھے، لباس تار تار، جسم ادھڑے ہوئے۔ اُن کی حالت
دیکھ کے بھون میں قیامت کا منظر نظر آیا۔ راج کمار دنیش چندر نے فی ملازم ایک ہزار
روپے کی امداد کا اعلان کیا۔ سریش کے کریا کرم کے جو تین دن بھی ٹیلر نے ادھر کا رخ
نہیں کیا۔ درمیان میں دو ایک دن کے لیے انگریزوں اور پولیس افسروں نے دونوں
خاندانوں کو سوگ منانے کے لیے کچھ رعایت دے دی تھی پھر وہ سرگرم ہوگئے۔

اسی رات سے میرے سینے میں درد ہونے لگا اور میں اپنے کمرے میں تنہا رہتا
سب تک

رہا مجھے کسی کروٹ چین نہیں پڑ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں کوئی عجیب مخلوق موجود ہو اور شور کر رہی ہو، میرے کان پھٹنے لگے۔ ابتدا میں میں نے یہ کیفیت اُن فشار پرغموں کی جو کئی دن سے میرے اندر برپا تھا، سرزنش چند کی موت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ لڑکی جو ستار بجا رہی تھی وہ لوگ جو ستار سُن رہے تھے۔ اُن کے چہرے ہر لمحے میرے سامنے رہے تھے۔ وہ لڑکی دن بھر میری آنکھوں کے سامنے ستار بجا رہی تھی میں جرأت کی پرسوز تانوں سے بچنے کی کوشش کرتا مگر وہ ستار لیے ہر جگہ پہنچ جاتی اب یہ دھن سنتے سنتے میں تنگ آ گیا تھا۔ اسی لیے میں نے کمرہ بند کر دیا تھا مگر وہاں بھی وہ آ گئی اور ڈھول تاشے والے، نخرے والے مداری بھی ساتھ لے آئی۔ میں کمرے میں چیختا چلاتا رہا اور میرے اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ مجھ سے اپنے ہی پیر نہیں اٹھائے گئے۔ پھر اچانک خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے ہانپتے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ دیکھا تو سامنے ایک سایہ لہرایا۔ بہت دنوں بعد مہ پری جمال سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور میں حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ "جمشید!" اُس نے دھیرے سے مجھے پکارا۔ "تھک گئے؟"

"کیمو!" میری زبان پر بے اختیار اُس کا نام آیا۔ "کیمو! میں تمھیں یاد کر رہا تھا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "تم نے مجھے جنگل میں ڈوبنے سے کیوں بچایا تھا؟"

"جمشید!" وہ مترنم آواز میں بولی۔ "پھر پریشان ہو گئے؟"

"میرا دماغ پھٹ جائے گا کیمو!" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

"نہیں" وہ ہاتھ کے اشارے سے بولی۔ "تم ابھی سے تھک گئے؟ تم نے تو کمال کر دیا۔ اب میں تمھیں زیادہ دن یہاں نہیں رکنے دوں گی۔"

"تم مجھے کہاں لے جاؤ گی؟ وہ سادھو، وہ پنڈت سب ہی کہتے ہیں کہ مجھے اُن کے ساتھ تمھارے پاس چلنا چاہیے۔ یہ سب کیا ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ وہ سچ کہتے ہیں۔"

"کیا سچ کہتے ہیں؟" میں نے طیش میں کہا۔

"یہی کہ تمھیں سکون چاہیے۔ پہاڑوں کا سکون، دریاؤں کا سکون۔" وہ مسکرائی۔

"اور میں کیسے جا سکتا ہوں؟" میں نے متفکر تیز انداز میں کہا۔ "یہاں میرے پیچھے کتنے جھگڑے لگ گئے ہیں۔ میں تو سکون ہی چاہتا تھا۔ سکون ہی کی خاطر میں نے خود کو دریائے جنگل کے حوالے کرنا چاہا تھا مگر تم نے مجھے بچا کے بے سکون کر دیا۔"

"اور پھر تم نے کیسے کیسے تماشے دیکھے۔"

"کون کم بخت انھیں دیکھنا چاہتا تھا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"خوشیاں بے قیمت تھوڑی ہی مل جاتی ہیں۔"

"میں قیمت کب تک ادا کرتا رہوں گا؟"

"جب تم تماشوں سے بالکل بھر جاؤ گے۔"

"میں عاجز آ چکا ہوں۔"

"جھوٹ۔ کیا تم میرے ساتھ چل سکتے ہو؟ چلو ابھی چلو۔"

"تمھارے ساتھ؟ مگر کہاں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"سکون کی گھاٹیوں میں۔" اس کی آواز میں چوڑیوں کی کھنک تھی۔ "مجھے معلوم ہے تم نہیں جاؤ گے۔"

"میں کیسے جا سکتا ہوں کیمو! سوچو تو میرے ساتھ کتنے لوگ وابستہ ہیں۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں اور روز بروز الجھتا جا رہا ہوں۔ روز نیا ایک قرض بڑھ جاتا ہے۔ اُسے اتارے بغیر کہیں جاؤں گا تو ہمیشہ دکھ رہے گا۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ میں قرضوں کے بوجھ سے دب جاؤں گا، مر جاؤں گا مگر تم کون ہو؟ اس طرح اچانک سامنے آ جاتی ہو۔ تمھاری وجہ سے سادھو اور پنڈت میری عزت کرتے ہیں مگر تم میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تعجب ہے تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہو اور مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتیں۔ تم مہربانی کرتی ہو، میرا دکھ درد بٹانے آ جاتی ہو لیکن میں تمھارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم میرے بارے میں سب کچھ جان جاؤ گے۔"

"یہ تو تم ہمیشہ کہہ دیتی ہو۔ نہ جانے وہ دن کب آئے گا۔"

"وہ دن بھی آ جائے گا۔" کیمو خوابیدہ لہجے میں بولی اور میرے نزدیک آ گئی۔

اس کے بدن سے چاندنی چھلک رہی تھی۔ اس کی قربت کے احساس سے مجھ پر نشہ سا چھانے لگا۔ "تمھیں جب کسی دن میری بہت یاد آئے تو تم میری تلاش میں نکل کھڑے ہونا۔ میں کسی جگہ بھی مل جاؤں گی اور تم جان جاؤ گے کہ میں کون ہوں۔"

"اور کیا چاہتی ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی۔" وہ شیریں آواز میں بولی۔ وہ میری مسہری کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے بدن سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ میری آنکھیں خیرہ ہونے لگیں اور

عبداللہؓ بن عتبہؓ

ایک شاعر تھا [illegible] بڑی [illegible] کے بعد [illegible] انداز بیان سے فضل کو بہت متاثر کیا۔ فضل نے [illegible] انعام دی۔ تھیلی عبداللہ کے سامنے آئی تو اس نے کہا۔ "[illegible] گئے ہیں؟ انھیں آزادی کا پروانہ ملنا چاہیے۔" فضل نے [illegible] ہی انعام اور دیا۔ عبداللہ نے دست بستہ عرض کیا کہ "جناب! [illegible] کر کے ہی اپنی بے قدری کر ڈالی ہے۔ اب بوجھ اٹھانے کی ذلت [illegible] کروں گا؟" فضل نے ایک غلام اس کے حوالے کر دیا۔ عبداللہ نے کہا "جناب! آج کا دن اس غلام کے لیے بہت منحوس ہے کہ یہ آپ کی بارگاہ سے رخصت ہو رہا ہے۔" فضل مزید خوش ہوا۔ اس نے عبداللہ کو دو اور غلام [illegible] کی اجازت دے دی۔ عبداللہ نے کہا "قبلہ حاجات! اپنے دربار کے ہوا خواہ [illegible] بوجھ کیسے اٹھائیں گے؟" فضل نے ساز و سامان سمیت تین گھوڑے بھی دے دیے۔ عبداللہ پھر بھی نہ گیا۔ فضل نے اس کی وجہ پوچھی۔ عبداللہ کہنے لگا "غلام نوجوان ہیں، میں ان کی فرمائشیں کیسے پوری کروں گا؟" فضل نے تین کنیزیں بھی اس کے سپرد کر دیں۔ عبداللہ چند قدم چل کے پھر واپس آ گیا۔ اس بار وہ دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا۔ فضل نے حیران ہو کے پوچھا "اب کیا بات ہے؟" عبداللہ نے کہا "جناب! جب آپ جیسے فیاض اس دنیا میں نہیں رہیں گے تو یہ دنیا رہنے کے قابل کیسے رہے گی؟"

دماغ میں سرور و انبساط کی لہریں اُٹھنے لگیں اور یہ کیفیت اتنی غالب آئی کہ مجھے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

ابھی ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پارو نے میرا بازو جھنجوڑ کے مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو مجھے اپنے وجود پر شبہ ہوا کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی میں گیارہ بج رہے تھے۔ "تم کیسی غافل نیند سو رہے ہو؟" وہ فریاد کرتے ہوئے بولی "اور ادھر سب لُٹ گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے بڑبڑا کے پوچھا۔

"موہن!" اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سراسیمگی سے کہا۔ "بہت بُرا وقت آ گیا ہے۔ میرا شبہ درست نکلا۔ آج صبح ہائی کمان کے افسروں نے مجھے شناخت عمل میں طلب کیا تھا۔"

"پھر؟" میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"پھر انھوں نے مجھ سے عجیب عجیب سوالات کیے۔ انھوں نے مجھ پر کوئی الزام تو عائد نہیں کیا لیکن اُن کے سوالوں سے صاف ظاہر تھا کہ انھوں نے میرا انتخاب کر لیا ہے۔ اب کیا ہوگا موہن؟ مجھ سے زندہ نہیں رہا جائے گا۔ ہم یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتے۔ ریاست سے باہر جانے کے ہر راستے پر پولیس کا پہرا ہے۔ ہم کہیں چھپ بھی نہیں سکتے۔"

"وہ کیا کہتے تھے؟" میری آواز بدل گئی تھی۔

"وہ مجھ سے اُس رات کی سرگرمی کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ میرے مشاغل، میرا نشانہ اور میرے تعلق وغیرہ۔ اُن کا لہجہ بہت زہریلا تھا۔ شاید اُن کے سامنے میرے چہرے کے خاکے موجود تھے اور میرا چہرہ وہ بار بار دیکھتے تھے۔ میرے رخسار پر یہ جو تل ہے اس پہ بار بار اُن کی نظر پڑتی تھی۔ مرنے والے گرجے کو اتنا موقع تو مل گیا تھا کہ وہ میرا حلیہ تفصیل سے بیان کر سکے۔ وہ مجھ سے ذیشان، جگت، بیپ، ہلا کے متعلق اور تمھارے متعلق پوچھ رہے تھے۔"

"میرے متعلق؟"

"ہاں۔ جہاز رانی سے آزاد ہونے والے تم واحد قیدی ہو اس لیے اُن کی توجہ تمھاری طرف مبذول ہو گئی ہے یا کرائی گئی ہے۔ اُن کے لیے اس دلیل تک پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ دوگونے گرفتار شدہ لوگوں کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے قتل کیے گئے تھے۔ اُن کے پاس ہر ملازم اور ریاست کے ان دو خاندانوں کے افراد کی مکمل رپورٹ موجود ہے۔ ذیشان سے تمھاری قربت، جگت، بیپ کی ترغیب اور فرار ہو جانے کا کیا۔ یقیناً بھولی بھگت سے لوگوں نے اشاروں اشاروں میں تم پر اپنا شبہ ظاہر کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہوگا۔"

"تو تمھارا مطلب ہے کہ انھوں نے ایک طرح تم پر فردِ جرم عائد کر دی ہے؟" میں نے اضطراب سے کہا۔ "پارو! کیا تمھیں مکمل یقین ہے؟"

"ہاں موہن! کچھ ایسی ہی بات ہے۔" وہ خستگی سے بولی۔

"ممکن ہے وہ تم پر ایسا تاثر دے کے تمھیں ٹٹولنے کی فکر میں ہوں کہ تم کس قدر گھبرا جاتی ہو اور تمھارے حواس کو کیا عالم ہوتا ہے۔ کیا تم اسی حالت میں اُن سے رخصت ہوئی تھیں؟"

"نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی تھی۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ میں اُن کے کام آتی رہی ہوں۔"

"پہلے تو تم حواس بحال رکھو۔" میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کے سیدھا کیا۔ "تم وہاں سے ٹھیک طرح چلی آئیں مگر یہاں آ کے منتشر ہو گئیں تو تمھاری اس کیفیت کا حال بھی انھیں منتقل ہو جائے گا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم تنہا نہیں ہو۔ کیا تم پر زندگی کا جادو چل گیا؟ تم موت سے ڈر گئیں؟"

"اوہ موہن! یہ بات نہیں ہے۔ دراصل رسوائی سے ڈرتی ہوں۔"

"بکواس۔" میں نے پھیکی ہنسی سے کہا۔ "اس کا موقع ہی نہیں آنے دیا جائے گا۔ وہ ابھی وقت لیں گے۔ تمھاری باتوں سے ظاہر ہے کہ انھیں تم پر ہاتھ ڈالنے میں کوئی جھجک ہے اور ....."

"یہ جھجک کسی وقت بھی دُور ہو سکتی ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"لیکن ہم اپنے غم زدہ چہروں اور اونگے بونگے ردِعمل سے تو انھیں اپنے خلاف اور ہموار کریں گے۔"

"موہن! تمھاری کوئی دلیل میرے دل کو نہیں لگ رہی ہے۔ مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آ رہا ہے۔" وہ نڈھال ہو کے میری آغوش میں ڈھے گئی۔

"بے وقوف لڑکی!" میں نے اس کا چہرہ اُٹھا کے آنکھیں چومیں۔ "تمھاری اس ابتری میں تو کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میں ابھی تک پُر امید ہوں اور میرے پاس ہمیشہ ایک راستہ رہتا ہے۔ ایک آخری راستہ۔ ہم فرار کے امکانات پر غور کر سکتے ہیں۔"

"مشکل ہے۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"ٹیلر ابھی موجود ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ اچھل پڑی۔ "ٹیلر؟" اس کی آنکھوں میں روشنی چمکی۔

"مگر وقت سے پہلے جانے کی کوشش مت کرنا البتہ ٹیلر کو تیار رکھنا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ٹیلر کے ساتھ چلی جاؤں گی؟" وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں تمھارے بغیر فرار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"نہیں۔ میں خود تمھیں تنہا نہیں جانے دوں گا۔"

پارو نے جو بات کہی تھی وہ ایسی نہیں تھی کہ میں اپنے آپ کو اس کی طرح اطمینان دلا کے خاموش ہو جاتا۔ وہ میری آغوش میں تھی لیکن میں اس کے ساتھ بھی تنہا تھا۔ پارو میری امان میں تھی اس لیے اس کی اکھڑی ہوئی سانس استوار ہونے لگی تھی۔ میں تو خود دھوپ میں کھڑا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج میرے سر پر آ گیا ہے۔

گھڑی نے بارہ بجائے۔ کمرے میں ملائم گھنٹیوں کی موسیقی بکھر گئی۔ وقت

ہمارے حال پر ہنس رہا تھا۔ میں نے پارو کو اُٹھایا اور ایک بار پھر ہائی کمان کے افسروں سے گفتگو کی روداد اور ان کا رویہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔ پارو کے بیانوں میں کوئی سقم نہیں تھا۔ حالات اتنے ہی نازک تھے جتنے پارو نے محسوس کیے تھے۔ سو دوپہر ہوگئی تھی۔ دوپہر تو اس وقت سے تھی جب سے وہ آئی تھی۔ اپنی زندگی میں تو کبھی صبح ہوتی تھی۔

شانت محل، ریاست راجے پور کے شاہی مہمانوں کی قیام گاہ تھا۔ شانت محل۔ میرے ذہن میں یہی نام گونجتا رہا۔ شانت محل کو آگ لگا دی جائے۔ میں ذیشان کو تلاش کرتا ہوا دور نکل گیا حالانکہ وہ شاردا کے پاس تھا۔ شاردا آج خاصی شاداب نظر آرہی تھی جبکہ میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے ذیشان کو اشارہ کرکے اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر کچھ سوچ کے رہ گیا۔ پھر مجھے اس وقت تک وہاں رہنا پڑا جب تک ذیشان خود نہ اُٹھ گیا۔ میرے لیے اپنی وحشت چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہریش چند کی موت کے بعد ذیشان کے بازو ڈھیلے ہوگئے تھے۔ نہ اس کی چال میں وہ تیزی تھی نہ بات میں وہ طنطنہ۔ میں نے موقع دیکھ کے اُسے مشورہ دیا کہ وہ ہائی کمان کے افسروں کو فون کرے کہ وہ آج رات ان سے ملاقات کرنے کا خواہش مند ہے۔ ذیشان اس کے لیے تیار نہیں ہوا لیکن چھاؤنی میں گرفتار ملازموں اور دوسرے سیاسی امور کا واسطہ دے کے میں نے اُسے مجبور کر ہی دیا۔ ذیشان نے فون کیا۔ ہائی کمان کے افسروں نے شام کے سات بجے ملاقات کا وقت دیا۔ ذیشان کی زبانی وقت کا ذکر سن کے میں نے ذیشان کی چٹکی لی اور اس کے کان میں "نو بجے" کہا۔ ذیشان نے وقت بدل دیا۔ "شام سات بجے کے بعد۔ کوئی رات کے نو بجے کیسا رہے گا؟" ذیشان نے ناخوشگی سے کہا۔ افسروں نے آمادگی ظاہر کر دی۔

"نو بجے ہی کیوں؟" فون رکھ کے اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نو بجے اندھیرا گہرا ہو جاتا ہے۔ آپ کے وہاں جانے کی کم سے کم لوگوں کو اطلاع ہوگی۔"

"تم بھی میرے ساتھ چلنا۔"

"میں آپ کے ساتھ ہی ہوں گا۔ مادی طور پر نہ سہی روحانی طور پر سہی۔" میں نے زور دے کے کہا۔

"اب جی کچھ نہیں چاہتا۔" وہ اداسی سے بولا۔

"جی مارنا پڑے گا ذیشان بابا! میری خاطر جی لگائیے ورنہ کسی دن اپنی خبر بھی مل جائے گی۔ آپ کے سر پر بڑی ذمے داری ہے۔"

"تم بھی ایسی باتیں کرنے لگے؟" وہ گردن جھٹک کے بولا۔

"کیا کروں، جو لمحے مل رہے ہیں میں سمجھتا ہوں وہ ایک اتفاق ہیں۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، پتہ نہیں کچھ دیر میں کیا ہو جائے۔ اب یقین اُٹھتا جا رہا ہے۔ ہمیں تیار رہنا چاہیے۔"

"تمہارا بھی وہی حال ہوگیا۔ اتنی شکستہ باتیں تو تم نے کبھی نہیں کی تھیں۔ مکان ہی گرنے لگا۔ ہم تم سے یہی کہتے تھے کہیں دور چلے چلو۔"

"آپ سچ کہتے تھے۔" میں نے نظریں جھکا کے کہا۔

رات کے آٹھ بجے تک میں بے حد مصروف رہا۔ میں نے اُس جیسا ہریش چند کا لباس پہنا، چشمہ لگایا اور یہ سب کام میں نے ذیشان سے چھپ کر کیا۔ آئینہ دیکھ کر میں نے اپنی نئی وضع قطع کی تصدیق کر لی۔ اس لباس پر میں نے ایک نیلی اونی چادر جسم پر لپیٹی اور باتھ روم کے عقبی راستے سے گزر کے بجلی کے اُس پول کا رُخ کیا جو ذیشان کے محل میں آتا تھا۔ مجھے خود کو زیادہ دیر تک چھپا رکھنے کی زحمت نہیں کرنی پڑی۔ سامنے پیچھے کے دونوں تاروں پر میں نے ایک موزوں جگہ بیٹھ کے ریشم کی ڈوری پھینکی۔ ڈوری کے آگے بجلی زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ میں دوسری مرتبہ میں کامیاب ہوگیا۔ زنجیر دونوں تار چھو گئی، بجلی کا جھماکا ہوا۔ بجلی جھڑیاں چھوٹیں اور پورا کا پورا بھون تاریکی میں ڈوب گیا۔ میں نے جلدی ڈوری کھینچی اور بھاگتا ہوا گیراج میں داخل ہوگیا۔ ذیشان کی لمبی گاڑی کھڑی تھی۔ پروگرام کے مطابق ڈرائیور وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرایا۔ میں نے اُس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی ایک بڑی گڈی تھما دی۔ اس نے جھک کر میرے پیر پکڑ لیے۔ سادھوؤں نے جب چھاؤنی کے دروازے پر میرے پیر پکڑے تھے تو وہ اس کا چشم دید گواہ تھا۔ اسے خریدنے اور اعتماد میں لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں ڈکی میں چھپ سکتا تھا اور ذیشان کو ہدایت کر سکتا تھا کہ وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کرے مگر یہ معاملہ بڑے خطرے پر چھوٹے خطرے کو ترجیح دینے کا تھا۔ ڈرائیور نے مجھے ڈکی میں ٹھونس دیا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب گاڑی گیراج سے روانہ ہوئی اور ذیشان کو لینے سے پہلے پورچ میں ٹھہری۔ پھر چند لمحوں تک صدر دروازے پر رُکی۔ پھر کوئی دس پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد آہستہ آہستہ چلتی اور رُکتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ گاڑی پھر چل پڑی اور صرف چند لمحے چل کے رُک گئی۔ ڈرائیور نے پیچھے سے آ کے کچھ دور کھڑی کی ہوگی۔ مجھے کچھ انتظار کرنا پڑا یہی کوئی دو تین منٹ۔ ڈکی کا ہینڈل گھمانے کا کھٹکا ہوا تو میں نے گردن اٹھا کے دیکھا۔ ڈرائیور مجھے اشارہ کر رہا تھا۔ جس جگہ گاڑی کھڑی کی گئی تھی وہاں میری منشا کے مطابق اندھیرا تھا۔ میں اُتر کے قریب کی جھاڑیوں میں دبک گیا اور جلدی ہی دبے پاؤں چلتے ہوئے گاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک نسبتاً محفوظ جگہ پر پھیل گیا۔ یہاں کسی کے آنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ ڈرائیور باہر نگہبانی کر رہا تھا۔ ذیشان کی واپسی میں اچھی خاصی دیر لگ گئی۔ کوئی دو گھنٹے تک جھاڑیوں کے مچھروں اور کیڑوں مکوڑوں کی صحبت میں بیٹھے بیٹھے میری آدھی جان نکل گئی۔ پھر کسی سنتری نے ذیشان کے ڈرائیور کو آواز دی۔ گاڑی چلی، ساتھ ہی میرا دل بھی چلا۔ گاڑی جانے کے دو گھنٹے بعد یعنی ٹھیک ایک بجے جب شانت محل کی بڑی روشنیاں بجھا دی گئی تھیں اور فضا میں ہر سمت خواب کی گھل گئی تھی میں نے سر اُٹھایا۔ پارو نے مجھے شانت محل کا تفصیلی نقشہ سمجھا دیا تھا۔ دودھیا رنگ کی سفید پتھر سے بنی ہوئی ایک منزلہ حسین عمارت تھی۔ ایک بڑا سبزہ زار باغ، پھولوں، کیاریوں اور ملازموں کے کوارٹرز۔ کسی انگریز نقشہ ساز نے بڑے دل سے نقشہ

کھینچا تھا۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی بدقسمتی سے پہلے مرحلے پر ایک سنتری نے میری آہٹ محسوس کر لی۔ وہ اِدھر ہی آ رہا تھا۔ میں اُدھر الجھا ہوا۔ اس کی موجودگی اور بیداری میرے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ زینے کے نیچے کی جگہ گھیرنے کے لیے میں نے پستول کے دستے سے دیوار ٹھونکی۔ وہ اسی جانب لپکا۔ اس کی موت اسی وقت لکھی تھی۔ اس کے سامنے آنے کی دیر تھی۔ میرا نشانہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ میں نے اسے زینے کے نیچے ہی کھینچ لیا۔ وہ انگریز پہرے دار تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے سوئچ بند کر دیا۔ پہلی منزل پر کمروں کے درمیان پیچ دار راستے بنے ہوئے تھے۔ یہاں بھی دروازے بھی کمرے ایک جیسے تھے۔ مجھے اپنے مطلوبہ کمروں کی تلاش میں دشواری پیش آئی۔ وہ یقیناً برابر برابر کے کمروں میں ہوں گے اور وہاں سنتریوں کا پہرا ضرور ہوگا۔ کچن کا حصہ بھی ہوگا اور کچن میں باورچی جاگ رہا ہوگا۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہوا ایک روشن گلی میں داخل ہو گیا۔ اسے گلی ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہاں ایک نہیں دو سنتری موجود تھے اور دونوں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کو نشانہ آسانی سے نہیں لیا جا سکتا تھا۔ ایک مرتا تو دوسرا شور مچا دیتا۔ وہ دونوں آپس میں ہنستا بستا باتیں کر رہے تھے۔ ان کا رخ محراب دار دریچے سے پچھلی منزل کی جانب تھا۔ ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آئی۔ میں نے ایک جست لگائی۔ وہ بجلی کی طرح پلٹے لیکن دو گز ہی کے میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ٹھٹھک کے رہ گئے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دھیمی آواز میں انھیں حکم دیا۔ اپنے ہتھیار فرش پر رکھ دو اور مجھے نیچے جانے کا راستہ بتاؤ۔ یہاں کے لیے ایک ہی حکم تھا۔ انھوں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ "نہیں ساتھ چلو۔ جلدی کرو۔" مجھے پستول کے اوپر چڑھا ہوا خول کچھ میرے تیور دیکھ کے انھوں نے بے چون و چرا تعمیل کی۔ وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ چند قدم بعد ہی ایک نے پھرتی دکھانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے پلٹنے کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے نے یہ دیکھ کے ہاتھ اٹھا لیے۔ میں نے حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش کھینچے۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس سے یہ چھوٹا سا کام بھی نہیں ہوا۔ میں نے بھی نشانے پہ لے لیا تھا۔ پھر خون بکھر گیا تھا۔ یہ اچھی علامت نہیں تھی۔

بہرحال میں نے ان دونوں کو وہیں چھوڑا۔ میرا خیال تھا کہ میں ان دونوں کو کسی مناسب جگہ ایک ساتھ چھپا دوں گا۔ پیچھے رہ جانے کے حکم کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں پیچھا ہی تھا بلکہ کسی محفوظ جگہ کی تلاش تھی مگر وہ پہلے ہی مرنا چاہتے تھے۔ ایک کمرے میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے گھنٹی دبا دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز آئی "کون ہے؟"

میں نے دوبارہ گھنٹی دبا دی۔ پہلے کسی کے بڑبڑانے کی آواز آئی پھر چٹخنی کھلنے کی۔ دروازہ ابھی پورا کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میں ایک جھٹکے سے اندر داخل ہوا۔ وہ معمر سنجیدہ اور پروقار شخص بوکھلا گیا۔ "کیا چاہتے ہو؟ کون ہو؟"

"کرنل؟ ..." میں نے اس کا نام پوچھنے کے لیے پستول گھمایا۔

"کرنل مائیکل کرنل مائیکل۔" اس نے نفیس انگریزی میں کہا۔

"کرنل مائیکل تم ایک تجربہ کار شخص ہو مجھے افسوس ہے کہ تم سے اس انداز میں ملاقات کرنی پڑ رہی ہے ورنہ میں تمہارے پاس آ کے کچھ سیکھنے کی درخواست کرتا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ مجھ جیسے سعادت مند شخص کو اس طرح اپنے بزرگ سے مخاطب ہونا پڑ رہا ہے۔ ازراہِ نوازش وہ فائل میرے حوالے کر دو جو تم نے کنڈر میں ہونے والی واردات پر مرتب کی ہے اور جو صرف تمہارے پاس ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم تینوں حضرات نے اس معاملے میں چھاؤنی کے عہدے داروں پر بھی اعتبار نہیں کیا ہے۔ وقت کم ہے تکرار کا وقت نہیں ہے۔ فائل کسی تاخیر کے بغیر میرے حوالے کر دو۔"

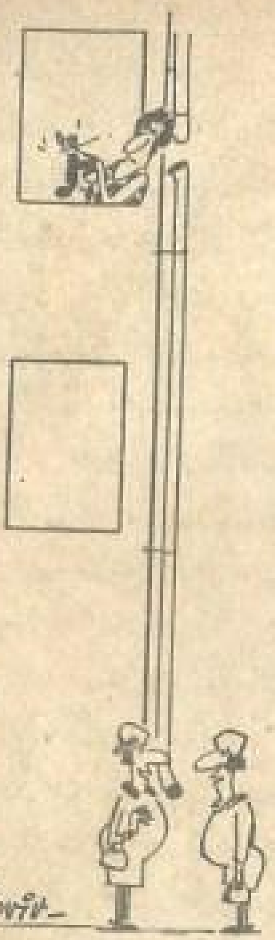
"وہ میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے بردباری سے کہا۔

"پھر کس کے پاس ہے؟"

"کرنل بیک کے پاس ہے۔ وہی ہمارے وفد کا سربراہ ہے مگر نوجوان! وہ اتنی اہم فائل تمہارے حوالے نہیں کرے گا۔ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"اسے حاصل کیے بغیر میرا واپس جانا بیکار ہے۔ میں تمہارے کئی سنتریوں کو ہلاک کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ کرنل بیک ہتھیاروں کو خوب پہچانتا ہوگا۔ کرنل! اگر تمہارے پاس فائل موجود ہے تو فوراً میرے حوالے کر دو بصورت دیگر تمہیں ایک اجنبی زمین میں دفن ہونا پڑے گا۔"

"اوہ نوجوان!" وہ خوش مزاجی سے بولا۔ "کیا ہم تھوڑی دیر بیٹھ کے بات نہیں کر سکتے؟ کیا خیال ہے اگر وسکی کا ایک پیگ میں تمہاری خدمت میں پیش کروں تاکہ تمہارے اوسان ٹھکانے آئیں۔"



"میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ میں تمھاری پیش کش ضرور قبول کرتا۔"

"نوجوان! تم ایک ذہین بہادر اور جرأت مند آدمی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ذہین بھی ہو گے۔ ذہانت تمھاری آنکھوں سے جھلکتی ہے۔ بلاشبہ تم اس تجربے کے کام لگے باقی کمان کے ان تین اعلا افسروں کو ختم کر سکتے ہو اور کسی قدر اپنا مقصد بھی حاصل کر سکتے ہو مگر تمھارا یہ عمل ریاست کے لیے پولیس بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے بحث کرنے اور دلائل سننے کے لیے آیا ہوں؟ کرنل! تمھارے بال سفید ہو گئے ہیں۔ پھر بھی ایسی باتیں کر رہے ہو۔ میری واپسی کس امر سے مشروط ہے تم بخوبی جانتے ہو۔ فائل نکالو۔ الماریاں کھولو۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ کرنل نے ٹال مٹول کی۔ ایک ہی جگہ اتنا وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ دیکھتا رہ گیا جب میرے پستول سے چنگاری برآمد ہوئی۔ میں نے اس کا بیگ دیکھا۔ تمام الماریاں اور خفیہ جگہیں دیکھ ڈالیں۔ کرنل سچ نے کہا تھا۔ اس کمرے سے چند کاغذات کے سوا کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی۔ میں نے دروازہ کھلا رکھا اور دونوں مقتول سنتریوں کو کھینچ کر کرنل کے کمرے میں ٹھونسا پھر کمروں کے سنگ گل جیسے رستے میں بچھا ہوا قالین جیسے تیسے لپیٹ کے میں نے دوسرے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کرنل بیٹ نے اپنے آں جہانی ساتھی کی طرح دروازہ کھولا۔ وہ ایک درشت مزاج سخت چہرے اور گہری آنکھوں والا شخص تھا۔ وہ بے سلیپنگ گاؤن میں بھی کرنل معلوم ہوتا تھا۔ وہ پستول خاطر میں نہیں لایا۔ وہ ہندوستان میں انگریز اقتدار اس کی جاہ و حشمت رعب داب دبدبے کا ذکر طمطراق سے کرتا رہا۔ اس نے مجھے قائل نہیں ہی گولی کھانا پسند کیا۔ یہاں مجھے زیادہ دیر ٹھہرنا پڑا۔ ایک فائل نہیں کئی فائلیں موجود تھیں۔ میں غیر ضروری چیزیں آتش دان میں ڈالتا اور کرنل کے سگار لائٹر سے انھیں دھواں کرتا رہا۔ کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ میرے پاس تین فائلیں موجود تھیں۔

تیسرے کمرے میں کرنل ہیری سب سے زیادہ مہذب ثابت ہوا۔ اس نے اپنے تمام کاغذات خود میرے حوالے کر دیے۔ میں نے اس سے گزارش کی کہ وہ آئی جی ہتھا کو فون کر کے پولیس افسر ٹیلر کو فی الفور طلب کرے اور اگر وہ کہیں قریب موجود نہ ہو تو دوسرے افسران ٹھاکر یا بے پال کو بھیج دیا جائے۔ اسے ہچکچاہٹ ہوئی۔ میں نے حکم دیا کہ وہ برابر کے کمرے میں کرنل سچ سے رابطہ قائم کر کے اجازت حاصل کر لے۔ میری اس پیش کش سے وہ حیران ہوا تاہم اس نے گھبراہٹ میں نمبر ڈائل کیا۔ "اس کمرے میں گھنٹی بج رہی ہے کرنل سچ گہری نیند سو رہا ہے۔" اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بہت گہری نیند۔ وہ اب کبھی نہیں اٹھے گا کرنل ہیری! میں اس کو فون سنانے تمھارے پاس آیا ہوں۔ جلدی سے فون کرو۔ پہلے ٹیلر کا پتہ معلوم کرو ممکن ہے وہ بڑی حویلی میں موجود ہو یا اپنے گھر ہو۔ اگر وہ دستیاب نہ ہو سکے تو کسی دوسرے افسر کو بلالو۔ مجبوری میں تمھیں بھی برداشت کر لیا جائے گا۔"

کرنل نے پھر تاخیر نہیں کی۔ پستول کی نال اس کے بائیں کان پر لگی ہوئی تھی۔ اس نے آئی جی کا نمبر ڈائل کیا۔ ٹیلر وہاں موجود نہیں تھا۔ پوچھا گیا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟ باقی کمان کے کرنل ہیری کا فون تھا لہٰذا ایک لمحے میں جواب دے دیا گیا۔ کہا گیا کہ اسے فوراً ثنانت محل بھیجا جا رہا ہے۔ وہ دس منٹ کے اندر اندر نہ آ سکے تو انسپکٹر ٹھاکر یا بے پال کو ادھر بھیجا جائے۔ "بات از موسٹ کانفیڈنشل ہے۔" کرنل ہیری نے آئی جی سے کہا۔ "بہتر ہے کہ ٹیلر ہی کو فراہم کر کے بھیجا جائے۔" آئی جی ہتھا نے کہا "ہو گا سر! کیا میں آ جاؤں؟" کرنل نے جواب دیا۔ "نہیں تمھیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے ٹیلر سے کام نکل جائے گا۔"

میں ہیری کے پاس بیٹھا اس کی صورت تکتا رہا۔ ہیری نے میری منتیں شروع کر دی تھیں۔ کرنل کرنل ہی ہی کیا فرق ہوتا ہے۔ پانچ منٹ بعد ہی آئی جی ہتھا کا فون آیا۔ میں نے پستول پھر ہیری کے سر پر تان لیا اور فون کی آواز سننے کی کوشش کی۔ آئی جی ہتھا بتا رہا تھا کہ پولیس افسر ٹیلر پندرہ منٹ کی مدت میں ثنانت محل پہنچ جائے گا۔ کرنل ہیری نے رسمی شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا اور پھر میرے حکم پر ثنانت محل کے گیٹ پر فون کیا۔ "انسپکٹر ٹیلر آ رہا ہے۔ اسے کسی روک ٹوک کے بغیر اوپر میرے کمرے میں بھیج دیا جائے۔"

کرنل پوری طرح میری گرفت میں تھا۔ میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھنے کے لیے انگلستان میں عورتوں کی آزادی کے سلسلے میں حیرت کا اظہار کیا۔ اس موضوع پر بولنا اسے سخت ناگوار گزرا پھر بھی اس نے انگلستان میں ابھرنے والی آزادی نسواں کی تحریکوں پر اچٹتی ہوئی روشنی ضرور ڈالی۔ پندرہ کے بجائے پچیس منٹ گزر گئے۔ مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ ٹیلر نے کہیں راستے میں خودکشی نہ کر لی ہو۔ آتشی رات کو ٹیلر ثنانت محل میں طلبی پر کانپ گیا ہوگا۔ اس سے تو کاری بھی سلائی گئی ہوگی۔ اگر ٹیلر نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ کو ملامت کی تو اسے پڑنے کے لیے کتنے پولیس افسروں میں کسی کو بھی طلب کیا جا سکتا تھا۔ آئی جی ہتھا بھی سر کے بل آتا بلکہ مجھے زیادہ خیال رہتا۔ آدھا گھنٹے بعد گھنٹی گنگنائی۔ کرنل ہیری نے جوانوں کی طرح اچھل کے دروازہ کھولنے کے لیے بڑھنا چاہا۔ میں نے اس کا بازو تھام کے اسے تحمل کی تلقین کی۔ کرنل نے دروازہ کھولا۔ میں اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ ٹیلر کے سلیوٹ کرنے کی آواز آئی۔ کرنل نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ جیسے ہی مجھ پر ٹیلر کی نظر پڑی وہ سرتاپا لرز گیا۔ "تم؟" اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کرنل نے خوش اخلاقی کے ساتھ ہم دونوں سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ "معزز نوجوان! کیا ہم اطمینان سے بات نہیں کر سکتے؟"

"تمھارا وقت گزر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ پھر کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ کرنل فرش پر گرا۔ ٹیلر کا چہرہ دہشت سے زرد ہو گیا۔ "ٹیلر! میں نے تمھیں ایک خاص کام سے یہاں بلایا ہے۔ راستے بھر تم پریشان رہے ہو گے کہ آخر اچانک طلبی کا کیا مقصد ہے۔ مجھے باہر جانے کے لیے راستہ چاہیے۔ اس میں تمھارے لیے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ کرنل ہیری نے آئی جی ہتھا کو فون کیا تھا۔ آئی جی ہتھا نے تمھیں نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈا ہوگا۔ تم بے قصور ہو۔ تم کہہ سکتے ہو کہ جب تم یہاں داخل ہوئے تو کمرے میں کرنل ہیری کی لاش پڑی تھی اور میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ کرنل ہیری نے آدھے گھنٹے پہلے گیٹ پر پہرے داروں کو مطلع کیا تھا کہ تم آ رہے ہو اور تمھیں

کسی روک ٹوک کے بغیر اندر آنے دیا جائے۔ میں نے تمہارے دفاع کے لیے پورا انتظام کر رکھا ہے۔ واقعات کی تہہ تک آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ کرنل ہیری اپنے دو کرنلوں کی موت دیکھ کے مجھ پستول بردار قرم سے مفاہمت کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ تمہارے پاس بھی کوئی چارہ نہیں تھا۔ تم نے بھی مجبوراً یہی کیا۔ آئی جی جہانداد گیٹ کے پہرے دار اس بات کے شاہد ہیں کہ آدھی رات گزرنے کے بعد کرنل ہیری نے تمہیں طلب کیا تھا۔ دو کرنلوں اور سنتریوں کی موت تمہاری آمد سے پہلے ہوئی تھی۔ یہ بات آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ تم قطعی محفوظ ہو۔ بس تمہارا کام یہ ہے کہ تم مجھے میری مطلوبہ جگہ پہنچا دو۔ یہ کام میں خود بھی کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں ختم کر کے تمہارا کوٹ، تمہارے یہ تمغے اور ہیٹ سنبھال کے باہر جا سکتا ہوں۔ گیٹ پر کوئی مجھے روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مجھے اپنے نشانے میں بھی کمال حاصل ہے۔ کسی نے مزاحمت کی تو میرے پاس گولیوں کی کمی نہیں ہے۔ گیٹ پر چار چھ پہرے داروں سے زیادہ کی نفری نہیں ہوگی۔ پستول بھی بے آواز ہے اور میں تمہیں یہ بتا دوں کہ مجھے تمہارا نام رانی پاؤ نے دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں مشکل وقت میں تمہیں زحمت دے سکتا ہوں۔ رانی پاؤ تم پر بے حد اعتماد کرتی ہیں۔ مجھ پر بھی وہ بڑی مہربان ہیں۔ تمہارے بھون میں آنے کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھیں۔ بار بار پوچھتی تھیں کہ تم نے پولیس افسر شیر کو کہیں نہیں دیکھا۔ میں ایک ہی حوالہ تمہیں دے سکتا ہوں اور تمہیں بتاؤں کہ میں یہاں پاؤ رانی ہی کے کام سے آیا تھا۔ یہ فائلیں موجود ہیں۔ اگر تم کچھ جانتے ہو تو ضرور سمجھ گئے ہو گے۔"

وہ ٹکٹکی باندھے میری تقریر سنتا رہا۔ میں نے پستول اس کے سامنے سے نہیں ہٹایا تھا۔ اس نے فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لیا۔ میں اس دوران میں بالکل خاموش رہا۔ "چلو۔" آخر اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

آگے بڑھ کے اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ ادھر ادھر کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے آگے، میں پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ میں نے سوچا تھا کہ فائل اس کے حوالے کر دوں گا لیکن پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ سنتری کو میں پہلے ہی مار چکا تھا۔ ہم دونوں اگلی نشست پر بیٹھ گئے اور سبزے کا ایک بڑا گول دائرہ کاٹ کے گیٹ کے نزدیک ہو گئے۔ ٹیلر نے دور سے ہارن بجایا۔ پستول کی نوک اس کے جسم میں چبھی ہوئی تھی۔ میں نے احتیاطاً سر جھکا لیا تھا۔ ہارن کی آواز سن کے اور گاڑی پہچان کے پہرے داروں نے دروازہ کھول دیا۔ کرنل ہیری کا جہان واپس آ رہا تھا۔ یقیناً کوئی اہم بات ہو گی۔

گیٹ پر میں نشست کے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ ٹیلر نے گاڑی کی رفتار بھی معتدل رکھی تھی۔ ہم اس جہنم سے نکل آئے۔ گاڑی بھون کے راستے کی جانب گامزن تھی۔ اچانک ٹیلر کو کچھ خیال آیا۔ "مگر کیا اس وقت ہمارا پرکاش بھون جانا مناسب ہو گا؟"

"بالکل نامناسب ہو گا۔ گاڑی بائیں طرف لے چلو۔ مجھے اس کا پہلے سے خیال تھا۔ بھون میں جانا تمہارے لیے بھی خطرے کا باعث ہے۔"

"میں تو واپس چلا جاؤں گا مگر پھر تم بھون میں کیسے داخل ہو گے؟"

"اس کا حل میرے پاس ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "چوراہے سے نکل کے گاڑی بڑی حویلی کے راستے پر ڈال دو۔"

"وہاں کیوں؟" اس نے اسٹیئرنگ گھما کے کہا۔

"تم مجھے کسی مندر پہ اتار دو گے۔ میں نے فصیل سے رسی لٹکا دی ہے۔ ایک بار پہلے بھی میں اسی راستے سے جا چکا ہوں۔"

"شاید یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔" وہ تذبذب سے بولا۔

"اس کے سوا کوئی اور راستہ ہو تو بتاؤ۔"

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔" کچھ آگے جا کے اس نے درختوں کے اندھیرے میں گاڑی روک لی۔

میں نے اسے اسٹیئرنگ پر ٹھنڈا کر دیا اور گاڑی سے اتر کے نالے کے سے چپکے اندھیرے میں بھون کی طرف بھاگتا رہا۔ رسی فصیل سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے ڈوری سے فائلیں کمر میں باندھیں اور اوپر چڑھنے لگا۔ نیچے اتر کے میں نے رسی کھینچ لی۔ فصیل سے دنیش کے محل کا مختصر راستہ میں نے کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ ذرا دور چلتا تھا تو سنتری کے بوٹوں کی آواز آجاتی تھی لیکن یہ جانے پہچانے راستے تھے اور یہاں دل کا وہ عالم نہیں تھا جو فصیل پر چڑھنے سے پہلے تھا۔

خفیہ راستے سے جب میں ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا تو ساڑھے چار بجے تھے۔ دنیش کی خواب گاہ بند تھی۔ میں نے جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ رسی عارضی طور پر چھپائی اور آہستہ سے دروازہ کھول کے راہداری میں دیکھا۔ راہداری سونی تھی۔ آخر شب کی گہری نیند۔

پارو کا دروازہ ایک ہلکی سی دستک پر کھل گیا۔ وہ ایک کرسی پر اداس بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں نے فائلیں اس کے قدموں میں پھینک دیں اور نڈھال ہو کے اس کی آغوش میں گر پڑا۔ ☆



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

معصومہ کے خلاف پہلی کلاس میں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ سڑکوں کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ گلی کے سرے پر جنگلی بیسوں کا شربت بیچنے والا کھڑا تھا۔ وہ پیتل کے پیالے بجا بجا کر اب بھی صدا لگا رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک عورت جا رہی تھی۔ اس کی پیٹھ پر ردی کاغذوں سے بھرا ہوا ایک ٹوکرا لدا ہوا تھا۔ عورت سر پر بھوسے کا ایک لمبا سا ہیٹ پہنے ہوئے تھی۔ ہیٹ جھکا ہوا تھا اس لیے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور جب وہ اپنا ہیٹ پیچھے کو کھسکاتی تو اس کے سفید سفید دانت ضرور نظر آ جاتے تھے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں قدم گھسیٹتی ہوئی چل رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک پھاٹک میں داخل ہو گئی۔

پھاٹک کے اندر ایک لمبا سا صحن تھا۔ صحن کے چاروں طرف تنگ مربع کی شکل میں ایک عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ عورت اسی عمارت کے ایک تاریک کمرے میں رہتی تھی۔ صحن کا خاصا حصہ گندگی سے اٹا ہوا تھا۔ عورت کے دروازے کے سامنے کدو کی بیل محراب کی شکل میں چڑھی ہوئی تھی اور کھڑکی کے نیچے کچھ پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ بیل کی محراب کے نیچے چند بیکار بانس پڑے تھے۔ ان سے کرسیوں کا کام لیا جاتا تھا۔ عورت اپنے دروازے کے قریب پہنچی تو ایک آدمی باہر آیا اور اس کی کمر سے ٹوکرا اتار کر کہنے لگا۔ "بیگم! آج تمہیں دیر ہو گئی؟"

عورت نے تیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ مجھے بیگم کہتا ہے۔ خبردار جو تم نے کبھی مجھے بیگم کہا۔" وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے اپنے سر سے ہیٹ اتار کے کواڑ پر لٹکا دیا۔ پھر وہ مٹی کے ایک برتن سے پانی نکال کے ایک ہی سانس میں پی گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ محراب کے نیچے آ کر بیٹھ گئی۔

آدمی کا نام سیانگ کاؤ تھا۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ ان کی عمریں تیس تیس سال ہوں گی۔ عورت لیو کہلاتی تھی۔ ویسے اس کا اصل نام چن آؤ تھا۔ سیانگ کاؤ کے سوا یہ نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ پڑوسی اسے بڑی بہن کہتے تھے اور لیو ردی جمع کرنے والی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کا پیشہ ردی جمع کرنا تھا۔ وہ کوڑے کے ڈھیروں سے کاغذ چھانٹ چھانٹ کر پیٹ پالتی تھی اور راہ چلتوں کے [illegible] پرانے موزے بھی خرید لیتی تھی۔ کڑکڑاتی سردی ہو یا چلچلاتی دھوپ وہ سارا دن گلیوں کی خاک چھانتی تھی۔ اس کے باوجود وہ بہت نفاست پسند تھی اور گھر آ کر روزانہ نہاتی۔ شدید سردی میں بھی وہ نہائے بغیر نہیں رہتی تھی۔ سیانگ کاؤ اس کے لیے پانی کا برتن ہمیشہ تیار رکھتا تھا۔

سیانگ کاؤ نے دیہات کے ایک پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ چار سال پہلے فوجیوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے پورے خاندان کو گاؤں چھوڑنا پڑا تھا اور وہ افراتفری میں اپنے خاندان سے بچھڑ گیا تھا۔ اسی دوران میں اس کی ملاقات چن آؤ سے ہوئی۔ وہ دونوں سینکڑوں میل ایک دوسرے کے ہم سفر رہے پھر بچھڑ گئے۔ چن آؤ کسی قبیلے کے ساتھ پیکنگ آ گئی۔ پیکنگ میں ایک بے سہارا عورت کسی آبرو والی نوکری کی تلاش میں [illegible]



پستوری نے مسٹر بی بکس کا دل موہ لیا۔ دیہاتی لوگ عموماً اچھے نوکر ثابت نہیں ہوتے تھے انہیں غلامانہ زندگی گزارنے کی عادت ہوتی ہے چنانچہ چن تاؤ عرصہ دو ماہ میں نوکری سے نکالنے کے مستحق ہو گئی۔ نوکری چھوٹنے سے اس کی مالی حالت نہایت خستہ ہو گئی اس لیے اس نے ردی کاغذ چننے کا اور کاغذ کی کٹائی کا فیصلہ کر کے تن دہی سے یہ کام شروع کر دیا۔ اس کام میں اسے پیٹ بھر روٹی مل جاتی تھی۔

چن تاؤ سے بچھڑ کے سیانگ کاؤ اپنے ایک رشتے دار کی تلاش میں چو اوجیا گیا تھا۔ اس نے اپنے رشتے دار کو بہت تلاش کیا مگر وہ اسے نہ مل سکا۔ احباب اور اعزا اس کی خستہ حالت دیکھ کے طوطا چشمی پر اتر آئے لہٰذا سیانگ کاؤ کو رکشہ کھینچنا پڑا۔ بیجنگ میں کسی نے ایک شربت بیچنے والے سے اس کا تعارف کرا دیا۔ جس عمارت میں سیانگ کاؤ تن چاؤ کے ساتھ مقیم تھا وہ اسی شربت والے کی ملکیت تھی۔ شربت والے نے اسے اس شرط پر رکھ لیا تھا کہ اگر کوئی کرائے دار مل گیا تو اسے وہ کمرہ خالی کرنا پڑے گا۔ سیانگ کاؤ بے روزگار تھا اس لیے وہ شربت والے کا حساب کتاب دیکھ لیتا تھا شربت والا اس کام کے معاوضے میں اس سے کرایہ نہیں لیتا تھا اور اسے دونوں وقت کھانا بھی فراہم کرتا تھا۔

چن تاؤ پہلے ایک اور شخص کے ساتھ رہتی تھی۔ چن تاؤ کام پر جاتی تھی لیکن وہ شخص اپنے گھر میں ردی کاغذوں کا ڈھیر پسند نہیں کرتا تھا اور

اس بات پر چن تاؤ کو اکثر تشویش رہتا تھا۔ ایک روز چن تاؤ جنا کے مکان کی تلاش میں نکل گئی اور جب اس نے پہلے ہی روز اسے پہ مشکل دیکھا تو وہاں سیانگ کاؤ کو دیکھ کے دنگ رہ گئی کہ فوراً انہیں اپنا گروہ سیانگ کاؤ کے ساتھ رہتے ہوئے تو بہت سی تکالیف سے نجات پا سکتی ہے لہٰذا انہوں نے دونوں کمرے کرائے پر لے لیے اور سیانگ کاؤ سے اپنے روزگار کے طور پر یہ کام بھی سیکھنے لگی۔

وہ گزشتہ تین سال سے ساتھ رہ رہے تھے۔ سیانگ کاؤ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا اس لیے وہ ردی کے ڈھیر سے ترتیب کاغذات چھانٹا کرتا تھا۔ ان کاغذات میں مصوری کے نمونے اور بڑے لوگوں کی تحریریں شامل ہوتی تھیں۔ دونوں کے مل کر اشتراک سے ان کا کاروبار چند روز میں خاصی ترقی کر گیا۔ سیانگ کاؤ نے چن تاؤ کو بھی پڑھانے کی کوشش کی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ وہ خود بھی کم پڑھا ہوا تھا اس لیے اسے چن تاؤ کو پڑھانے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔

ان دونوں کی مشترکہ زندگی بھی انسانوں کی طرح ٹکڑوں کے جوڑوں کے مانند تو نہیں تھی مگر ان کی زندگی میں ایک شادی شدہ جوڑے کی طرح مشترکہ نشانیاں تھیں۔ وہ دونوں عموماً چڑیوں کے جوڑے کی طرح مسرور نظر آتے تھے۔

چن تاؤ کمرے میں واپس آ گئی۔ سیانگ کاؤ پانی کا برتن اٹھائے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے گیا اور مسکرا کے بولا۔ "بیگم! آج جلدی سے غسل کر لو مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے آج رات میں کوئی عمدہ چیز پکانا چاہیے۔"

آدھے ہو رہے تھے ہوئے پیاز کے کیک کیسے رہیں گے؟ اگر تم پسند کرو تو میں بازار جا کر ضروری چیزیں خرید لاؤں؟"

"میں نے بیگم بیگم کی رٹ کیوں لگا رکھی ہے؟" چین تاؤ جھنجلا گئی۔

سیانگ کاؤ نے لگاوٹ سے کہا "اگر تم میری اس رٹ کے جواب میں ہاں کہہ دو صرف ایک مرتبہ ہاں کہہ دو تو میں کل ہی بازار سے تمہارے لیے ایک تحفہ خرید لاؤں گا، ایک اچھا سا پیارا سا ہیٹ۔ کل تم کہہ رہی تھیں کہ اب تمہیں نئے ہیٹ کی ضرورت ہے۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" چین تاؤ بہت برہم تھی۔

سیانگ کاؤ نے اس کی ناراضی دیکھ کے موضوع بدل دیا۔

"اچھا تو بتاؤ کیا کھاؤ گی؟"

"جو کچھ تم کھانا چاہو خرید لاؤ۔ میں پکا دوں گی۔"

تھوڑی دیر بعد سیانگ کاؤ پیاز اور گوشت لے کے آگیا۔ دونوں چیزیں اس نے میز پر رکھ دیں۔ اس دوران میں چین تاؤ نہا چکی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا سرخ کارڈ ہاتھ میں تھامے ہوئے سیانگ کاؤ کی طرف بڑھی۔

"یہ کسی چھوٹے سرکاری افسر کا شادی نامہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم اسے بازار میں بیچنے کے بجائے پیکنگ ہوٹل میں بیچیں گے۔ وہاں اس کے اچھے دام مل جائیں گے۔"

"یہ ہمارا شادی نامہ ہے بیگم! اگر یہ ہمارا شادی نامہ نہ ہوتا تو بھلا میں تمہیں بیگم کہہ کے کیوں پکارتا؟ مجھے کیا حق تھا؟" سیانگ کاؤ نے اطمینان سے کہا۔ "میں دو سال سے تمہیں پڑھا رہا ہوں۔ اگر تم اتنی کوڑھ مغز ہو کہ اپنا نام تک نہیں پڑھ سکتیں ورنہ یہ کارڈ پڑھ کے خود دیکھ لیتیں کہ یہ ہمارا شادی نامہ ہے کہ نہیں۔"

"تمہارے سامنے اطمینان کون چھوڑ سکتا ہے؟" چین تاؤ اداس ہو گئی۔ "تم مجھے بیگم کہنے کا جھگڑا ختم کرو۔ میں یہ فضول سننا نہیں چاہتی اور ذرا سنجیدگی سے بتاؤ یہ کارڈ کس نے لکھا تھا؟"

"میں نے لکھا تھا۔ آج صبح ایک سپاہی کرائے داروں کی جانچ پڑتال کرنے آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دو روز سے دشمن کا صفایا کر دیا گیا ہے اور اب ہر ایک شخص کے لیے یہ رپورٹ دینا ضروری ہو گیا ہے کہ اس کے ساتھ کون کون رہتا ہے اور ساتھ رہنے والوں سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ شریف والے نے مجھ سے کہا تھا اگر میں یہ کہہ دوں کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں تو ہم بہت سی دشواریوں سے بچ جائیں گے۔ پولیس والا بھی یہی کہہ رہا تھا ویسے بھی یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ ایک غیر شادی شدہ جوڑا ایک ساتھ رہتا ہے۔ لہٰذا میں نے یہ شادی نامہ نکال لیا۔ اب یہ نہ نہیں بک سکتا تھا۔ میں نے اس میں یہ درج کرا لیا کہ ہم دونوں نے ۱۹۱۹ میں شادی کی تھی۔"

"۱۹۱۹ء؟ اس وقت تو میں تمہیں جانتی بھی نہیں تھی میاں جی!"

تم ضرور کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کے جھوٹے پیالوں میں شراب نہیں پی پھر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں؟" چین تاؤ کی آواز میں غصہ تھا۔ وہ ایک نیلا پاجامہ اور سفید شلوکا پہنے ہوئی تھی۔ میک اپ کے بغیر بھی اس کا چہرہ فطری حسن سے مرصع تھا۔ اگر وہ شادی کرنا چاہتی تو اس کے لیے کوئی تیس چالیس ہزار آسانی سے فراہم کیا جا سکتا تھا اور یہاں اس کی موجودہ حالت کے تحت اسے ایک سو اسی ڈالر مل سکتے تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے کارڈ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ "بے وقوف مت بنو۔ چلو میں کیک بناتی ہوں دونوں مل کر کھائیں گے۔" اس نے اسٹوو کا ڈھکنا اٹھایا اور کارڈ کے ٹکڑے شعلوں کی نذر کر دیے۔ پھر وہ میز کی طرف بڑھی اور کیک بنانے کے لیے آٹا چھاننے لگی۔

"تم نے شادی نامہ جلا دیا۔ اچھا کیا!" سیانگ کاؤ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن سپاہی نے اپنے رجسٹر میں ہمارا نام میاں بیوی کی حیثیت سے درج کر لیا ہے۔ اگر کوئی سرکاری آدمی جانچ پڑتال کے لیے آیا تو میں کہہ دوں گا کہ شادی نامہ کھو گیا ہے اور اب میں تمہیں بیگم بھی کہہ کر پکاروں گا۔ سپاہی اور شریف والا دونوں ہماری شادی کے گواہ ہیں۔ بیگم جی! کتنا سہانا ہے تم پسند کرو یا ناپسند۔ بیگم! بیگم! کل میں تمہارے لیے ایک نیا ہیٹ خرید لاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تنگ دستی کے باعث تمہارے لیے انگوٹھی نہیں خرید سکتا۔"

"بکواس بند کرو۔ تم مجھے پاگل بنا دو گے۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اب بھی لی ماؤ کے متعلق سوچتی رہتی ہو۔" سیانگ کاؤ کی آواز میں پہلے جیسا جوش نہیں تھا۔ اس نے یہ جملہ بے حد آہستہ کہا تھا مگر چین تاؤ نے سن لیا۔

"واہ! میں بھلا ایک ایسے شخص کے بارے میں سوچوں گی جو صرف ایک رات کے لیے میرا شوہر رہا اور پھر جدا ہو گیا اور جدائی کے بعد سے آج تک اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔"

اس نے سیانگ کاؤ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ شادی کے دو روز پہلے وہ سجی ہوئی ڈولی میں بیٹھ کے اپنے شوہر کے گھر پہنچی۔ مہمان کھانا کھانے کے لیے بیٹھنے والے تھے اچانک خبر آئی کہ گاؤں میں فوجی گھس آئے ہیں۔ اس خبر نے پورے گاؤں میں افراتفری مچا دی۔ دولہا دلہن دونوں بھی جلدی جلدی ضروری لوازم سمیٹ کے کچھ لوگوں کے ساتھ مغرب کی سمت بھاگ نکلے۔ دو تین روز رات کے وقت انھوں نے ایک سڑک کے کنارے پڑاؤ کیا۔ اچانک انھیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ پھر ایسی نفسا نفسی ہوئی کہ کسی کو کسی کا خیال ہی نہ رہا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ جب دوسری صبح کا سورج طلوع ہوا تو بارہ آدمی غائب تھے۔ غائب ہونے والوں میں چین تاؤ کا شوہر لی ماؤ بھی شامل تھا۔ چین تاؤ

ہاں! میں سمجھتی ہوں کہ اُسے شیرے ہی نے بھگا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اُسے مار ڈالا ہو۔ خیر چھوڑو، اب ہمیں اُس سے کیا غرض؟"

چین تاؤ نے کیک لا کے میز پر رکھ دیے۔ دونوں ساتھ بیٹھ کے خاموشی سے کیک کھانے لگے۔ کھانے کے بعد وہ دونوں درخت کی جڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔ کھیت کی بیل میں جگنو کچھ اس طرح چمک رہے تھے جیسے آسمان سے ستارے اُتر کر کھیتوں میں آ گئے ہوں۔ گل شبو کی کلیاں چٹک رہی تھیں۔ سارا صحن مہک رہا تھا۔ "کتنی عمدہ خوشبو ہے۔" سیانگ کاؤ نے ایک پھول توڑ کے سونگھا، پھر وہ چین تاؤ کے بالوں میں لگا دیا۔

چین تاؤ بولی "میرے بال بہت گندے ہیں، میرے بالوں میں مت لگاؤ۔ میں کیا بتاؤں کہ جب بھی رات کے وقت میرے بالوں میں پھول لگا رہتے ہیں، تو اس نے پھول توڑ کے سونگھا اور اُسے اپنے قریب رکھ دیا۔

"آج تمھیں دیر کیوں ہو گئی تھی؟" سیانگ کاؤ نے موضوع بدل دیا۔

"او، آج میں نے بڑا اچھا سودا کیا۔ گھر آتے ہوئے میں ہوٹل کے قریب سے گزر رہی تھی جہاں میں نے گلی صاف کرنے والوں کو ردی سے بھری ہوئی ایک گاڑی کھینچتے ہوئے دیکھا۔ میں دنگ رہ گئی۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ تمام کاغذات پرانے شاہی محل سے پھینکے گئے ہیں۔ ان کاغذوں میں سرخ اور زرد رنگ کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ لہٰذا میں نے اُن سے ردی کا سودا کر لیا۔ وہ فوراً راضی ہو گئے۔" چین تاؤ نے کھڑکی کے نیچے رکھی ہوئی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے پوری ٹوکری ایک ڈالر میں خریدی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے یہ ڈالر گنوایا نہیں۔ جب تم اسے دیکھو گے تو تمھیں خود معلوم ہو جائے گا۔"

"محل سے حاصل کی ہوئی کوئی چیز خراب نہیں ہوتی۔ میں صرف کاغذوں اور غیر ملکی فیشنوں سے ڈرتا ہوں۔ ان کے کاغذ بہت وزنی اور بدبودار ہوتے ہیں۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کیا حاصل کر رہے ہیں اور کیا کھو رہے ہیں۔"

"گزشتہ چند برسوں سے تمام دکاندار غیر ملکی کاغذ استعمال کرنے لگے ہیں۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ کہاں سے آتا ہے۔ کوئی بھی ردی جمع کرنے والا اسے نہیں خریدتا۔ یہ وزنی بھی ہوتا ہے اور جب اسے جلاؤ تو پیسے بھی کم ملتے ہیں۔"

"لوگ روز بروز غیر ملکی زبان سیکھنے کے شوق میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ غیر ملکی اخبار پڑھ سکے، دوسروں پر رعب جما سکے۔"

"اب ہم بھی غیر ملکی کاغذ جمع کیا کریں گے۔" چین تاؤ بے پروائی سے بولی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہر چیز پر غیر ملکی لیبل لگ جائے گا۔ ہم کپڑے بھی غیر ملکی پہننے لگے ہیں۔ ہم بیشتر دوسرے ملکوں کے استعمال کرتے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب ہم اونٹ بھی غیر ملکی استعمال کرنے لگیں گے۔"

چین تاؤ ہنسی۔ "تم دوسروں کے متعلق ایسا کیوں کہتے ہو؟ اگر تمھارے پاس بہت سی دولت جمع ہو جائے تو کیا تم غیر ملکی کتابیں پڑھنا پسند نہیں کرو گے؟ کوئی تعجب نہیں کہ تم کسی غیر ملکی عورت سے شادی بھی کر لو۔"

"میں کبھی دولت مند نہیں بن سکتا اور اگر بن بھی گیا تو کسی غیر ملکی عورت سے شادی ہرگز نہیں کروں گا۔ اگر میرے پاس تھوڑی بہت رقم جمع ہو گئی تو میں کسی گاؤں کی طرف نکل جاؤں گا، پھر کوئی اچھی سی زمین خریدیں گے، ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔"

چین تاؤ نے جب سے اپنا گاؤں چھوڑا تھا اور جب سے اپنے شوہر سے بچھڑی تھی، گاؤں سے نفرت کرنے لگی تھی۔ "کیا تمھاری یہی خواہش ہے؟" اس نے سیانگ کاؤ سے پوچھا۔ "زمین خریدنے سے پہلے ہی لوگ تمھاری ساری رقم چھین لیں گے۔ گاؤں میں رہنے سے بہتر ہے ہمیں جو کچھ ہے، میں تو زندگی بھر وہاں کا رخ نہیں کروں گی۔ چاہے مجھے بھوکوں مرنا پڑے۔"

"مگر میں ایک بار اپنا گاؤں ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"گاؤں تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے جہاں بھی ہوں۔ اگر وہاں کبھی رہو گے تو لٹیرے ملیں گے۔ لٹیرے ... تو جاپانی نہیں چھوڑنے دیں گے۔ وہاں جانے کی کون ہمت کر سکتا ہے۔ وہاں کے مقابلے میں ہم یہاں زیادہ خوش ہیں۔ فی الحال ہمیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو تمھارا سودا وہ کام سنبھال لے اور تم ایک دکان کھول لو تاکہ ہم اپنا مال براہ راست بیچ سکیں۔ اس طرح ہمیں دلالوں کے جھنجھٹ سے چھٹکارا مل جائے گا۔"

"صرف تین سال کی بات اور ہے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے ان چند مہینوں میں بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ اب میں یہ بات سمجھنے لگا ہوں کہ استعمال شدہ ڈاک کے ٹکٹوں میں کون سا بکنے کے قابل ہے اور کون سا نہیں۔ میں یہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں اور اب مشہور لوگوں کی تحریریں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ گزشتہ دنوں مجھے چانگ خاندان کے ایک مشہور سیاست دان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ملی تھی۔ جانتی ہو آج میں نے اُسے کتنے میں بیچا؟" سیانگ کاؤ نے پرمسرت انداز میں اپنا انگوٹھا اور شہادت کی انگلی اٹھا کے خود بتایا۔ "دس سینٹ میں۔"

"اب تم خود سوچو کہ اگر ہم اسی طرح روزانہ دس سینٹ ردی کے طفیل حاصل کر سکتے ہیں تو ہمیں گاؤں جانے کا خیال ہی نہیں کرنا چاہیے۔" چین تاؤ کی آواز میں بہار کے آخر میں بولنے والے پرندوں جیسی چہک تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ میں آج جو ردی لائی ہوں اس میں کام کی بہت سی چیزیں ہوں گی۔ میں نے سنا ہے کہ کل محل سے اور ردی بھی نکالی جائے گی۔ محل صاف کرنے والے نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کل صبح سویرے ہی وہاں ردی لینے پہنچ جاؤں۔"

باتوں ہی باتوں میں سے زیادہ رات گزر گئی۔ چین تاؤ نے بانسوں کے ڈھیر سے اٹھ کے جماہی لیتے ہوئے کہا: "میں آج بہت تھک گئی ہوں، چلو اب آرام کریں۔"

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کے کمرے میں چلے آئے۔ کمرے میں اینٹوں سے بنا ہوا ایک لمبا چوڑا پلنگ پڑا تھا۔ پلنگ پر ایک ساتھ تین آدمی سو سکتے تھے۔ کمرے میں تیل کے چراغ کی مدھم روشنی دم توڑ رہی تھی۔ پلنگ کے اوپر ٹنگی ہوئی تصویریں دھندلی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک تصویر میں آٹھ پریوں کو ہوا پر گوتوں کا کھیل کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دوسری تصویر کسی سگریٹ کا اشتہار معلوم ہوتی تھی۔ اس میں ایک خوب صورت عورت کا فوٹو تھا۔ سیانگ کاؤ سوچنے لگا کہ اگر چین تاؤ اپنا بوسیدہ جیکٹ اتار کے کوئی اچھا سا پہن لے تو وہ بھی اس عورت کی طرح جاذب نظر ہو جائے۔ وہ اکثر چین تاؤ کو دیکھ کے چڑایا کرتا تھا کہ اس اشتہار میں تمہاری تصویر چھپی ہوئی ہے۔

چین تاؤ نے کپڑے سے بنا ہوا ایک پرانا کپڑا لپیٹ کے بستر پر دراز ہوتے ہوئے ... سیانگ کاؤ معمول کے مطابق اس کی پیٹھ اور ٹانگوں کی مالش کرنے لگا۔ رات کو مالش کرانا چین تاؤ کی عادت تھی۔ اسے آہستہ آہستہ آرام محسوس ہونے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ بکھرنے لگی۔ اس نے اونگھتے ہوئے بڑبڑا کے کہا: "سیانگ! اب تم بھی بستر پر آجاؤ۔ آج رات کام ... صبح جلدی اٹھنا ہے۔"

صبح وہ دونوں جلدی اٹھ گئے اور اپنی اپنی مہم پر اس طرح روانہ ہوئے جیسے کوئی کاروباری روزی کی تلاش میں اپنے گھر سے روانہ ہوتا ہے۔ پھر جب دوپہر کی دھوپ ہوگئی تو بازاروں میں خرید و فروخت کی چہل پہل ہوگئی۔ اس وقت چین تاؤ روزی کی ٹوکری پیٹھ پر لادے منہ اٹھائے یونہی ایک طرف جارہی تھی۔ جیسے ہی وہ بازار کے قریب پہنچی، سڑک پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اس کا نام لے کے پکارا: "چین تاؤ! چین تاؤ!" آج تک سیانگ کاؤ نے بھی اسے اس نام سے نہیں پکارا تھا۔ اس نے جب سے اپنا گاؤں چھوڑا تھا، کسی نے اسے اس طرح پکارنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ "چین تاؤ! کیا تم مجھے بھول گئیں؟" اجنبی نے کہا۔

چین تاؤ نے مڑ کے دیکھا، سڑک کے کنارے ایک بھکاری بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ اس کے جسم سے سرمئی رنگ کی ایک بوسیدہ وردی جھول رہی تھی۔ وردی کے بٹن کب کے ٹوٹ چکے تھے۔ بھکاری کے سر پر بانس کی بنی ہوئی ایک ٹوپی لگی ہوئی تھی۔ ٹوپی کی اوٹ سے اس کے بال جھاڑیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ چین تاؤ ایک مورتی کی طرح اسے گھورنے لگی۔ بھکاری نے اپنائیت سے کہا: "چین تاؤ! میں ما لو ہوں۔ کیا تم مجھے بھول گئیں؟"

چین تاؤ دو قدم آگے بڑھی۔ بھکاری کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر داڑھی میں جذب ہونے لگے۔ چین تاؤ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ کوشش کے باوجود کئی منٹ تک ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ آخر بڑی مشکل سے اس نے کہا: "ما لو! تم بھیک مانگتے ہو؟ تمہاری ٹانگوں کو کیا ہو گیا؟"

ما لو نے ایک سرد آہ بھر کے کہا: "یہ ایک لمبی کہانی ہے، پھر کبھی سناؤں گا۔ تم بتاؤ، یہاں کب سے ہو اور یہ کیا بیچ رہی ہو؟"

"میں یہیں ہوں ما لو۔ میں روزی جمع کرتی ہوں۔ ما لو! چلو گھر چلیں، وہاں باتیں کریں گے۔"

چین تاؤ نے ایک رکشا روک کے ما لو کو اس میں بٹھایا اور خود رکشا کے ساتھ پیدل چلنے لگی۔ گھر پہنچ کے چین تاؤ اپنے شوہر ما لو کو کمرے میں لے آئی۔ اس نے سیانگ کاؤ کا ایک جوڑا استعمال کے لئے دیا اور ٹب میں ڈول پانی ڈال دیا۔ یہ کام چین تاؤ کے لیے سیانگ کاؤ کرتا تھا۔ چین تاؤ نے ما لو کو نہلا کے تھوڑا پلنگ پر بٹھا دیا اور خود دوسرے کمرے میں نہانے کے لیے چلی گئی۔

"تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے چین تاؤ! کیا تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟" ما لو نے پوچھا۔

"نہیں، میرے ساتھ ایک اور شخص بھی رہتا ہے۔" چین تاؤ نے بے جھجک جواب دیا۔ "وہ میرا رشتے دار ہے۔"

"کیا تم دونوں کا پیشہ تجارت ہے؟"

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں روزی جمع کرتی ہوں۔"

"روزی؟ روزی کاغذ جمع کر کے تم ایک دن میں کتنا کما لیتی ہو؟"

"یہ سوالات ابھی رہنے دو۔ مجھے پہلے اپنے متعلق کچھ بتاؤ۔" چین تاؤ نے بالوں سے پانی نچوڑا اور کنگھی کرتی ہوئی ما لو کے سامنے بیٹھ گئی۔

"یہ ایک طویل داستان ہے چین تاؤ، مگر میں خاص طور سے تمہیں ضرور سناؤں گا۔" اس نے کہنا شروع کیا: "یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ لٹیرے مجھے پکڑ کر لے گئے تھے۔ میں ان سے شدید نفرت کرنے لگا تھا کیونکہ انھوں نے مجھے تم سے جدا کر دیا تھا۔ میں ہر وقت ان کی حراست سے فرار ہو جانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے مجھے موقع مل گیا اور میں ان کی قید سے فرار ہو گیا۔ پھر میں کسی نہ کسی طرح شین یانگ پہنچ گیا۔ وہاں فوج میں بھرتی جاری تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے فوجی نوکری مل گئی۔ نوکری کے دوران میں کئی سال تک میں گھر والوں کی خیر خبر معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ لوگ کہتے تھے کہ ہمارا گاؤں زمین کا پیوند ہو گیا ہے۔ ہماری زمین کے ملکیت نامے کا بھی کوئی سراغ نہیں لگا۔ میں ملکیت نامہ بھاگتے وقت اپنے ساتھ رکھنا بھول گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے دوبارہ گاؤں جانے کا خیال ترک کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں گاؤں گیا تو پھر ڈاکوؤں کی نگاہوں میں بھی چلا جاؤں گا۔"

"میں نے ہرنی کی طرح صرف تمہارا ... ما لو نے ان کے لیے زندہ

رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے اس فیصلے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ میں اطمینان سے ملازمت کیے جا رہا تھا پھر گزشتہ سال نہ جانے کیا ہوا، میں اسے اپنی قسمت کا پھیر کہوں گا۔ ایک دن ہماری رجمنٹ کے کرنل نے نشانہ بازی کے مقابلے کا اعلان کیا اور سچے نشانے باز کو گھڑی تحفے کے ساتھ ترقی دینے کا وعدہ بھی کیا۔ پوری رجمنٹ میں کوئی شخص چار سے زیادہ کارتوس نشانے پر نہیں لگا سکا۔ یہ چار نشانے بھی درمیان میں نہیں لگے تھے لیکن میں نے سرخ نشان پر مسلسل نو کارتوس مارے۔ میں نے آخری کارتوس نشانے کی طرف پیٹھ کر کے ٹانگوں کے درمیان سے مارا تھا۔ یہ دسواں کارتوس بھی نشانے پر لگا۔ اس کامیابی کے بعد کرنل نے مجھے بلایا۔ میں بہت خوش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری تعریف کرے گا مگر وہ مسرور ہونے کے بجائے ناراض ہو گیا اور اس نے مجھے شوٹ کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کے سوا کوئی شخص اتنا اچھا نشانہ باز نہیں ہو سکتا۔ میرے سارجنٹ اور لیفٹیننٹ نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد سے باز نہیں آیا۔ البتہ سارجنٹ اور لیفٹیننٹ کے کہنے سننے سے اتنا ضرور ہوا کہ میری موت کی سزا معاف کر دی گئی اور مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میں بے روزگار ہو گیا۔ پھر مجھے فوج سے نکلے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اچانک یہ خبر آئی کہ چین پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ کرنل اپنی پوری رجمنٹ کے ساتھ جاپانیوں کی قید میں پہنچ گیا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اسے مزہ چکھائے بغیر نہیں رہوں گا لہٰذا میں رضاکاروں میں بھرتی ہو گیا۔ پھر ہم وانگ چنگ کے قریب کئی ماہ تک جاپانیوں سے لڑتے رہے مگر ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ہم برابر پسپا ہو رہے تھے۔ اس دن میری چھوٹی ڈیوٹی تھی۔ قسمت کی خرابی دیکھیں کرنل کی تلاش کے خیال سے دشمنوں میں گھس گیا اور میری دونوں ٹانگیں گولیوں کی نذر ہو گئیں۔ پھر بھی مجھ میں چلنے کی سکت باقی تھی۔ میں گھسٹتے گھسٹتے ایک چٹان کی آڑ میں ہو گیا اور وہاں سے کئی جاپانیوں کو گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ پھر جب مجھ میں مقابلے کی تاب نہ رہی تو میں اپنی رائفل پھینک کے قریبی کھیتوں میں رینگ گیا۔ میں وہاں دو دن تک چھپا رہا۔ دور دور تک مدد کے آثار نہیں تھے۔ میری ٹانگیں زخموں کی وجہ سے بری طرح پھول گئی تھیں۔ یہاں تک کہ مجھ میں حرکت کرنے کی ہمت بھی نہ رہی۔ میں بھوکا پیاسا پڑا موت کا انتظار کرنے لگا مگر اتفاق سے ایک گاڑی والا وہاں سے گزرا۔ اس نے مجھے ابتدائی طبی امداد کے کیمپ تک پہنچا دیا۔ کیمپ کے لوگوں نے میری حالت خراب دیکھی تو مجھے فوراً ہیڈکوارٹر کے فیلڈ اسپتال میں بھیج دیا مگر وقت بہت گزر چکا تھا۔ میری ٹانگیں قطعی بیکار ہو چکی تھیں لہٰذا ڈاکٹروں نے مجبوراً دونوں ٹانگیں کاٹ دیں۔"

"میں اسپتال میں ایک مہینے رہا۔ میری صحت تو ٹھیک ہو گئی تھی مگر میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اس شہر میں میرا کوئی رشتے دار تھا نہ دوست۔ نہ اپنا گھر تھا جہاں میں واپس چلا جاتا۔ میں نے اسپتال والوں کی بہت منت سماجت کی کہ وہ مجھے کوئی چھوٹا سا کام دے دیں مگر ڈاکٹر کہنے لگا کہ یہاں لوگوں کا صرف علاج ہوتا ہے، انھیں روزی فراہم نہیں کی جاتی۔ شہر میں کوئی فوجی سینیٹوریم بھی نہیں۔ لہٰذا میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ گلیوں میں بھیک مانگوں۔

"مجھے بھیک مانگتے ہوئے آج پورے تین دن ہو گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح کیسے کام چلے گا؟ بھیک مانگنے سے تو بہتر ہے کہ مر جاؤں۔ سارے جھنجھٹوں سے نجات مل جائے گی۔"

چن تاؤ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں مگر وہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ لی ماؤ نے اپنی بھنوؤں سے پسینہ پونچھا۔ خاصی دیر تک سکوت طاری رہا۔ "اب تم اپنی سناؤ؟" آخر لی ماؤ نے سکوت توڑا۔ "حالانکہ یہ جگہ اپنے گاؤں کی جگہ کے مقابلے میں بہت تنگ ہے مگر حالات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہی ہے۔"

"ٹھیک ٹھاک ہے۔ حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں، آدمی کو زندہ رہنا پڑتا ہے۔ پھانسی پانے والوں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ میں گزشتہ چند برسوں سے پیٹ بھرنے کے لیے روزی کما رہی ہوں۔ یہ ینگ کا ڈیرہ ہے۔ تم یہ سمجھو کہ یہ ینگ اور میں ہر چیز میں حصے دار ہیں۔"

"کیا وہ یہاں تمہارے ساتھ ہی رہتا ہے؟"

"ہاں، نہ صرف ساتھ رہتا ہے بلکہ ہم دونوں ایک ہی بستر پر سوتے ہیں۔" چن تاؤ نے صاف گوئی سے کہا۔

"اوہ، تو کیا تم نے اس سے شادی کر لی ہے؟"

"نہیں، بس ہم دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔"

"تو اس صورت میں کیا تم اب بھی میری بیوی ہو؟"

"نہیں، میں کسی کی بیوی نہیں ہوں۔"

لی ماؤ کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ بہت دیر تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا کہے۔ اس کی نگاہ فرش پر جمی ہوئی تھی۔ وہ کوئی چیز گھور نہیں رہا تھا بلکہ اسے اپنی بیوی سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر اس نے بے حد دھیمی آواز میں کہا۔ "چن تاؤ! دنیا مجھ پر ہنسے گی کہ میری بیوی ایک غیر مرد سے تعلق رکھتی ہے۔"

چن تاؤ کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر وہ غصے پر قابو پا کے بولی۔ "ایسی باتوں سے صرف مال دار اور باحیثیت لوگ ڈرتے ہیں جہاں تک تمہارا تعلق ہے، کوئی جانتا بھی نہیں کہ تم زندہ ہو۔ اس صورت میں تمہارے لیے ایک عورت کا شوہر ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اب خود مختار ہوں، جو کچھ بھی کروں گی، اس سے تم پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

"اس کے باوجود ہم اب بھی میاں بیوی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ شادی کی ایک رات خوشیوں کے سیکڑوں دن۔"

"میں خوشیوں کے سیکڑوں دنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی" چن تاؤ نے کہا۔ "خوشیوں کے کئی سو دن گزر چکے ہیں۔ تقریباً پانچ سال مجھے یقین ہے کہ تم نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ ہم دونوں دوبارہ مل سکیں گے۔ میں یہاں اکیلی تھی۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے کسی کے تعاون کی ضرورت تھی۔ میں کئی سال سے سیانگ کاؤ کے ساتھ رہ رہی ہوں اب وہ میری عادت بن چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب میں تمہاری کوئی کمی محسوس نہیں کرتی۔ میں تمہیں یہاں اس وجہ سے لائی ہوں کہ ہم دونوں کے باپ آپس میں دوست تھے اور ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ تم یقیناً یہ دعوا کر سکتے ہو کہ میں تمہاری بیوی ہوں مگر میں اس سے انکار کروں گی۔ اگر تم یہ معاملہ عدالت تک بھی لے گئے تو مجھے یقین ہے فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔"

لی لاؤ میز کے نیچے لٹکتے ہوئے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹول رہا تھا۔ وہ اچانک ہاتھ نکال کے چن تاؤ کو گھورنے لگا۔ وہ خاموش تھا اور چن تاؤ رو رہی تھی۔ فرش پر سائے رینگنے لگے۔ کچھ توقف کے بعد لی لاؤ نے کہا "ٹھیک ہے چن تاؤ! تم جو چاہتی ہو وہی سہی۔ میں ایک معذور اور مفلوج شخص ہوں۔ تم مجھے واپس مل بھی جاؤ تو اب میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔"

"اس کے باوجود میں تمہیں نکال نہیں سکتی کیونکہ تم معذور ہو۔ تمہارے علاوہ میں سیانگ کاؤ کو بھی نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ کچھ دیر خاموشی سے کچھ سوچتی رہی پھر بولی "کیوں نہ ہم تینوں مل کر رہیں اور ہم میں سے کوئی یہ نہ سوچے کہ کون کسے پال رہا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" چن تاؤ غور سے اسے دیکھنے لگی۔

لی لاؤ کا خالی پیٹ گڑگڑانے لگا۔ چن تاؤ سمجھ گئی۔ "اوہ میں تمہیں اتنی دیر سے باتوں میں لگائے ہوئے ہوں۔ کھانے کے لیے پوچھا ہی نہیں۔ تمہیں بہت زور کی بھوک لگی ہوگی۔ کیا کھاؤ گے؟"

"جو کچھ ہو لے آؤ۔ میں کل رات سے بھوکا ہوں۔ صرف چند گھونٹ پانی پینے کا قصور وار ہوں۔"

"میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔" چن تاؤ باہر نکل آئی۔ سیانگ کاؤ گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ دروازے کی محراب کے نیچے دونوں ٹکرا گئے۔

"بہت خوش نظر آرہے ہو؟" چن تاؤ نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "اور آج تم اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے؟"

"آج میں نے بہت لمبی کمائی کی ہے۔ کل تم جو کاغذات لائی تھیں آج صبح میں انھیں چھانٹ رہا تھا کہ ان میں سے شنگ خاندان کی پیشین کے کاغذات میرے ہاتھ لگ گئے۔ یہ کاغذات کوریا کے بادشاہ نے چین کے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ ان میں سے دس کاغذات کم سے کم پچاس ڈالر کے ہیں۔ ابھی میں صرف چند کاغذات حنشی سے

دھنک

نقش الترتیب

- دنیا نے عورتوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس طرح دنیا کو بہت نقصان پہنچا۔
- لڑکیاں لڑکوں کو چھیڑیں تو شرارت۔ اگر لڑکے لڑکیوں کو چھیڑیں تو فتنہ گردی۔
- مرنے والوں میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے کیونکہ وہ عورتوں پر مرتے ہیں۔
- عورت نے مرد کو جنت ہی سے نہیں نکلوایا بلکہ دنیا میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔
- کسی پہیلی کو بوجھنے کی کوشش نہ کریں۔ خدانخواستہ حل ہونے کی صورت میں تھانے ہاتھ لگنے سے رہ جائیں گے۔

گیا تھا کہ باقی کاغذات کی مالیت کا اندازہ کر سکوں۔ ان ردی کاغذات میں دو دستاویزیں بھی ملی ہیں۔ وہ شنگ خاندان کی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے بھی ساٹھ ڈالر مل جائیں گے مگر میں نے انھیں ابھی بیچا نہیں ہے۔ ممکن ہے کل ان کی کچھ زیادہ قیمت مل جائے۔ میں تمہیں دکھانے کے لیے وہ دستاویزیں واپس لے آیا ہوں۔ اور دیکھو!" اس نے کاغذات کا بنڈل کھول کے ایک کاغذ پر لگی ہوئی مہر پر انگلی رکھی۔ "یہ دیکھو شاہی مہر لگی ہوئی ہے۔"

"اس نشان کے سوا اس کاغذ میں مجھے کوئی خاص خوبی نظر نہیں آرہی ہے۔ بہترین قسم کا غیر ملکی کاغذ کچھ زیادہ ہی سفید ہوتا ہے۔" چن تاؤ نے کہا۔ "شاہی افسر بھی بری طرح اندھے معلوم ہوتے ہیں۔"

سیانگ کاؤ ہنسنے لگا۔ "ہاں اگر وہ اندھے نہ ہوتے تو تم جیسے لوگ کس طرح زندہ رہ سکتے تھے۔"

پھر وہ کاغذ لپیٹتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں کہتا ہوں بیوی!...."

چن تاؤ اسے سخت نظروں سے گھورنے لگی۔ "میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے اس نام سے مت پکارا کرو۔"

سیانگ کاؤ اس کے تیور نظرانداز کر کے پوچھنے لگا "تم بھی آج جلدی لوٹ آئیں۔ سب خیر تو ہے؟ دھندا برا تو نہیں ہوا؟"

"کل کی طرح آج بھی میں ایک ٹوکری کاغذ خرید لائی ہوں۔"

"صرف ایک ٹوکری لائی ہو؟ تم نے بتایا تھا کہ وہاں اب بھی ڈھیروں کاغذ ہیں۔"

"ہاں مگر آج انھوں نے سارے کاغذ بازار میں بیچ دیے۔"

"چلو، کوئی بات نہیں۔ آج ہم نے خاصا کما لیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم نے ایک دن میں تیس ڈالر سے زیادہ کمائے ہیں۔"

سیانگ کاؤ نے کمرے میں آکے بنڈل میز پر رکھ دیا۔ چن تاؤ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ آہستہ سے بولی "آج اپنے ہاں ایک مہمان آیا ہے۔" اس نے دوسرے کمرے کے دروازے کا پردہ ہٹایا اور سیانگ کاؤ کی طرف جھک کے کہا۔ "جاؤ اندر چلے جاؤ۔" سیانگ

کا ڈو اندر گیا۔ چن تاؤ بھی ماکس کے ساتھ تھی اور لی ماؤ کے بارے میں بولا۔
یہ میرا سابق شوہر ہے۔ پھر اس نے سیانگ کاؤ کی طرف اشارہ کر کے
ماؤ سے کہا۔ یہ میرا بھتیجا وانگ ہے، سیانگ کاؤ۔

دونوں مردوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اگر ان دونوں کے ڈبے نکال کے سامنے رکھ دیے جاتے تو ان کے خطوط نظر متوازی ہوتے۔ دونوں خاموش تھے۔ ان کی نظریں ایک ساکت تھیں۔ کچھ ثانیوں تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آخر سیانگ کاؤ نے اخلاقاً نرمی سے پوچھا۔ آپ کا اسم گرامی؟ حالانکہ وہ اس کا نام اچھی طرح جانتا تھا۔

لی ماؤ نے اپنا نام بتایا۔ پھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ ان دونوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کے چن تاؤ بولی۔ اچھا میں بازار چلی۔ سیانگ! تم بھی بھوکے ہو گے۔ میں چائے کے ایک بنانے لیتی ہوں۔
سیانگ کاؤ نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ سودا میں لے آؤں گا۔

چن تاؤ نے اسے دھکا دے کے ریشوں کے پلنگ پر گرا دیا۔
نہیں، تم مت جاؤ۔ یہیں رہو اور مہمان کا خیال رکھو۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ ماحول اس قدر کشیدہ تھا کہ ان دونوں میں کوئی دشمنی ہوتی تو اب تک ان میں سے ایک قتل ہو جاتا۔ جیسے اتفاق سے دونوں ایک ہی موضوع پر سوچ رہے تھے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ لی ماؤ تندرست تھا اور سیانگ کاؤ دبلا پتلا سا ہے۔ طاقت کے بجائے عقل استعمال کر رہا تھا۔ اس لیے لی ماؤ اسے آسانی سے زیر کر سکتا تھا۔ اگر کسی کے پاس بندوق ہوتی تو یہ معاملہ اور بھی آسان ہو جاتا۔ لی ماؤ نے سیانگ کاؤ کو بتایا کہ میرے اور چن تاؤ کے باپ آپس میں گہرے دوست تھے اور میرا باپ جنگ کے زمانے میں چن تاؤ کے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ میں ایک لا ابالی شخص تھا لہٰذا چن تاؤ کے باپ کو ہر وقت خدشہ رہتا تھا کہ میں کسی بھی وقت گاؤں چھوڑ کے فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں گاؤں چھوڑ کے نہ جاؤں اور اس کی کسانوں کی حفاظت کرتا رہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجھے اپنا داماد بنا لیا تھا۔ سیانگ کاؤ کو چن تاؤ نے یہ بات آج تک نہیں بتائی تھی۔ لی ماؤ نے وہ گفتگو بھی دہرا دی جو سیانگ کاؤ کے آنے سے قبل ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اس گفتگو سے دونوں بری طرح متاثر نظر آنے لگے۔

چونکہ اب تم یہاں میری دوبارہ مل گئے ہو لہٰذا اب میرے لیے یہاں سے چلا جانا بہتر ہو گا۔ سیانگ کاؤ نے بے دلی سے کہا۔
نہیں تمہیں یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک مدت تک اس سے جدا رہا ہوں اور مستعد بھی ہوں۔ اب میں اس کی پرورش نہیں کر سکتا۔ تم مدت سے اس کے ساتھ ہو۔ یہ رشتہ کیوں ختم کرتے ہو؟ میں کسی محتاج خانے میں چلا جاؤں گا۔ سنا ہے یہاں کوئی محتاج خانہ موجود ہے؟

سیانگ کاؤ دنگ رہ گیا۔ وہ ایک ایسے شخص سے جسے وہ ایک جاہل سپاہی سمجھے ہوئے تھا، اتنے عظیم سلوک کی توقع نہیں تھی۔ حالانکہ اس کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا مگر وہ زبان سے برابر انکار کرتا رہا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھے کسی بے گھر عورت کا غاصب سمجھیں۔ تمہاری حیثیت سے سوچتے ہوئے میں یہی کہوں گا کہ تمہیں اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔

میں خط طلاق لکھے دیتا ہوں اور اگر اس سے بھی تم مطمئن نہ ہو تو فروخت نامہ لکھ دوں گا۔ لی ماؤ نے مسکراتے ہوئے تجویز پیش کی۔ اس کی گفتگو کا انداز پُرخلوص تھا۔

مقدم اسے کیسے سمجھ سکتے ہو۔ وہ شخص بے قصور اور معصوم بنے میں اسے پڑھ کر وہ دیکھنا نہیں چاہتا اور جہاں تک اسے خریدنے کا تعلق ہے، میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں گا؟ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ بھی اسی کا ہے۔

میں رقم نہیں چاہتا۔
پھر کیا چاہتے ہو؟
کچھ نہیں چاہتا۔
پھر فروخت نامہ کیوں لکھ رہے ہو؟

صرف اس لیے کہ اگر ہم یہ معاملہ زبانی طے کر لیں گے تو تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہو گا اور اگر میری نیت بدل گئی تو حالات خراب ہو سکتے ہیں۔ میں اس صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں۔ سمجھوں گا کہ یہ معاملہ تکمیل تک پہنچانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

چن تاؤ سبزیاں لے کے واپس آ گئی۔ اس نے دونوں کو گھل مل کے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کا دل خوشی سے بھر آیا۔ وہ سیانگ کاؤ کو خریدنے کے بعد میں پھر خوشی کی دنوں سے ایک ایسے کونے کی تلاش میں تھی جو چار ہاتھ بنانے سے بچاری ہو اور خوش نصیبی ہے کہ اتفاق سے ہمیں مل گیا۔ یہ چاہ نہیں سکتا مگر گھر میں بیٹھے بیٹھے کاغذ چاٹنے کا کام کر سکتا ہے۔ تم کاغذ فروخت کرنے کا کام سنبھال لینا۔ میں اس طرح دو گنا کما لوں گی۔ تین آدمیوں کی رفاقت سے ایک ادارہ سا بن جائے گا۔ لی ماؤ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک قحط زدہ شخص کی طرح بھکشوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس میں بات کرنے کی سکت نہیں تھی۔

دو آدمیوں اور ایک عورت سے کہیں ادارہ بنتا ہے اور تم تم کیا تم رنگا دوگی۔ سیانگ کاؤ بے اختیار بول اٹھا۔

کیوں؟ کیا تمہیں اس تقسیم پر کوئی اعتراض ہے؟
در اصل مجھے اعتراض تو کوئی نہیں ہے۔ سیانگ کاؤ دل کی بات

زبان پر نہیں لا سکا۔

لی لاؤ سیانگ کاؤ کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ فوراً بولا۔ "میں ایک معذور آدمی ہوں، کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ سارے سارے دن گھر میں بیٹھا رہوں گا۔ مجھ سے تم دونوں کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

"تم دونوں اس سلسلے میں ذرا اطمینان سے سوچ لو۔ میں تو طے کر ہی چکی ہوں۔" چین تاؤ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

سیانگ کاؤ نے بدلی ہوئی حالت میں ہونٹ بھینچ لیے۔ لی لاؤ کھانے میں جٹا رہا، لیکن اس کی آنکھیں چین تاؤ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی زبان سے کچھ سننے کا منتظر تھا۔ ردی کاغذ جمع کرنا ایسا پیشہ ہے جس میں عورتیں پیش پیش رہتی ہیں۔ چین تاؤ نے پورا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ لی لاؤ گھر میں بیٹھے بیٹھے ردی کاغذوں میں سے استعمال شدہ ٹکٹ اور تصویریں چھانٹ کر سگریٹ کی خالی ڈبیوں میں جمع کیا کرے گا۔ اس کام کے لیے صرف آنکھوں اور ہاتھوں کی ضرورت ہے لہٰذا وہ یہ کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ اگر اس نے ایک سال میں صرف اس سے زیادہ ڈبیاں بھر لیں تو اس کے لیے ایک سال کے کھانے کے پیسے آسانی سے فراہم ہو سکتے ہیں اور اگر اتفاق سے کسی دن وہ بیس سینٹ ہاتھ لگ گئے تو راتوں رات امیر ہو جائیں گے۔ بیجنگ میں سگریٹوں کی دس ہزار ڈبیاں روزانہ پھینکی جاتی ہیں۔ غیر ملکی ڈبیوں پر بہت سی تصویریں ہوتی ہیں۔ میں روزانہ سو ڈبیاں کسی تکلیف کے بغیر جمع کر سکتی ہوں۔ سیانگ کاؤ مشہور ہستیوں کے خطوط اور قیمتی کاغذات چھانٹ لیا کرے گا۔ ویسے کتنا فضول ہے کہ وہ اس کام میں ماہر ہے اور اسے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے اہم کام میرے ذمے رہے گا۔ طوفانی بارش کے دنوں کے سوا چاہے کیسی ہی سردی یا گرمی ہو میں روزانہ کاغذ جمع کرنے جاؤں گی۔ خراب موسم میں کاغذ جمع کرنا بے حد سود مند ہوتا ہے کیونکہ دوسرے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں۔

کھڑکی سے سورج کی طرف دیکھ کر چین تاؤ نے وقت کا اندازہ لگایا۔ "لاؤ دالان میں جا کے اپنا بستہ درست کر لو۔" کہہ کر سیانگ کاؤ سے مخاطب ہوئی۔ "میں معلوم کرنے جا رہی ہوں کہ محل سے اور ردی کب اٹھائی جائے گی یا نہیں۔ تم دونوں اس کا خیال رکھنا، میں رات سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔ پھر ہم تینوں اس مسئلے پر مزید گفت و شنید کریں گے۔" سیانگ کاؤ جانتا تھا کہ اسے روکنا ناممکن ہے لہٰذا وہ خاموش رہا۔

وہ تینوں ساتھ رہنے لگے۔ وقت جیسے معمول کے مطابق گزرنے لگا۔ وہ تینوں کے ساتھ ایک عورت کا ایک ہی بستر پر سونا عجیب معلوم ہوتا تھا۔ دراصل دنیا میں صرف وہ لوگ زندگی سمجھتے ہیں جو دوسروں کے متعلق بیٹھ کر سوچتے ہیں۔ جو لوگ اپنی روزی سخت جدوجہد کے بعد حاصل کرتے ہیں ان کے پاس ایسے لوگوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں چین تاؤ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ وہ کسی اچھے کھاتے پیتے خاندان کی فرد تھی لیکن

خلیفہ منصور

نے کچھ قیدیوں کو معاف کر دیا اور انہیں رہا کر دینے کا ارادہ کیا۔ اس نے قیدیوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی۔ اس کی نظر اپنے ایک ملازم کے نام پر پڑی۔ اس ملازم سے منصور کو سخت عداوت تھی۔ منصور نے اس کے نام کے سامنے لکھوا دیا کہ جب تک یہ شخص [illegible] نہ ہو جائے اسی جگہ رہے۔ [illegible] رات بھر سو نہ سکا، اس کا ضمیر بار بار اسے ملامت کرتا رہا اور خیال آتا کہ اس ملازم کو رہا کر دینا چاہیے ورنہ مجھے اللہ تعالیٰ کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔ وہ کوشش کے باوجود یہ خیال اپنے دل سے دور نہیں کر سکا۔ صبح اس نے قیدیوں کی فہرست دوبارہ طلب کی اور اس شخص کے نام کے آگے لکھوا دیا "اسے بھی [illegible]" [illegible]

[illegible]

فیشن پرست عورت۔ اس نے آج تک کسی بال وردی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ کسی تقریب میں اس نے کبھی میزبان کے فرائض انجام دیے تھے لہٰذا نہ تو کوئی اس پر نکتہ چینی کر سکتا تھا اور نہ اس کے چال چلن پر شک کی نظر ڈال سکتا تھا۔ اگر لوگ یہ باتیں کرتے بھی تو اسے ان باتوں کی پروا کب تھی۔ صرف بحال پولیس اس کی آمدورفت پر نظر رکھتی تھی اور پولیس کو وہ بہت خوب صورتی سے مطمئن کر دیتی تھی۔

سیانگ کاؤ چند سال اسکول میں رہا تھا اس لیے وہ قدیم عقلمندوں کی طرح خاموش ہو گیا تھا۔ وہ چہرے مہرے سے نرم دل نظر آنے کے علاوہ چین تاؤ کی طرح تھا۔ اب وہ ہر معاملے میں اسی کا محتاج تھا۔ اس کے لیے چین تاؤ ہر لحاظ سے ایک [illegible] کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے کہنے پر عمل کرتا کیونکہ اسی میں اس کی بھلائی تھی۔ چین تاؤ نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ حاسد نہ بنے۔ لہٰذا اس نے اپنے دل سے حسد کا جذبہ نکال دیا تھا۔

لی لاؤ کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ اگر سیانگ کاؤ اور چین تاؤ اپنے لیے صرف ایک سال رکھتے تو ان کے لیے اس سے زیادہ نہیں ٹھیرتا تھا۔ اگر وہ اسے صرف ایک شئے دے دیتے تو بھی وہ خوش رہتا۔ مدت تک در بدر بھٹکنے کے بعد ایک لڑکی کو ہمیشہ اپنی بیوی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ لی لاؤ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

سیانگ کاؤ کا دل صاف ہو گیا تھا اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان کسی دن ایسی باتیں پیدا ہونے لگیں جن کی وجہ سے ان کے انداز میں فرق آنے لگا۔

گرمی جب معمول شباب پر تھی تو چین تاؤ اور سیانگ کاؤ ان کی آرزو سے نہیں تھے جو ان دونوں جھنجھلاہٹیں کرتے ہیں۔ ان دونوں کے لیے کام کرنا ضروری تھا۔ لی لاؤ گھر پر کام سیکھ رہا تھا۔ وہ اب کاغذ شناخت کرنے کے

قابل ہو گیا تھا۔ اُسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ کون سا کاغذ ٹائلٹ پیپر بننے والا اور کس کے پاس جائے گا اور کون سا کاغذ سیانگ کاؤ کی انفرادی کے لیے رکھنا ہے۔

ایک دن چن تاؤ گھر واپس لوٹی تو سیانگ کاؤ حسبِ معمول اُس کا منتظر تھا۔ اس دن وہ دروازے سے آتی ہی جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی، ایان کی خوشبو سونگھ کر رنگ بدل گئی۔ "ہم نے پھر جھگڑنے کی ..." وہ ایک تجربہ کی تھی۔ اُس نے سیانگ کاؤ سے پوچھا۔ سیانگ محراب کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خاموش رہا۔

لی ماؤ کہنے لگا "ہم پھر نہیں بھاگ رہے ہیں۔ مگر اس گھڑی ہوا لگ کر رہے ہیں۔ سیانگ سے وہاں جانے کے لیے میں نے کہا تھا میں آج یا ہم دونوں کا اندر سخت گرمی ہو رہی ہے۔ میں تو میری ایک ہی بستر پر ہوں اسے تکلیف ہو جو سکے ہے۔"

"میز پر رکھا ہوا سرخ کاغذ کس کا ہے؟" چن تاؤ نے کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ آج سے تم سیانگ کاؤ کی بیوی ہو، یہ طلاق نامہ ہے۔" لی ماؤ نے جواب دیا۔

"مطلب تو یہ ہے کہ تم دونوں نے آپس میں طے کر لیا ہے۔" وہ لی ماؤ کی طرف مڑی۔ "یہ تمہاری تجویز تھی یا اس کی؟"

"ہم دونوں یہی چاہتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ رہ رہے ہیں اس سے میں خوش نہیں ہوں اور وہ بھی۔"

"میں تم سے کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں، لیکن تم پر اثر نہیں ہوتا۔ آخر تم لوگ ہر وقت اس میاں بیوی کے چکر میں کیوں پڑے رہتے ہو؟" چن تاؤ کو غصہ آ گیا۔ اُس نے کاغذ کے ٹکڑے کرتے ہوئے پوچھا "تم نے میری کیا قیمت لگائی تھی؟"

"ہم نے ایک مناسب قیمت پر سودا طے کر لیا ہے۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کو یوں ہی نہیں دے دیتا ہے۔"

"لیکن ایک شوہر اپنی بیوی کو بیچنے میں کہاں تک حق بجانب ہے؟" وہ سیانگ کاؤ سے مخاطب ہوئی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہارے پاس خاصی دولت جمع ہو گئی ہے۔ اسی لیے تم ایک بیوی خریدنے کے قابل ہو گئے ہو۔ پھر کیوں نہ تم کچھ زیادہ رقم خرچ کر کے ......"

سیانگ کاؤ نے بات کاٹ دی۔ "ایسی بات کیوں کرتی ہو چن تاؤ؟ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ بازار میں لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ مجھ پر ہنستے ہیں۔"

"ہنستے ہیں؟"

"ہاں۔" سیانگ کاؤ کی آواز بیٹھ گئی۔ در اصل اس معاملے میں جواز پیش کرنے کے لیے اُس کے پاس کوئی ٹھوس جواز نہیں تھا۔ چن تاؤ زندگی کو جس طرح دیکھتی تھی وہ بات آج تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ چن تاؤ اُس کے اعصاب پر اس قدر کیوں حاوی ہے۔ جب بھی اس نے کوئی کام اپنی مرضی کے مطابق کرنے کے لیے سوچا، چن تاؤ ہمیشہ آڑے آئی۔ وہ اُس کے لیے کسی ملکہ سے کم نہیں تھی اور اُس کے احکام ماننا اُس کا فرض تھا۔

"گویا تم یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو، محض اس لیے کہ تم نے چند کتابیں پڑھ لی ہیں اور اب تمہیں اس بات کا غم کھائے جا رہا ہے کہ لوگ تمہارا مذاق اڑاتے ہیں، تم پر ہنستے ہیں؟"

"قدیم زمانے سے یہی ہوتا آیا ہے۔ لوگوں پر قابو پانے کے لیے پیغمبروں کے پند و نصائح کے بجائے تشدد اور ظلم سے کام لیا گیا۔ گالی گلوچ، مار پیٹ ہمارے سماج و رواج ہیں۔" مگر چن تاؤ گالی کا جواب گالی سے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتی تھی۔ جب وہ دوسروں کو برا نہیں کہتی تھی تو اپنے لیے برے الفاظ کیسے برداشت کرتی۔ لہٰذا وہ سیانگ کاؤ کو سمجھانے لگی "اگر کوئی تم پر ہنستا ہے تو تم اُسے مارتے کیوں نہیں ہو؟ تمہیں کس بات کا خوف ہے۔ دوسروں کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ وہ کون ہوتے ہیں۔" سیانگ کاؤ خاموش رہا۔ چن تاؤ بولی "لیکن اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر ہم چاہیں تو تینوں اسی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔"

کمرے میں سکوت طاری ہو گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد سیانگ کاؤ اور چن تاؤ حسبِ معمول محراب کے نیچے آ بیٹھے لیکن آج دونوں خلافِ معمول خاموش تھے۔ سیانگ کاؤ آج کچھ گنگنا بھی نہیں رہا تھا۔ لی ماؤ نے چن تاؤ کو اندر بلا لیا اور اُسے سمجھانے لگا کہ وہ قانونی طور پر سیانگ کاؤ کی بیوی بن جائے۔ وہ ایک مرد کی نفسیات نہیں سمجھ سکتی۔ کوئی بھی مرد کسی نامحرم بیوی کا غاصب بننا پسند نہیں کرے گا اور کسی کی بیوی کو کبھی گوارا کرے گا۔ پھر اُس نے ایک سرخ کاغذ نکال کے چن تاؤ کو دیا۔ کاغذ اپنی اصل رنگت کھو چکا تھا۔ "یہ ہمارا نکاح نامہ ہے۔ اُس رات بھاگتے وقت میں نے اُسے سنبھال کے رکھ لیا تھا۔ اب میں یہ تمہیں واپس کر رہا ہوں تاکہ ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے۔"

چن تاؤ نے خاموشی سے کاغذ اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اُس کی نگاہ شوہر کے بستر کی پھٹی ہوئی چٹائی پر جمی ہوئی تھی۔ وہ اپنے معذور شوہر کے پاس بیٹھ گئی اور کہنے لگی "ماؤ! اسے رکھو۔ میں اب بھی تمہاری بیوی ہوں۔ شادی کی ایک رات سرخ رنگ کے ... دونوں کا پیش خیمہ ہو چکی ہے۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ میں کتنی ظالم ثابت ہوں گی اگر اس حالت میں صرف اس بنا پر تمہیں گھر سے نکال دوں کہ تم معذور ہو اور کسی کام کے قابل نہیں ہو۔" اُس نے سرخ کاغذ شوہر کے پلنگ پر رکھ دیا۔

لی ماؤ اُس کے رویّے سے بے حد متاثر ہوا تھا مگر اپنے جذبات چھپاتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولا "میں سمجھتا ہوں کہ تم اُسے بے پناہ چاہتی ہو لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم اُس کے ساتھ رہو۔ جب تمہارے پاس تھوڑی بہت رقم جمع ہو جائے تو مجھے میرے گاؤں بھیج دینا یا معذور لوگوں کے کسی اصلاح خانے میں داخل کرا دینا۔"

"یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے ہم دونوں ساتھ رہتے

"یہ اور میں اس سے بہت خوش ہوں۔" چینی تارا کی آواز ملائم تھی۔ "اگر وہ چلا گیا تو مجھے بے حد پریشانی ہوگی کیوں نہ ہم اُس سے پوچھ لیں۔ آؤ دیکھیں۔ وہ کیا کہتا ہے؟"

"سیانگ کاؤ، سیانگ کاؤ!" اُس نے کھڑکی سے جھانک کے آواز لگائی کسی نے جواب نہیں دیا۔ اُس نے باہر نکل کے دیکھا۔ سیانگ کاؤ غائب تھا وہ رات کے وقت پہلی مرتبہ اکیلا گیا تھا۔ چینی تارا پریشان ہو گئی۔ اُس نے کمرے کی طرف منہ کر کے کہا "میں اُسے تلاش کرنے جا رہی ہوں۔"

اُسے یقین تھا کہ وہ گلی کے سرے تک گیا ہوگا مگر جب اُس نے شربت والے سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُس نے اُسے سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ چینی تارا نے اُس کے تمام مخصوص ٹھکانے چھان مارے مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ آدمی کا گم ہو جانا کتنا آسان ہے۔ اگر وہ ایک دو آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر اُس کا نظر آنا محال ہو جاتا ہے۔ تقریباً شام کے وقت چینی تارا تھکے ہوئے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔ شام کا چراغ بھی کب کا بجھ چکا تھا۔

"کیا تم سو گئے؟ کیا سیانگ کاؤ ابھی تک واپس نہیں آیا؟" چینی تارا نے دیا سلائی جلانے کی کوشش کی اور بستر کی طرف دیکھنے لگی۔ بستر پر نظر پڑتے ہی اُس کی رگوں میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ چیخ اٹھی۔ لی ماؤ نے اپنی گردن میں پیٹی باندھ کے خود کو کھڑکی کی جالی میں اٹکا لیا تھا۔ وہ اپنے اوسان یک جا کرتی ہوئی بہت مشکل سے اوپر چڑھی اور اُسے نیچے اتار کر بستر پر لٹا دیا۔ خوش قسمتی سے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اور اُسے کسی کی مدد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ خود ہی آہستہ آہستہ اُس کا سینہ سہلانے لگی اور لی ماؤ رفتہ رفتہ زندگی سے ہم کنار ہونے لگا۔

دوسروں کی خاطر خود کو فنا کر دینا بہادروں کا شیوہ ہے۔ اگر لی ماؤ ٹانگوں سے معذور نہ ہوتا تو اُسے یہ قدم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے مسلسل سوچ رہا تھا کہ اُس کے لیے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ اسی طرح چینی تارا سکون سے رہ سکے گی۔ اگرچہ چینی تارا کو اُس سے قطعی محبت نہیں تھی، پھر بھی اُس کے دل میں شوہر کے حقوق ادا کرنے کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ وہ اُس کا سینہ سہلاتی رہی اور اُسے باتوں میں الجھائے رہی یہاں تک کہ آسمان پر روشنی پھیل گئی اور دن ہو گیا۔ چینی تارا بستر سے نیچے اتر آئی۔ فرش پر سرخ کاغذ راکھ کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔ یہ اُن کا نکاح نامہ تھا۔ وہ بہت دیر تک راکھ کی طرف گھورتی رہی۔

وہ سارا دن گھر رہی۔ شام کو وہ افیونیوں کے بستر پر لی ماؤ کے قریب بیٹھ گئی اور اُس سے پوچھنے لگی "کیوں روتے ہو؟" حالانکہ وہ خود بھی رو رہی تھی۔

"میں نے تمھاری مسرتوں کا خون کیا ہے۔ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ یہی سلوک کرتا رہا۔ تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔"

"وہ چلا گیا ہے اور میں ٹانگوں سے معذور ہوں۔"

"تمھیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ واپس آ جائے گا۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے۔"

دوسرا دن بھی گزر گیا۔ صبح چینی تارا صحن میں گئی تو اُس نے بیل سے دو کیلے توڑے۔ اُنھیں صاف کر کے ٹکڑے بنائے۔ پیالی سے ٹرنک کا سامان ہٹایا۔ پلنگ کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ چینی تارا نے کیلے کے قتلوں کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔ دونوں نے ساتھ بیٹھ کے ناشتہ کیا۔

ناشتے کے بعد چینی تارا نے اپنا بوسیدہ ہیٹ لگایا اور پیٹھ پر ٹوکری باندھ کے باہر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ "آج باہر مت جاؤ۔" لی ماؤ نے اُسے روکنا چاہا۔ "تمھارے دل و دماغ پُرسکون نہیں ہیں۔"

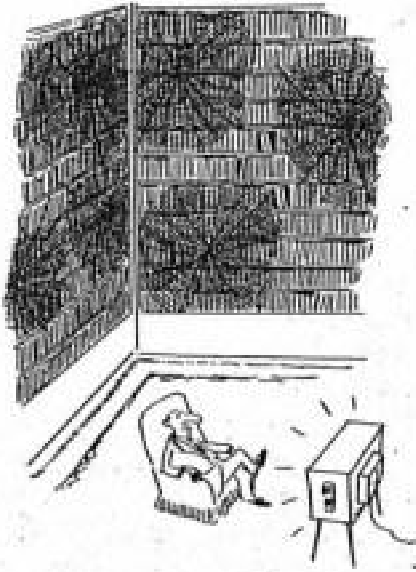
"مجھے گھر میں بیکار بیٹھنا بہت برا لگتا ہے۔" وہ پھاٹک سے باہر نکل کے لی ماؤ کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

کام اُس کے جسم کا ایک عضو بن چکا تھا۔ وہ اس وقت بے حد دل برداشتہ تھی پھر بھی کام کر رہی تھی۔ محنت ہی ایک ایسی چیز ہے جسے چینی عورتیں اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں۔ وہ محبت سے قطعاً ناآشنا ہوتی ہیں۔ اُن کی تمام تر توجہ زندگی کے مسائل پر مرکوز رہتی ہے۔ محبت اُن کی نظر میں ایک بیہودہ جذبہ ہے جو آدمی کو وہم پرست کر کے رکھ دیتا ہے۔ حقیقتاً محبت ایک جنونی جذبہ ہے اور زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ محبت پر ریشمی پردوں کے پیچھے بیٹھ کے شاعرانہ انداز میں گفتگو کرنا فیشن سمجھا جاتا ہے۔ چینی تارا نے کسی پیرس یا لندن کی سیر نہیں کی تھی اور نہ کسی ایسے سکول میں تعلیم حاصل کی تھی جو نیلی آنکھوں والے غیر ملکیوں کی نگرانی میں کام کر رہا ہو۔ وہ فیشن کی اہمیت سے قطعی ناواقف تھی۔ ایسی محبت کو وہ ایک لاعلاج مرض سمجھتی تھی۔

وہ گلی گلی خاک چھانتی رہی۔ اتفاقاً گلیوں کے گرد و غبار نے اُسے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھی ردّی کاغذوں کے بدلے ماچس دے دیتی اور ردّی کاغذوں کے بجائے ماچس لے لیتی تھی۔ کئی بار وہ ردّی کاغذوں کے ڈھیر کے قریب سے گزری مگر اُس نے اُن کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دفعہ اُس نے ردّی کے بدلے میں ماچسیں لینے کے بجائے پانچ پانچ ماچسیں بانٹ دیں۔

سارے دن خاک چھاننے کے بعد وہ مایوس و نامراد گھر لوٹی۔ آج پھاٹک پر عمارت میں رہنے والوں کے نئے رشتے کی اطلاع لگی ہوئی تھی۔ چینی تارا دنگ رہ گئی۔ یہ کارڈ پولیس نے چپکائے تھے۔ ایک کارڈ پر یہ لکھا ہوا تھا "اس مکان میں سیانگ کاؤ اور اُس کی بیوی چینی تارا رہتے ہیں۔" اُس کا دل اندر بیٹھ گیا۔

سیانگ کاؤ واپس آ چکا تھا جیسے ہی چینی تارا صحن میں داخل ہوئی وہ دوڑتا ہوا اُس کی طرف بڑھا اُسے دیکھ کے حیرت زدہ رہ



سکتے تھے جلے جذبات سے چی آذو کی آنکھیں چھلک گئیں: ”تم واپس آ گئے“
وہ ایک دم چیخ اٹھی۔ باقی الفاظ اس کے آنسوؤں میں دب کے رہ گئے۔

”میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا کبھی نہیں چھوڑ سکتا، جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ سب تمہارا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری ضرورت ہے۔ میں اتنا سنگ دل کیسے ہو جاؤں“

وہ دو دن تک بے مقصد ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے پیروں میں لوہے کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور اُن کا دوسرا سرا چی آذو کی کلائی سے بندھا ہوا ہے۔ وہ جہاں بھی گیا ہر جگہ اُسے سگریٹ کے مرغولوں میں وہ تصویر نظر آئی جو چی آذو سے مشابہ تھی۔ وہ اتنا پریشان تھا کہ اُسے کبھی اپنا پیٹ خالی ہونے کا احساس نہیں ہوا۔

”بھائی سیانگ کاؤ، اور میں نے طے کر لیا ہے“ لی وا نے کہا۔
”یہ اس مکان کے مالک ہیں اور میں کرائے دار ہوں“

سیانگ کاؤ نے حسب معمول چی آذو کی طرف سے نظریں اتاریں اور اُس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا ”اگر تم مجھے اپنے گاؤں لے گئے تو لی وا اس مکان کا مالک ہو گا۔ میں کرائے دار ہو جاؤں گا اور تم ہماری بیوی۔“ چی آذو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ اندر چلی گئی۔ دیر تک کھڑی پھر تھک کے وہ سونے چلی گئی۔

ایک دفعہ پھر چی آذو اور سیانگ کاؤ خواب کے نیچے بیٹھے ہوئے لی وا کی آنکھوں لگا رہے تھے۔ وہ دونوں اس رات پر سناٹے میں گزر رہے تھے

محل سے حاصل کیے ہوئے کاغذ بیچنے سے جو رقم حاصل ہوئی، اُس سے بازار میں ایک اچھی سی دکان خرید لیں گے اور رہنے کے لیے کوئی بڑی جگہ لے لیں گے۔ ایک ٹمٹماتا تیل کے چراغ کی بتی لو کے گرد چکر لگا رہا تھا، شام ہو گیا تھا۔ آسمان پر کہکشاں نیچے اتر آئی تھی۔

”اب تمہیں بھی سو جانا چاہیے“ چی آذو نے کہا۔
”پہلے تم بستر پر لیٹو۔ میں ابھی ایک منٹ میں آ کے تمہاری مالش کر دوں“۔
”مجھے آج مالش کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ میں کل بہت جلدی اٹھتا ہے کئی دنوں سے کچھ کیا نہیں ہے“

”اوہ، میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ آج گھر آتے وقت میں پرانے بازار کی طرف نکل گیا تھا۔ وہاں سے تمہارے لیے میں ایک ہیٹ خرید لایا ہوں۔ ہیٹ دیکھنے میں بالکل نیا ہے“ سیانگ کاؤ نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے ہیٹ اٹھا کے چی آذو کو تھما دیا ”کیسا لگتا ہے؟“

”میں اندھیرے میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ بہرحال کل صبح اسے ضرور پہنوں گی“

پورے صحن میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چی شتری کی خوشبو رات کی ٹھنڈی ہواؤں میں دھیرے دھیرے رچ رہی تھی۔ کمرے میں ڈوبی آوازیں جھنجھنا رہی تھیں۔ ”بیگم“ سیانگ کاؤ کی پیار بھری آواز ابھری۔
”میں یہ لفظ سننا نہیں چاہتی۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں“

OCTOBER 1975
3.00

SABRANG

Press Chambers, I.I. Chundrigar Road,
Karachi-1.
Cable: SUBRANG

Phone: 211944
Regd. No. S. 2732

The Largest Circulated Monthly Magazine Certified by The Audit Bureau of Circulation, Govt. of Pakistan

